REASON

REVOLUTION

RESPONSIBILITY

REFORM

RIGHTS

IRSHAD

مفروضات کی اُتھل پتھل

آج اسلام میں مسائل

دیانتداری اور تبدیلی کے لئے ایک پیغام

آج اسلام میں مسائل

دیانتداری اور تبدیلی کے لئے ایک پیغام

ارشاد منجی

ترجمہ: طاہر اسلم گورا

ترجمہ، مصنفہ اور کتاب کے بارے چند سطریں

میں نے اس کتاب کا اس انداز کے ساتھ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح ایک مشکل ، حساس اور اہم کتاب کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ارشاد نے اِس کتاب میں جہاں دانشورانہ اور فلسفیانہ استدلال وزبان کا اظہار کیا ہے وہاں کہیں کہیں شمالی امریکہ کی روزمرہ بے تکلفانہ زبان و لہجے سے بھی کام لیا ہے ، کسی بھی مترجم کو زیادہ دقت کا سامنا روزمرہ کے محاورہ کے ضمن میں ہی کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ کے معاملہ میں کسی لفظ، جملے یا پیرا کو ایک سے زیادہ معنی یا انداز میں پیش کرنے کی گنجائش ہوتی ہے ، اُسی گنجائش کی بناء پر کسی ناقد یا قاری کو مترجم سے مختلف انداز بھی سوجھ سکتا ہے ، جس میں کوئی حرج یا مضائقہ والی بات نہیں ۔اُردو زبان میں انگریزی کے متعدد لفظوں اور محاوروں کا استعمال اَب خود ترجمے سے زیادہ قابلِ فہم بن چکا ہے ، اِکا دُکا مقامات پر بات

کی روانی اور اثرپذیری کو قائم رکھنے کیلئے لفظ کے لفظی ترجمے اور معنی سے گریز کیا ہے۔مصنفہ نے اپنی کتاب کے ہر باب کے حوالہ جات اپنی ویب پر شامل کئے ہوئے ہیں۔ www.irshadmanji.com

مصنفہ، ارشاد منجی، تب چار برس کی تھیں جب اُن کا خاندان ۱۹۷۲ء میں یوگنڈا سے ہجرت کر کے کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا کے ایک متوسط طبقے کے مضافاتی علاقے رچمنڈ میں پہنچا تھا ، اُس وقت فوجی آمر جنرل عیدی امین دیدا نے افریقہ صرف کالوں کے لئے قرار دے دیا تھا۔ ارشاد کے آباؤاجداد کا ہندوستان سے تعلق ہے۔ ارشاد نے برٹش کولمبیا کی یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے ہونرز کی ڈگری حاصل کی۔وہ کینیڈاکے صحافتی و دانشورانہ حلقوں میں بیحد فعال اور مقبول ہیں۔ ارشاد ٹی وی اونٹاریو کے پروگرام ''بِگ آئیڈیاز'' اور 'کیویر ٹیلی ویژن''کی میزبان رہ چکی ہیں ہیں۔ روزنامہ ''آٹوا سٹیزن'' کے ادارتی بورڈ میں بھی شامل رہی ہیں، اِس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بیسیوں لیکچر دے چکی ہیں اور اِسی ضمن میں ہمہ وقت مصروفِ کار ہیں۔ اُن کی اِس کتاب کے تراجم تیس سے زائد زبانوں میں ہو

چکے ہیں جن میں اُردو ، عربی، فارسی اور بہاسا میلائیو بھی ہیں۔آج بھی اِ س کتاب کا شمار شمالی امریکہ اور یورپ میں بڑے پیمانے پر فروخت ہونے والی کتب میں ہوتا ہے۔ ارشاد کی نئی کتاب 'اللہ، آزادی اور محبت' بھی مقبول ترین کتابوں کی فہرست میں شامل ہے ۔ارشاد نے اپنی کتاب''آج اسلام کے مسائل'' میں دیانتداری کا پیغام دیتے ہوئے آج کے اسلام کو درپیش مسائل کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کیا ہے اور اِن کے حل کیلئے اجتہادی فکر اور اجتہادی آپریشن کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ارشاد کے مخالف کٹر اسلامی انتہا پسند اِس کتاب کو اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں لیکن اگر اِس کتاب کو مکمل پڑھا جائے تو ایسا تاثر ہرگز نہیں ملتا بلکہ یہ کتاب آج کی جدید دنیا میں اسلام کے اجتہادی امکانات کو اجاگر کرتی ہے۔ لہذاٰ اِس کتاب کو، اسلام کیلئے تنقید کا پہلو نکالنے والے یا اسلام کی تشکیلِ نو کرنے والے، دونوں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اس وقت ارشاد 'پروجیکٹ اجتہاد' کی بانی اور سربراہ ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ نیو یارک یونیورسٹی کے روبرٹ ایف ویگنر گریجویٹ اسکول آف پبلک سروسز میں

’مورال کریج پوجیکٹ ‘ کی ڈائریکٹر بھی ہیں۔ وہ اسلام کے اجتہادی مسائل پر گفتگو کے لئے وقتاً فوقتاً سی این این، بی بی سی، الجزیرہ جیسے موقر میڈیا پر بھی اپنی آراء پیش کرتی رہتی ہیں۔

ابواب

پیش لفظ

ایک خط

میں کیسے ’ دھتکاری مسلمان‘ بنی؟

ستر باکرہ حوریں

ہم نے کب غوروفکر کرنا چھوڑ دیا؟

دروازے اور کمر پیٹیاں

کون کس کو گمراہ کر رہا ہے؟

اسلام کا نچلا پوشیدہ حصہ

اجتہاد کا عمل

دیانتداری کی ستائش میں

مغرب کیلئے خدا تیرا شکر

حوالہ جات و قابلِ مطالعہ

ارشاد منجی کی کتاب ایک مسلمان

عالمِ دین کی نظر میں

(ارشاد منجی کی کتاب ’’ دی ٹربل وِد اسلام ٹوڈے ‘‘ کا اُردو ترجمہ ’’آج اسلام میں مسائل‘‘ کے عنوان سے پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔ اِس کتاب کے انگریزی کے حالیہ ایڈیشن اور اُردو کے ترجمے میں شمالی امریکہ میں مقیم اسلام کے ایک مستند عالم ڈاکٹر خلیل محمد کا دیباچہ شامل ہے۔ اِس دیباچہ کے مطالعہ سے پہلے ڈاکٹر خلیل محمد کا مختصر احوال ملاحظہ فرمائیں۔ ڈاکٹر خلیل محمد سان ڈیاگو اسٹیٹ یونیورسٹی میں مذہب کے اُستاد ہیں اور یونیورسٹی کے ’سنٹر فار اسلامک اینڈ عریبک اسٹڈیز‘ کے بنیادی فیکلٹی رکن ہیں۔ وہ امام کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں اور اُن چند اسلامی دانشوروں میں سے ایک ہیں جو اسلام کے سنی اور شیعہ فرقوں میں قابلِ قبول ہیں۔

ڈاکٹر خلیل محمد، گوانا، جنوبی امریکہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میکسیکو، کینیڈا، سعودی عرب، موریطانیہ، شام اور یمن کے روایتی اسلامی اداروں اور مغربی

یونیورسٹیوں سے تعلیم پائی۔ میکسیکو سے مذہب اور نفسیات میں گریجویشن کرنے کے بعد انہیں سعودی عرب سے وظیفہ ملا اور انہوں نے ریاد کی محمد بن سعود یونیورسٹی کے کلیات الشریعہ میں داخلہ لے لیا۔ شمالی امریکہ میں واپسی پر مذہب (کنکورڈیا یونیورسٹی میں خاص طور پر اسلام اور یہودیت) کی ماسٹر ڈگری لینے کے دوران انہیں بے شمار فیلو شپ اور ایوارڈ ملے۔ بعد میں انہوں نے ' میگ گل' سے اسلامی قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ وہ برانڈیس یونیورسٹی کے اسلامی علوم میں پہلے 'کرافٹ حیت'' کے بعد از ڈاکٹریٹ فیلو ہیں۔ مساجد، جامعہ الیہود اور گرجا گھروں میں خطابات کے علاوہ، ڈاکٹر خلیل محمد شمالی امریکہ اور عرب دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتے ہیں۔ وہ اسلامی قانون کے ماہر ہیں اور اُن کے بارے مزید تفصیلات www.forpeoplewhothink.orgپر مل سکتی ہیں۔)

ڈاکٹر خلیل محمد

آئیے ایک صاف حقیقت کا سامنا کریں: مجھے ارشاد منجی سے نفرت کرنی چاہئے۔ اگر مسلمان اُس کی سنتے ہیں تو وہ مجھ جیسے لوگوں کو سننا بند کر دیں گے، ایک امام جس نے روایتی اسلامی یونیورسٹی میں سالہا پڑھایا ہو۔

وہ مرد ذات کے اختیار کو للکارتی ہے اور اسلام کے بارے وہ کچھ کہتی ہے ، جو میری خواہش ہے کہ سچ نہ ہو۔ وہ منہ پھٹ ہے اوراسلام کے موقف کو تہہ در تہہ بیان کرتی ہے۔ اُس کو موت کا کوئی خوف نہیں، سوائے اُ س موت کے جو کسی کے ذہن کو بند کرنے سے آتی ہے۔ وہ ہم جنس ہے اور میرے مدرسے نے یہ بات رفتہ رفتہ میرے ڈی این اے میں بٹھائی ہے کہ اللہ ہم جنس پرست مرد اور عورت سے نفرت کرتا ہے۔ مجھے یقیناً اِس عورت سے نفرت کرنا چاہئے۔

مگر جب میں اپنے اندر جھانکتا ہوں اور غور کرتا ہوں تو میں ایک پریشان کُن نتیجہ پر پہنچتا ہوں: ارشاد سچ بول

رہی ہے اور میرا خدا مجھے سچ کی تائید کرنے کا حکم دیتا ہے جس کا مطلب ہے کہ مجھے اُس کا ساتھ دینا ہے۔

اگرچہ یہ اِس کی وجہ نہیں ہے کہ میں اِس کتاب کا پیش لفظ لکھ رہا ہوں۔ میں ایسا اس لئے کر رہا ہوں کہ اپنی منافقت کا مظاہرہ کرتے چلے آنے کی تلافی کر سکوں۔ میں نے انتہا پسند ی کے اسلام اور دہشت گردی کی مخالفت کرتے رہنے پر اکثر اپنی بہادری کو سراہا ہے۔ میں اِس ضمن میں اپنی ستائش کو کم اہمیت کا نہیں ٹھہراؤنگا کیونکہ میں جو کرتا ہوں اُس کیلئے جرات کی ایک خاص مقدار چاہئے۔ البتہ ارشاد کی مدافعت کیلئے، جب اُس کی ضرورت ہو، مردانہ ہارمون کی عظیم قربانی میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔

حال ہی میں مجھے یہ موقع ملا لیکن میں اِس موقع سے فائدہ اٹھانے میں ناکام ہو گیا۔ میں ابھی ایک کانفرنس سے گھر لوٹا ہوں جہاں میں نے مسلمانوں سے یہ اپیل کر کے تموج پیدا کیا کہ مسلمان صیہونیت مخالفت سے ماورا ہو کر آگے بڑھیں۔ چند مسلمانوں نے یہ راست قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے، وہ مجھے ملے کہ جان سکیں

کہ میں نے ٹھیک سے کیا کہا ہے۔ گفتگو کے دوران کسی نے ارشاد کا تذکرہ کیا۔ اُس گروہ نے اُس کا بطور مصیبت کھڑی کرنے والی ہم جنس پرست لڑکی کا مذاق اُڑایا۔ اور وہاں پر میں ایک حلال مرغی کی طرح بیٹھ گیا، خاموش اور ساکن، ابھی ایک اور مسئلہ نہ سہڑنے کی خاطر۔ میں ، ''عورتوں کا ''حمایتی اور محافظ'' مردساتویں صدی کے الوہی فرمان، جو مجھے مدرسہ کے اساتذہ نے سالوں سے بتایا ہوا ہے، سے یوں دب گیا کہ ایک لفظ بول نہ سکا۔

یہ وہ گھڑی تھی جب میں نے سوچا کہ اِس تمام لغویات کو اَب ختم ہونا چاہئے۔ کیا میں مسلمان ہوں یا نہیں؟ کیا میں سچ کی پرواہ کرتا ہوں یا نہیں۔ اِسی لئے میں اَب اعلان کرتا ہوں، فقط اُن مسلمانوں کیلئے نہیں جن سے میں ملا تھابلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے یہ اعلان ہے : میں ارشاد منجی کی حمایت کرتا ہوں۔ وہ ہم سے وہ کچھ کروانا چاہتی ہے جو تمام مقدس کتابیں ہم سے کرواناچاہتی ہیں: قبائلی رویوں کا خاتمہ کر دو، اپنی آنکھیں کھولو اور استحصال کے خلاف اُٹھ کھڑے ہو جاؤ چاہے یہ استحصال قصیدے پڑھ کر حقیقت کا رنگ دینے

والے اماموں، شیوخ، ملاؤں، پروفیسروں یا اسلام میں اپنا کوئی بھی مقام اور نام تعین کر لینے والے کا کیوں نہ ہو۔ شاید ہی کبھی کسی مسلمان نے سرعام وہ کہا ہو جو ہم میں سے اکثر جانتے ہیں مگر کہنے کی ہمت نہیں۔ ارشاد اُن کچوکوں کو واپس نہیں لیتی جب وہ یہودیوں کی مخالفت کرنے والوں کو ننگا کرتی ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ اُن کو جو اسلام کی خرابیوں کو مغرب کی نو آبادیت کے سر تھوپتے ہیں، جبکہ وہ اسلام کی اپنی استعماریت کی تاریخ کو بھول جاتے ہیں اور اللہ کے نام پر مسلسل ہونے والی انسانی زیادتیوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اپنی پوری کتاب کے دوران، ارشاد اِس خداوندی حکم کی تابعدار رہتی ہے : ”اے ایمان والو، انصاف کو قائم رکھو، خدا کو حاظر ناظر جان کر گواہی دو، چاہے وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو، یا تمہارے والدین اور اولاد کے خلاف ہی ہو۔۔۔“ (القرآن، ۴:۱۳۵)

خدا کی اطاعت کرتے ہوئے ارشاد ملاؤں کو بھی مات دے دیتی ہے ۔ اجتہاد، اسلام میں آزاد فکری کی روایت، کی سب سے زیادہ زحمت طلب شرطِ اول یہ ہے کہ اجتہاد پر

یقین رکھنے والا اسلام کے تمام نئے مفکروں کے بارے آگاہ ہو۔ اِس لحاظ سے ارشاد بہت سارے علماء سے کہیں آگے ہے۔ درحقیقت اُس کی کتاب جدید مسلمان مفکرین کے خیالات کی بنیاد رکھنے کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔ یہ زاویہ اپنی ذات کے اسیرعلماء کی انا کو ٹھیس پہنچا سکتا ہے کیونکہ اُس نے سختی کے ساتھ ہماری اور ہمارے مذہبی اداروں کی حمایت میں لکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ ارشاد کا کام اُن نصابی تھیوریوں کے مطالعہ کے زمرے میں نہیں آتاجو ناقابلِ فہم ناپید جناتی زبان کے ستونوں سے ٹیک لگائے ہوئے ہوتی ہیں۔ اور نہ یہ کتاب اسلام کیلئے کوئی رومانوی غنائیہ گیت پیش کرتی ہے جس کے معنی صرف ماننے والوں کیلئے ہوں۔ اِس کی بجائے ارشاد کی دیانتداری، انداز اور واضح پن کتاب کو بذاتِ خود ایک اعلیٰ درجے تک لے آتا ہے۔

آپ کا بطور قاری اِرشاد کے تمام تجزیوں سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ میں بھی نہیں ہوں۔ بلکہ یہی ارشاد کا مقصد بھی ہے۔ مختلف رائے کی توقع کرنے سے ہی آزاد فکری پروان چڑھے گی اور یہی بات ارشاد دوبارہ اسلام

میں متعارف کروانا چاہتی ہے۔
یہاں پر میں کہوں گا۔ ارشاد منجی کیلئے اپنی حمایت کا اعتراف کرتے ہوئے میں خود کو آزاد محسوس کرتا ہوں۔ میں تقریباً بات برائے بات کہتا ہوں۔ ارشاد! تم نے ایک ایسی کتاب ، جو مجھے لکھنی چاہئے تھی، لکھ کر میرا مردانہ پن چھیننے کی جرات کیسے کی؟

میرے ساتھی مسلمانوں!

”اے ایمان والو، انصاف کو قائم رکھو، خدا کو حاظر ناظر جان کر گواہی دو، چاہے وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو، یا تمہارے والدین اور اولاد کے خلاف ہی ہو۔۔۔“ (القرآن، ۴:۱۳۵)

مجھے آپ کے ساتھ دیانتدار ہونا ہے۔
اسلام ہمیشہ میرے ساتھ ایک نازک شے کے طور پر رہا ہے ، میں ہر وقت اسی تذبذب کا شکار رہی ہوں کہ خود ساختہ اللہ کے مشیروں کی طرف سے اگلا حکم نامہ کیا آتا ہے۔
جب میں اپنے مذہب کے ذہنی رکھوالوں کے جاری شدہ فتوؤں پرغور کرتی ہوں تو انتہائی ہزیمت کا سامنا ہوتا ہے۔ کیا آپ کو نہیں ہوتا؟ میں نے ایک سعودی دوست سے سنا کہ اُس کے ملک کی مذہبی پولیس نے ایک عورت کو ویلنٹائن کے دن کے موقع پر سرخ لباس پہننے پر گرفتار کر لیا تھا، میں تب سے سوچتی ہوں کہ مہربان خدا نے

کب خوشی اور انبساط کو قانون سے بالا کیا تھا؟جب میں زنا کی شکار عورتوں کو پتھروں سے سنگسار کرنے کی خبریں پڑھتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں کہ ہماری اکثریت کیسے پتھر کی طرح خاموش ہے؟

جب غیر مسلمان ہم سے (اس طرح کی زیادتیوں کے خلاف) بولنے کی اپیل کرتے ہیں تو میںآپ کا یہ واویلا سنتی ہوں کہ ہمیں دوسرے مسلمانوں کے رویے کی وضاحت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب ہم مسلمانوں کو کسی مسئلے پرغلط طور سے سمجھا جاتا ہے تو ہم اُس مخصوص مسئلے کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ ہم غیر اقوام کو اپنے بارے میں ہم سے مختلف انداز میں سوچنے کی رعایت ہی نہیں دینا چاہتے۔

علاوہ ازیں جب میں اپنے مسلمانوں کی خامیوں کا برملا اظہار کرتی ہوں توروایتی مسلمان جو ہر موڑپرگھسی پٹی باتوں کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں، مجھ پر پیش اُفتادگی کا الزام لگاتے ہوئے مجھے غدار قرار دیتے ہیں۔

لیکن غدارکس بات کی؟ اخلاقی قدروں کی غدار؟ مشترکہ انسانی اقدار کی غدار؟شعور کی غدار؟

البتہ میں بیباک ہوں اور آپ کو میری بیباکی کا عادی ہونا

ہو گا۔ میں اپنے اس خط میں ایسے سوالات اُٹھا رہی ہوں جنہیں ہم زیادہ عرصہ چھپا نہیں سکتے۔ ہم سب کیوں فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے مابین ہونے والے معاملات میں یرغمال بنے بیٹھے ہیں؟ اسلام میں یہودیت کے خلاف ہٹ دھرم رویہ کیوں ہے؟ مسلمانوں کا استحصال کرنے والا اصل میں امریکہ ہے یا سعودی عرب؟ ہم مسلمان کیوں عورتوں کی قابلیتوں کو، جو خدا کی نصف تخلیق ہیں، تباہ کرنے کو تُلے بیٹھے ہیں ؟ ہم کیسے اتنے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم جنس پرست معاشرہ بدر یا موت کے سزاوار ہیں؟ جبکہ قرآن کا کہنا ہے کہ خدا نے جو جو چیز بنائی ہے ، شاندار بنائی ہے؟اگرچہ قرآن تو اِس سے بھی زیادہ کہتا ہے لیکن قرآن کو اِس طرح رَٹ کے پڑھنے کا کیا فائدہ، جبکہ اِس انداز کے ساتھ پڑھنے میں قرآن کے اندر تضاد اور ابہام ہے؟

کہیں اَب آپ کو دل کا دورہ تو نہیں پڑنے والا؟ اگر ایسا ہے تو جلدی کیجئے۔ کیونکہ اگر ہم اسلام کے اندر استعمارپسندوں کے خلاف بیباکی کے ساتھ نہیں بولتے تو ہم لوگ اِس کھیل سے باہر چلے جائیں گے۔ اِن انتہا پسندوں کا راستہ تباہی کی بند گلی کی طرف لے جانے

والا ہے جس میں مزید تشدد ہے ، مزید غربت ہے اور مزید اکلاپا ہے۔ کیا ہم خدا کی بنائی ہوئی اِس دنیا میں اپنے لئے ایسا انصاف تلاش کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ہم میں سے اکثر ایسا سرعام کیوں کہتے ہیں؟

میں آپ سے اکثر یہ سنتی ہوں کہ ہم مسلمان متشدد ردِعمل کا شکار ہیں۔ فرانس میں، مسلمان ایک ایسے مصنف کو عدالت میں لے گئے جس نے اسلام کو ''سب سے زیادہ احمقانہ دین'' قرار دیا ہے۔ بظاہر یہ مصنف نفرت پھیلا رہا ہے لہذا ہم نے اپنے حق کا استعمال کر دیا ، اگرچہ ہماری اکثریت اپنے اِس حق کا استعمال اپنے اسلامی ممالک میں نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا فرانسیسی مصنف یہ لکھنے میں غلط ہے کہ اسلام کو اَب بالغ نظر ہونا چاہئے ؟ اور قرآن کی یہودیت کے بارے نفرت کے اظہار کے بارے آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا جو مسلمان یہودیوں کے خلاف نفرت کو قرآن کا حوالہ دے کر درست قرار دیتے ہیں، وہ خود کو مقدمے کیلئے تیار سمجھتے ہیں؟ اور کیا یہ طریقہ کار متشدد ردعمل والا نہیں؟ تو پھر کیا چیز ہمیں خود کو ہی حق پر قائم قرار دئیے رکھتی ہے اور باقی ساری دنیا کو نسل پرست سمجھنے

پر مائل رکھتی ہے؟
ہم اپنی واضح خاموشی اور خود ترحمانہ شور کی بدولت اپنے خلاف ہی سازش کئے جا رہے ہیں۔ ہم ایک بحران کا شکار ہیں اور ہم پوری دنیا کو اِس بحران میں اپنے ساتھ کھینچنا چاہتے ہیں۔ اگر کبھی اسلامی انقلاب کی ضرورت تھی تو آج سے بہتر کوئی وقت نہیں تھا۔ ہم خدا کی خوشنودی کے واسطے، اِس انقلاب کیلئے کیا کر رہے ہیں؟
آپ حیران ہونگے کہ آپ سے اِس طرح بات کرنے والی میں کون ہوں؟ میں ایک 'دھتکاری' مسلمان ہوں۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ میں مسلمان ہونے سے منکر ہوں، اِس کا صرف یہ مطلب ہے کہ میں اللہ کے نام پر تشکیل کئے جانے والی مسلح فوج میں شرکت کرنے سے انکاری ہوں۔ میں دھتکارے ہونے کی اصطلاح اصل 'ریفیوزنک' سے لے رہی ہوں۔۔ یعنی سوویت یونین کے زمانے کے سوویت یہودی جو مذہبی اور شخصی آزادی کے دلدادہ تھے، اُن کو اِن کے کمیونسٹ آقاؤں نے اسرائیل ہجرت کرنے سے جبراً روک رکھا تھا۔ اِن دھتکارے ہوئے یہودیوں کی سوویت یونین چھوڑنے کی کوششوں کے نتیجہ میں بہت

سے ہلاک ہوئے اور بہت سوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وقت کے ساتھ اِن مستقل مزاج منکروں کی ذہنوں کو غلام بنانے کے نظام کے خلاف کاوشوں نے ایک حتمی نظام کو ختم کرنے میں مدد دی۔

اسی طرح میں نئے ریفیوزنک کو سلام کرتی ہوں، یہ وہ اسرائیلی فوجی ہیں جنھوں نے ویسٹ بینک اور غزہ میں فوجی قبضے کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ اُسی بااصول اختلاف کے جذبے کے تحت ہمیں مسلمانوں کے ذہنوں پر قبضے کے خلاف احتجاج کرنا چاہئے۔ آج اسلام میں مسئلہ ہی یہ ہے کہ لفظی تعبیر مرکزی دھارے تک پہنچ رہی ہے اور دنیا بھر میں پھیل رہی ہے۔

آپ کو مجھے یہ یقین دہانی کرانا ہو گی کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ 'صحیح' اسلام نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ درست ہوں گے۔ اِسی لئے میں یہ کھلا خط آپ کو لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہم مسلمان اُس سے بھی زیادہ ہمدرد اور غوروفکر کرنے والے ہیں جتنا علماء ہمارے بارے میں کہتے ہیں۔ مگر ایک دیانتدارانہ بحث کیلئے میں آپ کو اسلام کے حوالے سے صاف ذہن ہو کر آگے آنے کا کہتی ہوں تاکہ آپ با ضمیر اسلام

کایوں دفاع کر سکیں کہ کیا یہ اسلام کی اصل شکل ہے
یا اسلام ایک آئیڈیل شے ہے ؟ آئیے یوں دیکھتے ہیں کہ ہر
آئیڈیل شے خوبصورت ہے ۔کمیونزم بطور ہمہ گیر مساوات
ایک آئیڈیل شے ہے ۔ سرمایہ داری بذاتِ خود آئیڈیل ہے ۔
امریکی آئین سب کو آزادی اور انصاف کی ضمانت دیتا
ہے ، یہ بات آئیڈیل ہے ۔ مسلمان جانتے ہیں کہ حقیقت
بالکل مختلف ہے ۔ ضمیر رکھنے والے لوگوں کی حیثیت
سے ہمیں اسلام کے حقائق پر بھی بات کرنا ہو گی۔
میں سمجھتی ہوں کہ پیغمبر محمد نے اصل اور آئیڈیل
میں فرق روا رکھا تھا۔ جب اُن سے دین کی تعریف کرنے
کو کہا گیا تھا تو انہوں نے بارہا کہا تھا کہ مذہب وہ
طریقہ ہے جس سے ہم دوسروں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔
ایک بھرپور تعریف تھی، سادہ لیکن سہل پسندی کے
بغیر۔ اور اَب اُس تعریف کے ساتھ، ہم مسلمان جس طرح
دوسروں کے ساتھ پیش آتے ہیں، زبانی جمع خرچ کے
ساتھ نہیں بلکہ عملی طور پر، یہی اسلام ہے ۔ اِس کا
مطلب ہے کہ ہمارا اطمینان ہی اسلام ہے ۔ اِس کے یہ بھی
معنی ہیں کہ اسلام کی اچھی باتوں کو قائم کرنے کیلئے
طاقت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے ، یعنی وہ جو عورتوں کے

انسانی حقوق اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں، ایسا کرنے کیلئے ہمیں اپنے انکار ی رویے کو ختم کرنا ہو گا۔ اِن باتوں پر زور دینے کیلئے اسلام میں کوئی مسئلہ نہیں ہے ، ہم اپنے مذہب کی حقیقت کی سطح سے گرد ہٹا رہے ہیں اور اسلام کی قالین کو بطورآئیڈیل پیش کر رہے ہیں، لہذٰا اپنے آپ کو اپنے جیسے انسانوں بشمول اپنے ساتھی مسلمانوں کی ذمہ داری سے آزاد ہونا ہو گا۔ اَب دیکھئے کہ میں کیوں جدوجہد کر رہی ہوں؟

یہ کھلا خط لکھتے ہوئے میں یہ کہنا نہیں چاہتی کہ باقی مذاہب مسائل سے پاک ہیں۔ ایسا بہت مشکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ عیسائیت کے مسائل کے بارے کتب کو آزادی میسر ہے۔ یہودیت کے مسائل کے بارے کتب کی بھی کمی نہیں۔ ہم مسلمانوں کو اختلاف رائے کے شعبہ میں آگے بڑھنے کیلئے ابھی بہت کام کرناہے۔

کس کی اجازت کے ہم منتظر ہیں؟

حوالہ جات:

١۔ ”میں نے ایک سعودی دوست سے سنا کہ اُس کے ملک

کی مذہبی پولیس نے ایک عورت کو ویلنٹائن کے دن کے موقع پر سرخ لباس پہننے پر گرفتار کر لیا تھا۔‘‘ حوالہ: میرے دوست اور ’ریفارم اورینٹیڈ سعودی انسٹی ٹیوٹ ‘ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر علی الاحمد ۔ اُن کے تاثرات مجھ تک ڈاکٹر امل القہتانی کی چار جون ۲۰۰۲ء کو امریکی کانگریس کو دی جانے والی بریفنگ کی تفصیلات کے ذریعے پہنچے ، اِس موقع پر انہوں نے سعودی عرب میں خواتین کے حقوق کی بے ضابطگیوں کو بھی کھل کر بیان کرتے ہوئے کہا تھا ، ’’جنہوں نے ویلنٹائن ڈے منایاتھا ، اُن کو گرفتار کر لیا گیا تھا ، دکانداروں کو سرخ گلاب بیچنے سے منع کر دیا گیا تھا ، اُن خواتین کو مذہبی پولیس متاویٰ نے ہراس کیا جنہوں نے سرخ لباس پہنے ہوئے تھے اور بعض کو گرفتار بھی کیا گیا۔ اُن طالبات کو اسکول سے نکال دیا گیا جو ویلنٹائن ڈے پر لگنے والی پابندی کو توڑنے کی مرتکب ٹھہریں۔ دوسرے لفظوں میں سعودی عرب میں محبت کو گناہ قرار دے دیا گیا تھا۔‘‘

۲۔ ’’ہم کیسے اتنے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم جنس پرست معاشرہ بدر یا موت کے سزاوار ہیں؟ جبکہ قرآن کا کہنا ہے کہ خدا نے جو جو چیز بنائی ہے ، شاندار بنائی

ہے؟‘‘ حوالہ : قرآن ، ۳۲: ۶۔۷۔ پہلی سورہ میں اِس ضمن میں اِس سے بھی زیادہ کہا گیا ہے۔

۳۔ ’’فرانس میں، مسلمان ایک ایسے مصنف کو عدالت میں لے گئے جس نے اسلام کو ’’سب سے زیادہ احمقانہ دین‘‘ قرار دیا ہے۔‘‘ حوالہ: مائیکل ہولی بیک، لائر، ستمبر ۲۰۰۱ء ، صفحہ ۴ آن لائن ٹرانسکرپٹ۔ www.lire.fr سے ڈاؤن لوڈ کیا گیا تھا۔

میں کیسے ’دھتکاری‘ مسلمان بنی؟

گزشتہ چالیس برسوں کے دوران لاکھوں مسلمانوں کی طرح میرے خاندان نے بھی مغرب کی طرف ہجرت کی۔ ہم ۱۹۷۲ء میں کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا کے ایک متوسط طبقے کے مضافاتی علاقے رچمنڈ میں پہنچے۔ میں تب چار برس کی تھی۔ ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دوران لاکھوں جنوبی ایشیائی مسلمان یوگنڈا سے اُس وقت ہجرت کر گئے تھے جب فوجی آمر جنرل عیدی امین دیدا نے افریقہ صرف کالوں کے لئے قرار دے دیا تھا۔ اُس نے ہم جیسے بھوری رنگت والوں کو بمشکل چند ہفتے دئیے کہ یا تو ہم ملک چھوڑ جائیں یا پھر مرنے کیلئے تیار رہیں۔ مشرقی افریقہ میں عمریں بِتانے والے مسلمانوں کو انگریزوں کا شکر گزار ہونا چاہئے جو انہیں جنوبی ایشیا سے اپنی افریقی نو آبادیاتی کالونیوں میں ریلوے کی پٹریاں بچھانے لائے تھے۔ چند ہی نسلوں کے بعد اِن میں سے بہت سے مسلمان کھاتے پیتے تاجر بننے کے قابل ہو گئے۔ میرے باپ اور اُس کے بھائیوں نے کمپالا کے قریب

مرسڈیز بینز کی ڈیلرشپ قائم کی۔ انہوں نے یہ فائدہ انگریزوں کی طبقاتی تبدیلی کے نتیجہ میں اٹھایا لیکن ہم نے اِس نوعیت کا فائدہ اپنے نوکر کالوں کو پہنچانے کی شاید ہی کبھی کوشش کی ہو۔

بلکہ مجموعی طور پرمشرقی افریقہ میں مقیم مسلمانوں نے کالوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا باپ ہمارے گھریلو ملازم توماسی کو اتنی بری طرح پیٹتا تھا کہ اُس کی کالی سیاہ پسلیوں پر چمکدار نیل پڑ جاتے تھے۔ اگرچہ مجھے، میری دو بہنوں اور ماں کو توماسی کا خیال رہتا تھا، اگر ہمارا باپ ہمیں توماسی کے زخموں کی مرہم پٹی کرتے دیکھ لیتا تو وہ ہمیں مارتا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے گھر کے علاوہ ملازموں کے ساتھ ایسا سلوک بہت سارے مسلمان گھرانوں میں ہوتا تھاجس کی بھاری قیمت ہمارے خاندان کے افریقہ چھوڑ دینے کے بعد کافی عرصے تک مسلمان گھرانوں کو چکانی پڑی۔ اِسی لئے جب میں لڑکپن کی عمر میں آئی تو میں نے مشرقی افریقہ رشتہ داروں کے ہاں جانے کے موقع کو گنوانا ہی مناسب سمجھا۔ ’’اگر میں تمہارے ساتھ گئی‘‘ میں نے اپنی ماں کو متنبہ

کیا ’’ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں اپنی موٹی آنٹیوں اور موٹے ’انکلوں‘ سے پوچھوں گی کہ وہ اپنے ملازموں کو عملی طور پر غلام کیوں بنا لیتے ہیں‘‘۔ ماں کا مشرقی افریقہ کا دورہ اپنے پرانے رشتہ داروں سے ملنے کیلئے ہوتا تھا، کسی انسانی حقوق کی تحریک کے سلسلہ میں نہیں ہوتا تھا۔ سو اُس کو اپنے دورہ کے دوران پریشان و پشیمان کرنے کی بجائے میں اِدھر (کینیڈا میں) گھر پر ہی رہتی تھی۔

جب ماں اُدھر دورہ پر ہوتی تو میں اکثر یہ سوچتی کہ گھر سے کیا مراد ہے۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گھر وہ جگہ ہے جہاں میری عزتِ نفس قائم رہتی ہے اور ضروری نہیں کہ گھر وہ جگہ ہو جہاں میرے آباؤ اجداد رہتے ہوں۔ تبھی یہ بات مجھ پر روشن ہو گئی تھی کہ نوآبادیاتی بخار کے بعدحب الافریقہ کے نعرہ ’’ افریقہ فقط برائے کالوں‘‘ نے براعظم سے ہمارا صفایا کر دیا تھا، جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ اکثر مسلمانوں نے اپنے سے زیادہ کالی رنگت والوں کی عزتِ نفس مجروح کر رکھی تھی، ہم نے آبائی افریقیوں کے حقوق کو بُری طرح پامال کر رکھا تھا۔ براہِ مہربانی اَب مجھے یہ نہ بتائیے

کہ ہم نے نوآبادیاتی بے رحمی انگریزوں سے سیکھی تھی کیونکہ اِس طرح ایک سوال جنم لے گا کہ ہم نے کالوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی وہ گنجائش کیوں نہ دی جوانگریزوں نے ہمیں دی تھی؟

میں توماسی کی مثال دیتے ہوئے آپ کے نقطہ اعتراض پر معذرت خواہ نہیں ہونگی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ میں سے اکثر بھی غلامیت کی مخالفت کریں گے۔ لیکن یہ اسلام نہیں ہے جس نے ہر شخص کو توقیر دینے والے میرے عقیدے کو جلا بخشی، یہ (کینیڈا کا) وہ جمہوری ماحول تھا جہاں میں اور میرے خاندان نے ہجرت کی تھی، رچمنڈ جہاں ایک چھوٹی عمر کی مسلمان لڑکی کی منگنی ہو سکتی تھی، شادی کے لئے نہیں، میں ابھی وضاحت کرتی ہوں۔

اپنی (کینیڈا) آمد کے کچھ برس بعد جب ہمارے خاندان کے یہاں پر کچھ قدم جم گئے تو میرے باپ نے بچوں کی نگہداشت کی مفت سہولت ’روز آف شیرون بیپٹسٹ چرچ‘ میں ڈھونڈی(یوں کہئیے کہ یہ مفت سہولت اُن تارکینِ وطن اور مذہبی برادریوں سے تعلق رکھنے والوں کیلئے تھی جو مراعات کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہمیشہ ڈھونڈے

رکھتے ہیں)۔ ہفتہ کے روز جب میری ماں گھر گھر 'اے وَن' کی مصنوعات بیچنے جاتی تو بچوں سے دوستانہ تعلق نہ رکھنے والا میرا باپ ہم بچوں کو چرچ پھینک جاتا۔ وہاں ایک جنوبی ایشیائی عورت جو 'بائیبل اسٹڈی' کی نگران تھی ،مجھے اور میری بہنوں کے ساتھ وہی پیار بھرا برتاؤ کرتی جو وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کرتی تھی۔ اُس نے میرے اندریہ اعتماد پیدا کیا کہ میرے سوالات بہت اہم ہیں۔ اگرچہ سات سالہ لڑکی کی حیثیت سے میں جو سوالات اٹھاتی تھی وہ سادہ سے تھے۔ عیسیٰ کہاں سے آئے تھے؟ وہ کس زمانے میں رہے؟ وہ کیا کام کرتے تھے؟ اُنہوں نے کس کے ساتھ شادی کی؟ اِن سوالات نے کسی کو پریشانی میں نہیں ڈالا لیکن میرا مسئلہ سوالات کرتے رہنا تھا اور مزید سوالات کرتے رہنا تھا۔۔ اِن کے جواب میں مجھے ہمیشہ ایک مسکراہٹ ملی۔

ممکن ہے مجھے اِنہی سوالات کے نتیجہ میں آٹھ سال کی عمر میں سال کا بہترین کرسچئین ایوارڈ کا انعام ملاہو۔ میرا انعام ایک سو ایک بائیبل کہانیوں کی خوبصورت تصویروں والی کتاب کی صورت میں تھا۔ میں

اَب پیچھے مُڑ کر دیکھتی ہوں اور خدا کا شکر اداد کرتی ہوں کہ میں ایسے ماحول میں پلی بڑھی جہاں قرآن ہی میری پہلی اور واحد کتاب نہ تھی جیسا کہ اکثر ایمان والوں کا یہ واحد خزانہ ہوتی ہے جو انہیں زندگی میں میسر ہوتا ہے۔ 'ایک سوایک بائیبل کہانیوں' میں مرصع تصویریں تھیں، 'ایک سو ایک قرآن کہانیاں' کیسی ہو سکتی ہیں؟تب میں نے کوئی ایسی کتاب نہ دیکھی تھی۔ آج اسلام سے متعلقہ بچوں کی کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے بشمول یوسف اسلام (سابق کیٹ سٹیونز) کی کتاب ''اے فور اللہ'' کے۔۔

آزاد خیال معاشروں میں اپنی ذات کو نئے سرے سے دریافت کرنے اور اعتقاد کے ارتقاء کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔

بہترین کرسچئین ایوارڈ ملنے کے تھوڑا عرصہ بعد میرے باپ نے مجھے اِس گرجا سے باہر نکال لیا۔ ایک مدرسہ، اسلامی مذہبی اسکول وہاں جلد کھلنے والا تھا۔ یہ چھوٹی سی متحیر لڑکی زیادہ عرصہ انتظار نہ کرسکتی تھی۔ میں نے معصومیت کے ساتھ سوچا کہ اگر میرا اتوار کا اسکول (گرجا) میری کارکردگی کو ماپ

سکتا تھا تو یہ مدرسہ بھی ایک دلچسپ جگہ ہو گی۔
اِس اثناء میں ، میرے ساتھ ساتھ ایک نئی دنیا بھی ظہور پذیر ہو رہی تھی۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری تعلیم و تربیت میں اہمیت کی حامل ایک نئی تعمیر شدہ عمارت، لینسڈاؤن سنٹر کھل گئی۔ رچمنڈ کے اسکاٹش بانیوں کے نام باہر کنداں ہو گئے۔۔ برِج ہاؤس، میکنائر، برنٹ، سٹیوسٹن جیسے نام۔۔ جلد ہی مجھے ہندی، پنجابی، اُردو، چینی، کورین اور جاپانی زبانوں کے لفظوں کو ارد گرد سننے کا موقع ملنے لگا۔ اِن زبانوں نے عیبردین سنٹر کے اندر کسی غلاف کی طرح گھیراؤ کیا ہوا تھا، یہ سنٹر کچھ سالوں بعد تعمیر ہوا ، ایشیائی نمائندگی کے ضمن میں اِس سنٹر کا شمالی امریکہ کی بڑی عمارتوں میں شمار ہونے لگا۔
اِس ساری تعمیروترقی سے پہلے ہی یہ بات سوچتی رہتی تھی کہ رچمنڈ ہر اُس شخص کی آمجگاہ ہے جو بھی نیا کام کرنا چاہتا یا نئی بات سوچنا چاہتا تھا۔ جب میں دسویں جماعت میں تھی تو میں نے جے این برنٹ سیکنڈری اسکول کی طلبہ کی صدارت کا انتخاب لڑا۔ ایک سال قبل میں ''ہوم روم'' کی نمائندگی کا چناؤ اِس

لئے ہار گئی تھی کہ ایک متعصب شخص نے میرے خلاف ووٹ اِس بناء پر ڈالا کہ وہ ایک ’پاکی‘ کو اپنی جماعت کا انچارج نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اِس کے ایک سال بعد طلبہ کی اکثریت نے اِسی ’پاکی‘ کو بڑی شان سے اپنا رہنما چن لیا۔ اَب رچمنڈ میں نسل پرستی نے میرے ارادوں پر بند تو نہ باندھالیکن مجھے اپنی رنگ ونسل کے بارے جاننا پڑا۔

میرے ’اسٹوڈنٹ باڈی‘ کے صدر بننے کے چند مہینوں بعد اسکول کا وائس پرنسپل میرے لاکر کے پاس سے گزر رہا تھا اور جب اُس کی نظر ایران کے انقلابیوں کے پوسٹر پر پڑی ،جو میں نے اپنے لاکر پر چسپاں کیا ہوا تھا ،تو وہ ششدر ہو کر رُک گیا۔ یہ پوسٹر مجھے ایک انکل نے فرانس سے بھیجا تھا ، اِس پوسٹر میں ایک عورت سیاہ چادر اوڑھے جہاز کے پروں کو توڑ رہی تھی۔ جہاز کا بایاں پر سوویت ہتھوڑے اور آری سے رنگا ہوا تھااور دایاں پر امریکہ کے ستاروں اور پٹیوں سے رنگا ہوا تھا۔

”یہ مناسب نہیں ہے“ اُس نے مجھے محتاط کیا۔ ”اِس کو اُتار دو“

میں نے ساتھ والے لاکر کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک

امریکی جھنڈا لٹک رہا تھا۔ ’’ میرے ساتھ والی اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہے ‘‘ میں نے پوچھا ’’ تو میں کیوں نہیں؟‘‘

’’کیونکہ تم ہماری جمہوری قدروں کو اہمیت نہیں دے رہی، اور تمام طلبہ کی صدر ہونے کے ناطے تمہیں اِس بات کو بہترسمجھنا چاہئے‘‘۔

میں اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے اِس بات کا ادراک نہیں تھا کہ میں (اسلامی) حتمیت کو اُگل رہی تھی۔ تب میں نے اِس امر پر غور نہیں کیا تھاکہ پروپیگنڈے کے نتیجہ پر جنم لینے والے جعلی گروہ کا کسی آزاد معاشرے میں رہنے والے فخریہ گروہ سے فرق ہوتا ہے۔ میں تو مختلف پن پر وکالت کرنا چاہتی تھی کہ ستارے سے مزین بینر دیگر ہائے نقطہ نظر کو مجروح نہیں کرتا۔ لہذا میں نے بحث کی، ’’کیا میں جمہوری قدروں کی اہمیت کو گھٹا رہی ہوں؟اور جو آپ مجھے یہ بتا کر جمہوری اقدار کی حمایت کر رہے ہیں کہ میں اپنے نقطہ نظر کو بیان نہیں کر سکتی، مگر؟‘‘میں نے لاکر پر ڈھکے امریکی جھنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا، ’’کوئی دوسراکیسے کر سکتا ہے؟‘‘

ہم نے ایک دوسرے کو گھورا۔ ’’تُم ایک بُری مثال قائم کر رہی ہو؟‘‘وائس پرنسپل نے کہا۔ اُس نے اپنی تنی گردن کو پیچھے کیا اور چل پڑا۔

آپ وائس پرنسپل کو داد دیں کہ اُس نے برنٹ جونئیر اسکول میں مختلف آراء کو پنپنے دیا۔ یہ بات اِس لئے بھی قابلِ تحسین ہے کہ اُس نے ایونجلیکل مسیحی ہونے کے باوجود ایسا ماحول قائم کیا۔ اُس نے اپنے ذاتی عقائد پر پردہ نہ ڈالا لیکن اِن کو اپنے طالب علموں پر بھی مسلط نہ کیا، اُس وقت بھی نہیں جب طلبہ کونسل کی صدر خمینی کی مذہبیت کی حامی نکلی اور اُس وقت بھی نہیں جب طلبہ نے اسکول کی نیکروں کے لئے مہم شروع کی کہ یہ نیکریں سائز میں چھوٹی ہونی چاہئے تاکہ ٹانگیں زیادہ نظر آسکیں، جبکہ وائس پرنسپل نسبتاً لمبی نیکریں چاہتا تھا۔ ہمارے ساتھ گرما گرم بحث و تمہید اور کچھ تکنیکی توقف کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے اکثریت کی خواہش کو ماننا پڑا۔ آپ کتنے کٹڑ(ایونجلیکل) مسلمانوں کو جانتے ہیں جو دوسروں کا ایسا نقطہ نظر برداشت کر سکتے ہوں جو اُن کی مرضی کے خلاف ہو؟ میرے وائس پرنسپل کو پبلک اسکول سسٹم

کے آگے اپنی زبان بند کرنا پڑی لیکن ایسا نظام ایک باہمی رضا مندی سے جنم لیتا ہے جہاں لوگ مختلف عقائد، وابستگیوں اور خیالات کے ہوں اور مختلف راہیں ایک ہی مقام پر اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ کتنے مسلمان ممالک اِس طرح کے ملاپ کو گوارا کر سکتے ہیں؟

اے خدا ، میں اِس معاشرے سے محبت کرتی ہوں۔ میں اِس لئے اِس سے محبت کرتی ہوں کہ یہ ہمیشہ کیلئے نامکمل ہے ، جہاں حتمی جوابات ابھی معلوم نہیں ہوئے ، اگر وہ کوئی ہیں تو۔۔ مجھے اِس ہر لحظہ بدلتی دنیا سے محبت ہے جہاں انسانوں کی کاوشوں کی اہمیت ہے۔

لیکن گھر میں میرے باپ کے ہر لمحہ تیار گھونسے نے ہمیں تابعداری کے گھریلو اصولوں کی طرف جبراً مائل رکھا۔ رات کے کھانے کے وقت بالکل ہنسنا نہیں، جب میں تمہاری جمع کی ہوئی رقمیں اٹھا لوں تو اپنا منہ بند رکھو۔ جب میں تمہیں پشت پر ماروں تو یاد رکھو اگلی بار اس سے بھی سخت ماروں گا۔ جب میں تمہاری ماں کو بُری طرح پیٹوں تو پولیس کو مت بلانا۔ اگر پولیس آ بھی گئی تو میں انہیں واپس چلے جانے پر قائل کر لونگا اور تمہیں معلوم ہے کہ پولیس والے چلے جائیں گے اور

جیسے ہی وہ واپس جائیں گے تو میں تمہارے کان کے ٹکرے ٹکرے کر دونگا۔ اگر تم نے سوشل سروس والوں کو بلانے کی دھمکی دی تو میں تمہارے دوسرے کان کو بہرا کر دونگا۔

ایک دفعہ میرا باپ چھری پکڑ کر پورے گھر کے اندر میرے پیچھے بھاگا، میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی اور پوری رات میں نے چھت کے اوپر گزاری۔ میری ماں کو میری حالت کا کچھ علم نہیں تھا کیونکہ وہ ایک ائیر لائن کمپنی کے قبرستان میں کام کر رہی تھی۔ مجھے اب یاد نہیں کہ میں اپنی حفاظت کے سلسلہ میں اپنی ماں کی کس یقین دہانی کے نتیجہ میں چھت سے نیچے اُتری تھی۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے اسکول اور 'روزآف شیرون بیپٹسٹ چرچ' اور بہت سالوں بعد ایبرڈین سنٹر کو اس لئے پسند کیا کہ مجھے اُن کی چھتیں پسند تھیں۔ میں اِن گھونسلوں میں بیٹھی ممکنہ حد تک کھلے ذہن کے ساتھ دنیا کا جائزہ لیتی رہتی۔ مشرقی افریقہ کی مسلمان کمیونٹی جہاں سے میں آئی تھی وہاں تعلیم حاصل کرنے کا خواب دیکھا جا سکتا تھا؟سیاست میں کردار ادا کرنے کا

سوچاجاسکتا تھا؟ سیاست میں عہدہ لینے کی بات ہی نہ کیجئے۔ جب میں تین برس کی تھی تو مجھے بصیرت دینے کیلئے دانے دار کالی و سفید تصویر دکھائی گئی جس میں ایک دلہن نے اپنے سر کو ڈھانپا ہوا تھااور جس نے اپنے ہاتھ باندھے ہوئے تھے، آنکھیں نیچے جھکی ہوئی تھیں اور ٹانگیں صوفہ سیٹ سے لٹکی ہوئی تھیں۔ میں یہی سمجھ سکتی ہوں اگر ہم مسلمان ملک یوگنڈا میں رہ رہے ہوتے تو میں سخت نوعیت کی ہراست کا شکار ہوتی۔ ایک طے شدہ صورت میں انسان کس قدر بُری طرح جکڑا ہوتا ہے؟

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ (مسلمان) تارکین وطن نے رچمنڈ کا مدرسہ انسانی حقوق اور آزادی کی دھرتی میں بنا کر آمریت کی راہ کیوں چنی؟ نو برس سے چودہ برس کی عمر تک میں ہفتے کا روز مدرسہ میں گزارا کرتی تھی۔ مدرسہ کی کلاسیں نئی تعمیر شدہ مسجد کی اوپر کی منزل میں ہوتی تھیں جو مشرقِ وسطیٰ کی طرز تعمیر کی بجائے کسی بڑے سے مضافاتی گھر کی مانند تھی۔ البتہ مسجد کے اندر اسلام کا مخصوص ماحول ہر جا شدت کے ساتھ نظر آتا تھا۔ مرد اور عورتیں مسجد

میں مختلف دروازوں سے داخل ہوتے تھے اور اپنی اپنی درست سمتوں میں کھڑے ہو جاتے۔ مسجد کے ہال کو لکڑی کی ایک عارضی دیوار سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جس کے نتیجہ میں عبادت کے دوران دونوں جنسوں کی بھی علیحدگی ہو جاتی۔ اِس دیوار میں ایک دروازہ بھی رکھا گیا تھا جو مردوں اور عورتوں کے حصے کو ملاتا۔ یہ دروازہ عبادت کے بعد استعمال ہوتا جب مرد مسجد کے لنگر سے مزید کھانا طلب کرتے ہوئے اپنے برتن دروازے کی طرف بڑھاتے، اِس دوران مرد دیوار پر زور کے ساتھ دستک دیتے اور چند سیکنڈوں کیلئے کسی عورت کے بازو کا انتظار کرتے جو کھانے سے بھرا برتن واپس کرتی۔ مسجد میں مرد عورتوں کو نہ دیکھتے اور عورتیں مردوں کو نہ دیکھتیں۔ اگر ہمیں مختصر زندگیاں عطا کر کے اِسی طرح کرنے کو کہا گیا ہے تو میں تو پھر بڑی نعمت سے محروم ہو گئی۔

مدرسہ اِس سے بھی اوپر کی منزل پر تھاجس میں جلے ہوئے بھورے رنگ کے قالینی ٹوٹوں سے ایک یبوست زدہ فضا طاری رہتی جس کے اوپر چمکدار بتیوں کی روشنی پڑتی، لڑکیوں اور لڑکوں کے حصے کو الگ کرنے

کیلئے ایک مصنوعی سی دیوار کو کھڑا کیا گیا تھا جسے حسبِ ضرورت ہلا جلا دیا جاتا۔ جہاں بڑے سے کمرے میں کلاسیں اکٹھی ہوتی تھیں وہاں ایک تقسیم لڑکوں لڑکیوں کو الگ الگ کر دیتی۔ اِس سے بھی پُری تقسیم ذہن اور روح کی ہو چکی تھی۔ میں نے ہفتے کی کلاسوں سے یہ سیکھا کہ اگر آپ مذہبی ہیں تو سوچنا بند کر دیں اور اگر آپ سوچتے ہیں تو مذہبی نہیں ہو سکتے۔ یہ سادہ سا تجزیہ میرے بے پناہ تجسس کو اُبھارتا جو مجھے رچمنڈ کے مدرسے نے عطا کیا تھا۔ اِسے آپ تہذیبوں کا میراذاتی ٹکراؤ قرار دے لیجئے۔

اِس کا حل صرف یہ بات تسلیم کر لینا نہیں کہ ایک سیکولر دنیا ہے اور ایک غیر سیکولر دنیا اور ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ کار ہے۔ اِس منطق کے لحاظ سے طے شدہ غیر سیکولر 'روز آف شیرون بیپٹسٹ چرچ' کو چاہئے تھا کہ میرے سوالوں کو جھٹک دیتا لیکن اُس نے تو میرے تجسس کو سراہا۔ برنٹ جونئیر اسکول ، جو ایک سیکولر ادارہ ہے ، وہاں میرے سوالوں نے وائس پرنسپل کے اعتقاد کو بیزار تو کیا لیکن کسی نے میرا منہ بند نہ کیا۔ اِن دونوں جگھوں پر فرد کی انفرادیت برقرار رہی

لیکن میرے مدرسہ میں ایسا نہیں تھا۔ میں اِس کے اندر پولیسٹر کی سفید چادر پہنے ہوئے داخل ہوئی اور جب کچھ گھنٹوں بعد باہر نکلی تو میرے سر کے بال سیدھے ہو چکے تھے اور دل کو بھی 'سیدھا' کر دیا گیا تھا، جیسے میرے سر کے اوپر چڑھے کنڈوم نے مجھے غیر محتاط عقلی و دانشمندانہ کام سے محفوظ کر لیا ہو۔ مدرسہ کے بارے مزید سننے سے پہلے مجھے مدرسہ کے اُستاد کے بارے کچھ بتانا انصاف کا تقاضا لگتا ہے، ہم اپنے اُستاد کو مسٹر خاکی کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ایک مخلص مسلمان تھا جس طرح کے یہ ہوتے ہیں۔ اِس پتلے دبلے 'بردر،' بہترین تراشی ہوئی داڑھی (خاص طور پر صاف ستھرا) ہونڈا منی کومپیکٹ (جو میانہ روی ظاہر کرتی تھی)،نے ویک اینڈ کیلئے اپنی خدمات (جذبہ ایثار کو ثابت کرتے ہوئے) مسلمان امیگرینٹس بچوں کی مذہبی تعلیم کیلئے وقف کی ہوئی تھیں کہ کہیں یہ بچے کثیر الثقافتی معاشرے کی اقدار میں اپنی مذہبی تعلیمات کوفراموش نہ کر بیٹھیں۔ یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا جب سے مختلف عمروں کے طلبہ نے مدرسہ آنا شروع کیا تویہ اپنی آمدہ بلوغت کے خوف سے ڈرے ہوئے

تھے ، جولڑکپن کی نئی پھوٹتی مونچھوں کو غسل خانو ں میں خود ہی دیکھتے ، اور یہ صرف لڑکیاں تھیں۔ میں ایک طرح سے مذاق کر رہی ہوں۔

ہم میں سے اکثر نے مدرسہ کو کچھ سیکھنے کی جگہ نہ پایا بلکہ ایک ایسے تالاب کی مانند پایا جہاں سے مچھلیاں اپنے مستقبل کے ساتھی تلاش کرتی ہیں۔

کیونکہ زیادہ بکنے والی لڑکیوں کو شوہر نہیں ملا کرتے اس لئے میری سہیلیاں مسٹر خاکی سے شاذ ہی بحث کیا کرتی تھیں۔ مگر میرا مسئلہ کیا تھا؟ کیا میں ایک روزکسی کی بیوی نہ ہوناچاہتی تھی ؟ مجھے اب موقع نہ دیجئے۔ میرا مسئلہ، مدرسے کی حدود کی ہمہ جہت دنیا تھا۔ میں کسی چیز کے اپنے اوپر تھوپنے کی بجائے اُس کی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتی تھی۔

مسئلہ اُس نصابی کتاب’اپنے اسلام کو جانو‘ سے شروع ہوا جسے میں ہر ہفتے اپنے اسکول بیگ کے اندر رکھتی تھی۔ اِسے پڑھنے کے بعد مجھے ’اپنے‘ اسلام کے بارے جاننے کی مزید ضرورت محسوس ہوتی۔ کیوں لڑکیوں پردن میں پانچ وقت نماز لڑکوں سے کہیں کم عمر ہونے پر پڑھنافرض ہو جاتی ہے؟ اِس کی وجہ یہ ہے ، مسٹر خاکی

نے مجھے بتایا کہ لڑکیاں چھوٹی عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں اور اُن پر نو سال کی عمر میں عبادت واجب ہو جاتی ہے جبکہ لڑکوں پر یہ حد تیرہ سال کی عمر پر لاگو ہوتی ہے۔

''پھر لڑکیوں کو جلد بلوغت کے صلہ میں امامت کیوں نہیں ملتی؟ میں پوچھتی۔

''لڑکیاں امامت نہیں کر سکتیں؟''

''آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''لڑکیوں کو اجازت نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں؟''

''اللہ نے ایسا کہا ہے؟''

''اُس نے اِس کی کیا وجہ بتائی ہے۔''

''قرآن پڑھو''

میں نے کوشش (قرآن پڑھنے) کی، اگرچہ مجھے قرآن پڑھنا اِس لئے مصنوعی لگا کیونکہ مجھے عربی نہیں آتی تھی۔ کیا آپ یہاں پر میری تائید کیلئے اپنا سر نہیں ہلائیں گے؟اکثر مسلمانوں کو اِس بات کا قطعی علم نہیں کہ جب ہم قرآن کو عربی میں پڑھ رہے ہیں تو وہ کیا کہتا ہے۔ بات یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کند ذہن ہیں۔ عربی زبان

دنیا کی خوش آہنگ زبانوں میں سے ایک زبان ہے لیکن مدرسہ کی ہفتہ وار کلاسوں میں ہم اِس زبان کی باریکیوں کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ مثال کے طور پرلفظ ’حرام‘ ممنوع یا نیکی میں سے کوئی ایک معنی بھی دے سکتا ہے ، اِس کا دارومدار اِس بات پر ہے کہ کس بات پر زور دیا گیا ہے ، ممنوع بمقابلہ نیکی۔ ہم یہاں پر ذو معنویت کی بات نہیں کر رہے۔ اِسی طرح عربی کا لفظ حصار گرفتاری یا حفاظت دونوں کے معنی دے سکتا ہے۔ عربی زبان سے وابستہ خاصیتوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے کچھ حقائق کو بھی شامل کر لیجئے۔ میرے معاملے میں، ایک متشدد باپ جو مذہب کو عام طور پر دکھاوے کے طور پر استعمال کرتا ہو اور ماں جو اپنے کام کی شفٹ کے بعد گھریلو معاملات کو انتہائی خلوص کے ساتھ سہارا دیتی رہتی تھی۔ اِن حالات میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں عربی سیکھنا ہمارے خاندان کی ترجیح نہ بن سکا۔ اُدھر مسٹر خاکی کا میرے تمام سوالوں کا کل جواب ”قرآن پڑھ لو“ مجھے اِس طرح چپٹا سا محسوس ہوتا جیسے چادر کے نیچے جکڑے میرے بال چپٹے ہو گئے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ''قرآن پڑھ لو'' والے اِس جواب نے میرے اندر مزید سوالات کو جنم دیا۔ کیوں میں مستقل طور پر جھوٹ موٹ قرآن عربی میں پڑھتی رہوں جب میرے لئے اِس کے کوئی معنی ہی نہیں اور نہ یہ میرے دل کے تاروں کو چھوتا ہے؟ ہم اِس پر شبہے کا اظہار کیوں کرتے ہیں کہ قرآن کا ہر انگریزی ترجمہ اِس کے اصل مواد کو مجروح کرتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اگر قرآن ایک سیدھی صاف گو کتاب ہے جیسا کہ اِس کے مبلغین ہمیں بتاتے ہیں تو پھر اِس کی تعلیمات ہزاروں زبانوں میں بآسانی ہو جانا چاہئیں؟ آخر کار ، یہ بدنامی بھی کیوں ہمارے سر آتی ہے جنہیں عربی نہیں آتی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں عرب مسلمان بیس فیصد کے لگ بھگ ہیں؟ ترجمہ باقی قریباً اسی فیصد مسلمانوں کیلئے ہے جو عرب نہیں۔ ''اپنے اسلام کو جانو''وہ بے نیازی کے ساتھ کہتے۔

کونسا اسلام؟ کیا یہ مذہب ہے یا مسلک؟

اچھا چھوڑیے ، تھوڑا وقفہ کیجئے۔

میرے اِس بنیادی سوال کو مسٹر خاکی کیلئے پھر اُٹھائیے: کیوں لڑکیاں امامت نہیں کرا سکتیں؟ اِس بات

کو جانتے ہوئے کہ قرآن کا حکم کسی دوسری کتاب میں بھی دہرایا گیا ہو گا، جستجو کی عبادت کرتے ہوئے میں نے مدرسہ کی لائبریری تک رسائی کی کوشش کی۔ میرے اِس دورہ کیلئے اہتمام کیا گیا۔ لائبریری الماریوں کی ایک قطار کی شکل میں تھی جنہیں مسجد کے مردانہ حصے کی سیڑھیوں کے اوپر رکھا گیا تھا ، جو عورتوں کی دسترس سے باہر تھا اُن سے کسی قسم کی پیشگی اجازت لئے بغیر۔۔ گیارہ سال اور لازمی بلوغت کی عمر پر پہنچنے کے سبب میں بالغ مردوں کے ساتھ میل جول نہ رکھ سکتی تھی۔ لہذا مجھے ایک لڑکے کی مدد لینا پڑی جو بارہ سا ل یا اُس سے کم عمر ہونے کی وجہ سے لازمی بلوغت کی عمر سے کم تر تھا جو میرے لئے سیڑھیاں پھلانگتا اور جب میں لائبریری میں تلاش شروع کرتی تو میرے لئے اجازت طلب کرتا۔ جیسے ہی مجھے اندر جانے کا سبز اشارہ ملتا، سب مردوں کو کمرہ خالی کرنا ہوتا تب میں سیڑھیوں پر کھڑی ہو سکتی اور الماریوں میں پڑے بازاری پمفلٹوں میں سے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔ اگرچہ مجھے بہت محدود وقت ملتا کیونکہ مرد واپس کمرے میں آنے کیلئے میرے باہر جانے کا

انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ میں ہر بار لائبریری سے کچھ پمفلٹ لے جاتی لیکن اُن کے متن پر عمل کرنا ناممکن ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اِن پمفلٹوں کے مصنفین کن اسکولوں سے پڑھے ہوئے تھے۔ مسجد و مدرسے کے اندر دو سالوں کی تلاش و بسیار لاحاصل ثابت ہوئی۔ جب میں تیرہ برس کی ہوئی تو احساس ہوا کہ مجھے اپنے سوالوں کے جواب کیلئے مسٹر خاکی اور مدرسہ سے کنارہ کشی کرنا پڑے گی۔

میں شاپنگ مال کی بھیدی ہو چکی تھی، میرا مشن کیا تھا؟ قرآن کا انگریزی ترجمہ ڈھونڈنا جو مجھے لینسڈاؤن سنٹر سے مل گیا۔ خدا میرے شہر کے بازارِ عقائد پر مزید مہربانی کرے۔ معلومات کی آزادی نے مسٹر خاکی کو ڈرایا ہوا تھالیکن یہی وہ آزادی تھی جس نے اُس کی ایک طالبہ کو اُس کے مذہب کی معلومات ڈھونڈنے پر اُکسایا ہوا تھا جو معلومات اُس کا مدرسہ فراہم نہ کر سکا تھا۔

لڑکیاں کیوں امامت نہیں کرا سکتیں، اِس بارے مجھے کیا جواب ملا، میں آپ کو فوری نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ اگر ملا اور مدرسہ کے اساتذہ بزعم خود جواب دیتے ہیں تو

قرآن تو نہیں دیتا۔ میں جو آپ کو ابھی بتا سکتی ہوں کہ اِس اثناء میں الیکشن کا زمانہ ہو، ڈرامہ ریہرسل کا دور رہا ہو، والی بال کی مشقیں ہو رہی ہوں، یونیورسٹی جانے کی بات ہو، یونیورسٹی کے اندر ہوں یا باہر ہوں،مذہب کی بنیادات کو سمجھنے کے راستے پر گامزن میرے دماغ کے بالائی حصے میں یہ '' زنانہ سوال''سوار رہا (کہ لڑکیاں کیوں امامت نہیں کرا سکتیں؟)اِس مرحلے پر اِس جواب کوافشاء کرنااپنی جوانی کی زندگی کی طرف جست لگانے کی بات کرنے کے مترادف ہے۔پہلے مجھے کسی اور معاملے سے نپٹنا ہے۔

یہودیت کا معاملہ۔۔ یہ دوسرا سوال تھا جو مجھے مدرسہ کی پڑھائی کے دوران مضطرب کئے رکھتاکیونکہ (پڑھائی کے دوران) یہودیوں کی سیاہ کاری کا باقاعدہ تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ مسٹر خاکی نے ہمیں پڑھاتے ہوئے سپاٹ چہرے کے ساتھ واضح کیا کہ یہودی مولا کی عبادت کرتے ہیں، اللہ کی عبادت نہیں کرتے اور اُن کی بت پرستی میری پاکبازی کو ضائع کر دے گی اگر میں اُن کے ساتھ گھومی پھری۔ ''مسٹر خاکی، کس سیارے پر بستے ہیں؟'' مجھے حیرت ہوئی۔ کیا مسٹر خاکی اپنے

علاقے کے گردونواح سے بے بصیرت تھے؟ رچمنڈ، سطح سمندر سے نیچے کا مضافاتی شہر، جو ایشائیوں کے کاروباری اثرات میں زیادہ ڈوبا ہوا تھا نہ کہ یہودیوں کے مالی ذخائر کے انبار میں۔ اگر اُن دنوں رچمنڈ میں یہودیوں کی ایک عبادت گاہ بھی تھی تو مجھے اُس کا بھی علم نہیں تھا۔

مزید براں، ہو سکتا ہے کہ میں یہودیوں کی طاقت کے سبب اُن کی ایجنٹ تھی کیونکہ میں ہر بار تاریخ کے حوالے سے مسٹر خاکی کے پُر جوش اسباق کے دوران یہودیوں کے بارے سوالات کر کے دخل اندازی کی موجب بنتی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پوچھا کہ کیوں پیغمبر محمد نے اپنی فوج کو یہودیوں کے ایک پورے قبیلے کو مارنے کا حکم دیاتھا جبکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ قرآن اُن پر امن کا پیغام لے کر آیا تھا۔ مسٹر خاکی اِس بات کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے مجھے مار ڈالنے والی حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنا ہاتھ لہرا کر غصیلہ اشارہ دیااور تاریخ کی کلاس کو ختم کر دیا، اگلی کلاس قرآن کے مطالعہ کی شروع کر دی۔ میں اپنے ’منہ پھٹ‘ منہ کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔

ایک سال بعد میں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ خریدا۔ مسٹر خاکی اور میں ایک دوسرے سے کھچے رہنے لگے۔ اَب تک میں نے کوئی ایسی چیز نہ پڑھی تھی جو مجھے قائل کرتی کہ 'یہودی سازش' بھی کوئی شے ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ قرآن کو جذب کرنے کیلئے ایک سال کا عرصہ بمشکل ہی کافی ہے اور چودہ برس کی عمر میں ذہنی بلوغت ہونے میں ابھی بہت سی کسر رہتی ہے۔ ابھی میں مکمل طور پر مسٹر خاکی کے یہود مخالف وعظوں کو رد نہ کر سکی تھی۔میں تب اِس بات کا فیصلہ کرنے والی کون ہوتی تھی کہ وہ بکواس سے بھرا ہوا شخص ہے، جب تک کہ اصل باتوں کی تہہ تک نہ پہنچ لیتی؟سو میں نے انہیں چیلنج کیا کہ وہ ثابت کریں کہ یہودی پلاٹ کیا ہے؟ لیکن انہوں نے جو کہا وہ حد تھی"یا تو تم اِس بات کو مانو ورنہ دفع ہو جاؤ، اگر تم دفع ہو جاتی ہو تو تم تمام اچھائیوں سے دور ہو جاتی ہو"۔

"واقعی؟ یہ بات ہے؟"

"یہی بات ہے!"

پولیسٹر کی چبھنے والی چادر کے نیچے کنپٹیوں کے زور

سے پھڑکنے اور گردن پربہتے پسینہ کے ساتھ میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے مردانہ اور زنانہ حصے کی پارٹیشن کو جیسے ہی عبور کیا تو میں تمام لڑکوں کو اپنا آپ دکھانے کیلئے اپنے سر سے چادر ہٹا سکتی تھی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی قسم کی حقارت یا ذلت میرے پیچھے بھاگتی کیونکہ مسٹر خاکی اَب کوئی فتنہ بھی کھڑا کر سکتے تھے۔ میں اگر اُس وقت کچھ کرنے کا سوچ سکتی تھی تو میں نے یہ کیا کہ میں نے مدرسے کا بھاری آہنی دروازہ غصے کے ساتھ کھولا اور چلائی، ''جیسس کرائسٹ''، نجات کا ایک مقبول نعرہ، میرا اُس وقت یہی مطلب تھا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ عیسیٰ بھی تو یہودی تھے۔ آپ کو ابھی بھی حیرت کا سامنا ہے کہ مدرسہ سے اخراج کے بعد کچھ عرصہ تک میں کیوں تمام مذاہب کو کوستی رہی اور اپنے آپ کو ہر بندش سے آزاد شمالی امریکی کے طور پر محسوس کرتی رہی؟ ایک حد تک تو شناخت کی ناگزیریت میرے اندر سرایت کر گئی تھی۔آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔ ہم میں سے اکثر مسلمان مسلمان نہیں رہتے جب ہم اپنے بارے

میں سوچتے ہیں لیکن چونکہ ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں، اس لئے ’’ہم مسلمان ہیں‘‘۔

میرے مدرسے نے میری ماں کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی، اگرچہ میری ماں میرے ساتھ ایک عرصہ سے رہ رہی تھی وہ مسٹر خاکی سے معافی مانگنے کے ضمن میں مجھے کہہ سکتی تھی لیکن اِس کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی اُس نے اپنے ساتھ مسجد جانے کیلئے مجھے مجبور کیاتھا۔ مزید کچھ برسوں تک میں خود ہی مسجد جاتی رہی۔ مسجد واحد جگہ رہ گئی تھی جو میرے مسلم پن کی کمزوری کے نقشے پر موجود تھی۔

میں خدا سے محبت کرتی تھی اور میں مدرسے کے گناہوں کی سزا مسجد کو نہ دینا چاہتی تھی، جب تک یہ بات میرے اندر نہ بیٹھ گئی کہ مدرسہ جس سے مجھے کراہت آنے لگی تھی، اُسی مسجد کی توسیع ہے۔ مسجد جانے سے مجھے مسلمان ہونے کی شناخت تو مل رہی تھی لیکن اِس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک اور شے کی قربانی دینا پڑ رہی تھی، جو میری شناخت کیلئے بہت مقدس تھی، وہ شے تھی غوروفکر۔۔

میں آپ کو ایک اور واقعہ سناتی ہوں۔ اسلام کے پانچ

ستونوں میں سے ایک خیرات بھی ہے۔لہذا ایک شام اِس بات کی منظوری کی گھنٹی میرے کان میں پڑی جب شام کو مسجد کے زنانہ حصے سے لاؤڈ اسپیکر پر ملا جی مسجد کے مردانہ حصے پر چلا رہے تھے کہ ہمیں سمندر پار اپنے مسلمان بہنوں اور بھائیوں کیلئے چندہ اکٹھا کرنا ہے ، ہمیں چند دنوں کے اندر اندر اپنے چیک تیار کرنے کا کہا گیا۔ وقفے کے دوران میں نے خواتین 'مددگار' کی ایک رُکن سے پوچھا کہ یہ رقم کہاں بھیجی جائے گی۔ اُس نے ایک بھاری بھرکم نام والی اسلامی تنظیم کا نام بتایا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ چندہ کس کام کیلئے خرچ ہو گا۔ ''اپنے مسلمان لوگوں کی خوراک کیلئے '' اُس نے جواب دیا۔ مجھے ٹی وی پر نشر ہونے والی کئی صحافتی تفصیلات یاد آئیں جس میں کچھ مسیحی خیراتی اداروں میں غبن کے واقعات ہوئے تھے۔ میں نے (انہی خبروں کو یاد کرتے ہوئے) پھر پوچھاکہ ہمیں اِس بات کا کیسے یقین ہو گا کہ جو رقم ہم جس کام کیلئے دے رہے ہیں وہ اُسی پر خرچ ہو گی۔''یہ رقم مسلمانوں کیلئے جا رہی ہے'' وہ کھٹاک سے بولی۔ '' تمہارے لئے یہی جاننا کافی ہونا چاہئے۔''

کیا آپ اس طرح چندہ دیں گے؟ میں تو نہیں دے سکتی۔ میرا جھگڑا چندہ دینے کا نہیں تھا بلکہ معلومات فراہم نہ کرنے سے تھا۔ میں صرف اس بات پر کیوں اکتفا کر لوں کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں صرف اُن کو ہی میرا چندہ پہنچے گا؟ یہ فقط مسلمان ہونے کے وصف سے ہے؟ یا پھر ہر مسلمان ہی نیک ہے؟مذہب کے بارے بات کرنے یا میرے سوالات اٹھالینے سے کونسا جرم سرزد ہو گیا؟ یا پھر ایسے سوالات کرنا بذاتِ خود ایک جرم ہے؟ میری پریشان حال ماں قطعی اِس بات سے پریشان نہیں ہوئی جب میں نے اُس کو بتایا کہ میں اپنے گھر گا چندہ نہیں دونگی۔ کیونکہ ویسے بھی کون اِس بات کی پرواہ کرتا ہے کہ ایک بھوکے آدمی کا مذہب کیا ہے اور علاوہ ازیں میرے لئے وہ سارا منصوبہ (چندے والا) ہی مشکوک تھا جو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اِس کی بجائے، میں نے سوچا کہ میری خیرات کسی ایسے غیر مذہبی خیراتی ادارے کو جانا چاہئے جس کی کارگزاری کو میں خود جان سکوں۔

جوں جوں مجھے مسجد مدرسے کی طرح ہی نظر آنے لگی، میں نے وہاں جانا کم کر دیا۔ میں نے اپنے لئے مذہب

کی مرکزیت کو بھی کم کرنا شروع کر دیااور خدا کے ساتھ اپنا ذاتی تعلق جوڑنے کا آغاز کر دیاچہ جائیکہ اُس کو کسی مذہبی وسیلے سے ڈھونڈا جائے۔ اِس رجحان کے ساتھ میں نے گوشہ نشینی میں نماز پڑھنا شروع کر دی(''اکیلے سر جھکا کر''جیسا کہ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر سماجیات رابرٹ پُٹمین کا کہنا ہے)۔ کئی سالوں تک میں ہر روز صبح جلدی اٹھتی اور کانپتی ہوئی ایک سرد غسل خانے میں گھس جاتی۔ میری تارکِ وطن ماں کا یہ عقیدہ تھا کہ بل زیادہ نہ آئیں اور بجلی وگیس زیادہ استعمال ہو (جو کہ ممکن نہ تھا)۔ اپنے پاؤں، ہاتھ، بازو اور چہرے کو ڈھونڈنے کے بعد میں راہداری میں ریشمی جاء نماز کو کھولتی، اُس کو قبلہ رخ کرتی اور عرب دھرتی کی طرف سجدہ کرتی جسے میرے آباؤ اجداد چھو سکیں، میں دس منٹ تک نماز میں مگن رہتی۔ یہ نظم و ضبط قائم کرنے کی مشق ہے اور خاص طور پر جب آپ دن میں مزید دو بار اپنے آپ کو صاف کرتے ہیں اور نمازوں کے چار مزید 'سیٹ' ادا کرتے ہیں۔

اِسی لئے جسم کے اُن حصوں کو دھونا، جن کے بارے

حکم دیا گیا ہے ، اور اِس کے ساتھ مخصوص آیات پڑھنے کے پورے عمل کے بعد فرشتوں پر غیر مشروط ایمان لانا ، وہ بھی دن کے مقررہ اوقات پر ، ذہن کو اطاعت و اطاعت گزاری کی تنزلی کاعادی بناتا ہے ۔ اگر آپ نے یہی طریقہ کار اپنے والدین اور والدین کے والدین میں نہیں دیکھا تو پھر تومیرے دوست آپ بہت غیر معمولی قسم کے مسلمان ہیں ۔ مجھے اِس بات کا بھی احساس ہونے لگا کہ تقویٰ کی جن تعلیمات سے میرا آغاز ہوا تھا وہ تو مجھے اَب کوئی رٹی رٹائی شے لگنے لگی ہے ، اور یہ احساس مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں اپنی معمول کی روایتی نماز کو کسی اور قسم کی خود آشنا عبادت سے بدل لوں جو مجھے دن بھر اپنے خالق سے گفتگو کرنے کا صاف گو، بے تکلف اور غیر رسمی انداز دے ۔ یہ ایک پھڑ پھڑاتا ہوا احساس تھا لیکن میں کہہ سکتی تھی کہ یہ میرے اپنے الفاظ تھے ۔

اُس مرحلے پر میرے لئے جست لگاتے ہوئے یہ اعلان کرنا مشکل نہ تھا کہ اسلام تھوک کا مال ہے اور اپنی مسلمان شناخت سے باہر نکل جاتی۔ آپ کو معلوم ہے کس چیز نے مجھے روکے رکھا؟ انصاف کی منزل کی

طرف سرگرداں سفر نے ۔۔ میرا ہمیشہ سے یہ نقطہ نظر رہا ہے کہ اسلام کو سمجھنے کا مناسب موقع دیا جائے ، میرے مغربی طرزِ فکر کے مطابق کسی بھی چیز کو پرکھنا ہوتا ہے ۔میں نے اسلام کو ظاہراً نظر آنے سے زیادہ اِس کے اندر کی شخصیت کو دریافت کرنا چاہا۔ اِس کی ایک وضاحت کرونگی جب میں تیرہ برس کی تھی تو میری ایک بدمزاج کزن کے حوالے سے میری ماں نے مجھے تلقین کی کہ میرا رویہ اُس کے ساتھ اچھا ہونا چاہئے۔ ''وہ اپنا خاندان ہے'' ماں نے کہا، ''وہ ہمارا خون ہے''۔میں نے دوسری طرف منہ کر کے کہا کہ خون میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اِس موقع پر متعلقہ سوال یہ بنتا تھا کہ کیا میں اِس طرح کی بدمزاج لڑکی کو اسکول میں اپنی سہیلی بنا سکتی تھی جو میری رشتہ دار نہ ہوتی۔ خیر اِس بات کو جانے دیجئے۔ اپنی کزن کو پسند کرنے کے حوالے سے اپنی توانائی خرچ کرنا ایک لغو بات ہو گی اور مجھے اپنے دستیاب وقت میں کرنے کو بہتر چیزیں پڑی ہیں۔ اگرچہ ماں اس بات کو سمجھتی تھی لیکن میرے ساتھ متفق نہ ہوتی تھی۔ اُس کے لئے اپنے خاندان کا ہاتھ اوپر تھا ، میرے لئے سلسلہ نسب اُس طرح

اہم نہ تھا جس طرح شخصیت تھی۔
میں مذہب کو بھی اِسی معیار پر پرکھتی تھی۔ یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ مجھے اسلام پر عمل کرنا ہے ، مجھے یا تو اِس کی خصوصیات دریافت کرنا ہونگی اور یا خصوصیات کی کمی کو جاننا ہو گا۔ اور مجھے یہ ساری دریافت خود سے ہی کرنا ہو گی، مسجد کو بیچ سے نکال کر اور اُس کے راست باز پرگراموں کو بھی بیچ سے نکال کر، اسلام کو اندر سے خود ہی کھوجنا ہو گا۔ ممکن ہے کہ قرآن یہودیوں کی توہین کرتا ہو اور عورتوں کو مطیع بناتا ہو۔ یا پھر ممکن ہے کہ مسٹر خاکی ایک نالائق اُستاد ہو۔ ممکن ہے کہ خدا (قرآن میں) حکم دیتا ہو کہ ہر شخص کو عربی بولنی چاہئے۔ یا پھر ممکن ہے کہ یہ انسان کا اپنا بنایا ہوا قانون ہو تاکہ تمام مسلمانوں کو اپنا مطیع بنایا جائے۔ ممکن ہے کہ مذہبی باتوں سے انحراف کے نتیجہ میں خدائے پروردگار کی توہین ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم خدا کی تخلیقی قوتوں کا اعتراف کر رہے ہوں جب ہم انہیں خود سے استعمال کرتے ہیں۔ میں کوئی بات جانتی نہیں تھی ۔ لیکن متبادل کا کھوج نکالے بغیرباہر نکل جانا ایسا ہی

ہے کہ جیسے آپ بھاگ کھڑے ہوں۔
اچھی بات یہ تھی کہ میں جانتی تھی کہ میں دنیا کے ایسے حصے میں رہ رہی ہوں جو مجھے کھوج لگانے کی اجازت دیتا ہے۔ اُس آزادی کا شکریہ جو مغرب نے مجھے عطا کی تھی، سوچنے کی، تحقیق کرنے کی، بولنے کی، تبادلہ خیال کرنے کی، بحث و مباحث کی، چیلنج کرنے کی، چیلنج ہونے کی اور پھر سے غوروفکر کرنے کی۔۔ میں اپنے مذہب کو اُس روشنی تلے پرکھنے کیلئے تُلی ہوئی تھی جو روشنی مجھے مدرسے کے تنگ نظر عالمِ خرد مسلمان ماحول سے نہ مل سکی تھی۔ مجھے اسلام اور مغرب میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا بھی مقصود نہیں تھا ، بلکہ اِس کے برعکس مغرب نے میرے لئے سردست اسلام کا انتخاب کرنا ممکن بنایا ہوا تھا۔ اَب یہ اسلام پر تھا کہ وہ مجھے اپنے اندر سموئے رکھتا۔
میں نے کبھی بھی مذہب کو سر پر سوار نہیں کیالیکن ایک سوال بار بار ابھرتا اور میں اُس کے جواب کی تلاش میں صرف ایک مقام پر یہ سوچ کر گئی کہ شاید مجھے وہاں سے اِ س کا جواب مل جائے۔ تصور کیجئے ، ۱۹۸۰

اورشروع ۱۹۹۰ کے انٹر نیٹ کے زمانہ کی پبلک لائبریری کا۔ میں نے اسلام کے بارے جو زیادہ پڑھا ہے وہ اسی لائبریری کی درسی کتابوں سے کشید کیا ہوا ہے۔ بہت سارے حوالہ جات اور چھوٹے چھوٹے خدشات۔۔ پھر چودہ فروری ۱۹۸۹ کو ایران کے آیت اللہ خمینی نے ''شیطانی آیات'' کے مصنف سلمان رُشدی کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔ بعد میں اِس فتویٰ کو رُشدی نے (چودہ فروری کی مناسبت سے) غیر مضحکہ ویلنٹائن کہہ کر مغربی دنیا سے مطالبہ کیا کہ وہ اِس مذہبی حکومت کے خلاف ڈھکے چھپے کہنے کی بجائے ٹھوس اقدام کرے۔ مغرب میں بہت سارے لوگوں نے اِس (رشدی کے خلاف فتویٰ) موت کے وارنٹ کے خلاف آواز اٹھائی اور میں اِس آواز کی اہمیت کو تسلیم کرنے میں متامل رہی۔ پبلک لائبریری میں اِس فتویٰ کے خلاف میں جو تجزیے دیکھتی رہی اُن تجزیوں میں مسلمانوں کے غصے کے حوالے اطمینان کا پہلو پایا جاتا تھا۔ یہ تجزیے یہ پوچھنے سے قاصر رہے کہ اگر قرآن ایسی ہی اَن چھوئی کتاب ہے، جیسا کہ الہامی کتاب ہوتی ہے اور ہمیں اِس کو تراشیدہ بت کی طرح ماننا ہے ۔ مذہبی احترام کے چکر میں مغربی

دنیا نے غوروفکر کی راہیں منتشر کر دیں، مغربی دنیا جس سے میں پیار کرتی تھی۔ کیا اِس دنیا کا کثیر الثقافتی معاشرہ اپنا ذہن کھو بیٹھا تھا؟

اِس بحرانی موقع پر، میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ میں یہ اِس لئے کہہ رہی ہوں میرے لائبریری کے دوروں کا وہ زمانہ ایڈورڈ سعید کا زمانہ بھی ہے۔ وہ امریکی عرب دانشور ہے جس نے ۱۹۷۹ء میں ''اورینٹلزم'' (مشرقی تہذیب کا مطالعہ)کی اصطلاح مسلمانوں کو مغرب کی طرف سے نوآبادتی نظام میں جکڑنے کے فرض شدہ رویے کے پیشِ نظر برتی اورجس کے مطابق مغرب کی جانب سے مسلمانوں کو مشرق کی انوکھی مخلوق بتایا گیا ہے۔ ایک جبری نظریہ (ایڈورڈ سعید کا) جو یہ رتی بھر نہیں بتاتا کہ اِسی سامراج مغرب نے ایڈورڈ سعید کی کتابوں کو چھاپا، دنیا بھر میں پہنچایا اوراِن کتابوں کو فروغ دیا۔

ایک عشرے کے اندر اندر ایڈورڈ سعید نے ایک طیش کی صورت میں شمالی امریکہ اور یورپ کے نوآورد طلبہ کوسرگرم کارکنوں میں ڈھال دیا۔ ایڈورڈ سعید کیلئے اُن کی پوجا نے اسلام کے بارے میں دیگر مباحث کے راستے

کو روک دیا۔ اُسی زمانے میں سلمان رُشدی کی کتاب 'شیطانی آیات' شائع ہوئی، ایڈورڈ سعید کے شاگرد مشرقی تہذیب کے دلدادہ کی حیثیت(آپ انہیں نسل پرست بھی کہہ سکتے ہیں) سے رشدی کی مذمت کیلئے اِس لئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اُن کیلئے کوئی بھی ایسی شے ناگوار تھی جو مسلمانوں کے جتھے کو ناگوار تھی۔ میرے تجربے کے مطابق پبلک لائبریری بھی اِس ناگواریت سے نہ بچ سکی۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط کے بعد میں نے مغرب اور اسلام پر ایمان دوبارہ لانا شروع کر دیا۔ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ انٹر نیٹ عام ہو گیاتھا۔انٹر نیٹ پر ویب سائٹیں بنانے کے عمل کے ساتھ خود ساختہ سنسر کا رویہ بے معنی ہوتا چلا گیا۔ ۔ کوئی بھی ایسی بات کہہ سکتا ہے جو آپ کہنا نہیں چاہتے۔۔ انٹر نیٹ ایسا مقام بن گیاجہاں دانشورانہ خطرات مول لینے والے بالآخر بخارات کی طرح پھیل گئے۔ انہوں نے اُن تمام خیالات کی ازسرنو تجدید کرنا شروع کر دی جن خیالات نے مغرب کو تہذیب کا ایک سرگرم گہوارہ بنایا تھا، مغرب کی کھوج سے محبت، بشمول اپنے ہی تعصبات کی کھوج ۔ اور جیسا

کہ ناقدین اسلام کی بھی گہری جانچ کرتے ہیں، میں نے اپنے مذہب پر ہونے والے چند منہ توڑ اعتراضات کے حوالے سے کام شروع کر دیا۔

ہم میں سے کتنے یہ بات کس حد تک جانتے ہیں کہ اسلام ”یہودیوں کا عطا کردہ“ تحفہ ہے۔ خدا کی تخلیق کی اہمیت، خدا کا فطری اور اکثر اوقات پُراسرار انصاف، خدا کی مخلوق ہونے کے ناطے اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے والی ہماری قدرتی صلاحیتیں، ہماری زمینی زندگیوں کا مقصد، حیات بعد الموت کی لامحدودیت، یہ اور اِس طرح کی بڑی بڑی مذہبی باتیں یہودیت سے اسلام تک پہنچیں۔ اِس کھوج نے میرے دماغ کو اُڑا کر رکھ دیا کیونکہ اِس کے نتیجہ سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا یہود مخالف ہونا ناواجب ہے۔ اگر کوئی حقیقت ہے تو ہمیں یہودیوں کا ممنون ہونا چاہئے نہ کہ اُن سے متنفر۔

جب تک میں نے خود علم حاصل نہ کر لیا تب تک مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ مسلمان اُسی خدا کی عبادت کرتے ہیں جس کی عبادت یہودی اور مسیحی بھی کرتے ہیں۔ قرآن بھی اِس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ اگرچہ سچ

یہی ہے ، مجھے برطانوی مذہبی دانشور کیرن آرم سٹرونگ کی تازہ کتاب تب پڑھنے کا موقع ملا جب میرا ذہن مدرسے کا بھی تربیت یافتہ تھا (اُب آپ کو کیا بتاؤں کہ ''ڈی پروگرامننگ'' بھی کتنے مراحل سے گزر کر ہوتی ہے)۔ آرم سٹرانگ اِس بات پر زور دیتی ہیں کہ پیغمبر محمد نے پوری دنیا کیلئے کسی نئے خدا کو متعارف کرانے کا دعویٰ نہ کیا تھا۔ اُن کا ذاتی مقصد عربوں کو ''ہدایت شدہ'' ابراہیم کے خاندان کی طرف لانا تھا ، پہلے پیغمبر جن کو یہ الہامی ادراک ملا تھا کہ صرف ایک مطلق العنان خدا ہے۔ مدرسے میں اپنی تعلیم کے دوران میں نے تاریخ کے اسباق کے دوران کبھی ابراہیم کا نام نہ سنا تھا۔ نمایاں طور پر یہ بتانے سے بھی نظر انداز کیا جاتا رہا کہ ابراہیم کی نسل نے ہی یہود قوم بنائی تھی۔ خدا کی وحدانیت کے تمثیل کاروں کے طور پر یہودیوں نے ہی مسیحیوں کیلئے بنیادات فراہم کی تھیں اور بعد میں انہی بنیادات کی بنیاد پر مسلمان نمودار ہوئے۔ لہذا آپ دیکھئے ، مسلمانوں نے ایک خدا کو ایجاد نہیں کیا ، انہوں نے اُس کو اللہ کا نیا نام دیا۔ اللہ ''دی گوڈ'' کا عربی نام ہے ، یہودیوں اور مسیحیوں کا گوڈ۔۔

مدرسہ کی تعلیمات میں اِس حقیقت کو کب تسلیم کیا جاتا تھا؟ بلکہ یوں تھا کہ جیسے اسلام سے قبل دنیا میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اگر اسلام سے پہلے تمام تجربات کو صفر شمار کر لیا جائے تب مسلمانوں کے اپنے اصول و ضوابط اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ اگرچہ ہم میں سے اکثر یہ مانتے ہیں اسلام تاریخوں کے باہم ملاپ کی پیداوار ہے ، مکمل خالص ضابطہ حیات کی بجائے ، اگر ہم واقعی ہی سمجھتے ہیں کہ روحانی طور پر ہم دوغلے ہیں، کیا ہم میں سے اکثر 'دوسروں' کو بھی تسلیم کرنا چاہیں گے؟ میں اِس بات پر بھی حیران ہونا شروع ہوئی تھی کہ ہم باہر کے اثرات کو تسلیم کرنے میں کیوں متامل ہیں سوائے یہ کہ مغرب کو نو آبادیت کے زخموں پرموردِ الزام ٹھہراتے رہتے ہیں۔ جو اپنی جگہ پر ایک اہم سوال کو جنم دیتا ہے ، کیا اسلام دنیا کے باقی مذاہب کی نسبت زیادہ تنگ نظر نہیں؟

یہاں پر تھوڑ پھوڑ کر دینے والے موضوعات کا ایک جہان ہے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں جب بھی لوگ بحث کے دوران اِس بات پر متفق ہوئے کہ اسلام میں برداشت نہ کرنے کا جھکاؤ ہے تو مجھے خبردار کیا گیا کہ مذہب کو

ثقافت کے ساتھ نہ اُلجھاؤ۔ ''عورتوں کی سنگساری کا تعلق قبائلی رسومات سے ہے اور اِس کا لینا دینا اسلام کے ساتھ نہیں''، ایک مسلمان عورت نے مجھے ایک عشائیے میں یہ بات سمجھائی۔ میں مذہب سے برگشتہ بنی کھڑی رہی۔ اگر اسلام میں اتنی ہی لچک ہے تب اُسے اچھی رسموں کو اپنانا چاہئے، نہ کہ بُری رسومات کو، کیا یہ درست نہیں؟ لہذا میری مسجد کا طریقہ کار میرے شہر رچمنڈ کی جمہوری روایات جیسا کیوں نہیں؟ ایک ایسی جمہوریت جس نے مسلمانوں کو مسجد بنانے کی اجازت دی۔

میرے اندر صرف ایک ماڈرن مسلمان ہی نہیں تھا جو مجھے اِن مسائل سے زور آزما رکھتا بلکہ ٹیلی ویژن کی صحافی ، میزبان اور مبصر کی حیثیت نے بھی مجھے عوام کے اسلام کے بارے عمومی سوالات نے ' فرنٹ لائن' پر لا کھڑا کیا تھا۔اپنے گھروں کے کمروں میں رکھے ٹیلی ویژن پر میرا چہرہ دیکھنے والے عوام الناس کو دکانوں، ریسٹورانوں اور 'سب وے ' کی گاڑیوں میں مجھ تک اپنی آواز پہنچانے کی کوئی جھجھک نہ ہوتی کہ '' اگر تم داڑھیوں کے خاتمے اور چادروں کی مخالفت کی

بات کرنے والی مسلمان ہو تو خدا تمہارا حامی و ناصر ہو، لیکن جہاں تک تم اسلام کے ساتھ منسلک رہو گی تو اسلام کے جھنڈے تلے پائی جانے والی کٹر مذہبیت کا کیا جواز پیش کرو گی؟"خاص طور پر یہ لوگ پوچھتے ،

"کیا ایک ہی وقت میں تم مسلمان اور حقوقِ نسواں کی حامی کیسے ہو سکتی ہو؟"

"نیز ایک کٹر مسلمان کوکیا شے خود کش بمبار بناتی ہے ؟"

"اور یہ کیسے ہے کہ میں نے آج تک کسی پادری ، ربی یا مولوی کے بارے کوئی لطیفہ نہیں سنا ؟"

جب سے مجھ پر یہ آخری ذہنی حملہ ہوا ، میں نے بہت سنجیدگی سے اِس بات کی کھوج لگائی اور میرا خیال ہے کہ میں کچھ معاملے کی تہہ تک پہنچی ہوں۔ یہاں پر مجھے ایک فوری انحراف کرنے دیجئے۔

اسلام کی "ضرورت سے زیادہ ہنسنے " کے خلاف معروف تعلیمات ہیں۔ مذاق نہیں، ایک کتابچہ بعنوان "مسائل اور اُن کا حل"کے مصنف شیخ محمد صالح المناجید اِن تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہیں، "اگرچہ مسلمان سے تند مزاج ہونے کی توقع نہیں ہے لیکن ہنسی

کی فراوت اِس بات کو ثابت کرتی ہے کہ ہم مسلمان ظرافت اور ٹھٹھے سے گمراہ ہو جاتے ہیں جس سے ہمارے کردار اور طہارت میں کمی واقع ہو جاتی ہے ۔‘‘
مجھے اپنے ایک عزیز ’انکل‘ یاد ہیں جنھوں نے نئے سال کی رات کو مجھے متنبہ کیا کہ اتنا نہ ہنسو کہ تباہی یقینی طور پر آ پکڑے۔ اِن باتوں کی بناء پر ’انکل‘ اور شیخ (مصنف) دونوں میرے دل سے اُتر گئے۔ اگر ہنسی کا کالا جادو اتنا ہی مجرمانہ ہے تو خواب آور اور موسیقی زدہ عربی زبان ، جب اونچے سروں میں پڑھی جائے تو اُتنی ہی دھمکا دینے والی ہونی چاہئے۔
اِس بات کے قطع نظر کہ میں نے اسلام کے اِس احمقانہ طرزِ عمل کا سرسری سا جائزہ لیاتھاکیونکہ کسی نے پادری، ربی اور مولوی کے لطائف کے بارے کانٹے دار بات کہی تھی لیکن میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے لوگوں کا جستجو کرنا پسند ہے۔ سالہا سال سے اِسی جستجو نے میری ذات کی پرورش کی ہے۔ مجھے جوں جوں(اپنے کام کے حوالے سے) نمایاں ہونے کے مواقع مل رہے ہیں، لوگ اِس سماجی مسئلے یا بین الاقوامی رجحان کے بارے جاننے کے لئے اُتنے ہی متمنی نظر آ رہے ہیں،اور مجھے

اِن لوگوں کو اُتنا ہی زیادہ بتانا پڑ رہا ہے کہ کیوں میں اُس مذہب کے ساتھ منسلک رہنے کی مصیبت جھیلی جا رہی ہوں جو مذہب بین الاقوامی افراتفری اور انسانی آزاری کا موجب بنا ہوا ہے۔ لوگ بجا ہی پوچھتے ہیں، خاص طور پر دو سوال جنہوں نے میری دنیا کو بھی ہلا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ دونوں سوالات بہتری کیلئے ہیں لیکن درد سے خالی نہیں۔

پہلا سوال یہ ہے، ''تم ہم جنسیت پرستی کو اسلام کے ساتھ کس طرح موافق کہو گی؟''

میں واضح طور پر ہم جنس پرست عورت ہوں۔ میں نے ''باہر'' ہونے کا انتخاب اس لئے کیا کہ میری پرورش ایک ایسے تکلیف دہ گھریلو حالات میں ایک ایسے باپ کے زیرِ سایہ ہوئی جو خوشیوں کو قابلِ نفرت جانتا تھا، میں اَب اپنی متفقہ محبت کو تباہ نہیں کرناچاہتی جس نے مجھے جوانی میں فرحت عطا کی۔ میں اپنی پہلی ''گرل فرینڈ'' سے تب ملی جب بیس اور کچھ برس کی تھی اور چند ہفتوں بعد میں نے اپنی ماں کو اپنے تعلق کے بارے بتایا۔ اُس نے جواب میں ویسا ہی عظیم تاثر چھوڑا جیسی کہ کوئی عظیم ماں ہوتی ہے۔ لہذا یہ سوال کہ آیا

کہ میں مسلمان اور ہم جنس پرست ایک ہی وقت میں ہو سکتی ہوں ، نے بمشکل مجھے کوئی تصفیہ طلب جواب دیا۔ وہ مذہب تھا۔ یہ میری خوشی تھی۔ میں جانتی تھی کہ مجھے کونسی شے زیادہ چاہئے تھی۔ میں نے اسلام کا بیچ بیچ میں مطالعہ جاری رکھا ، عورت کے ساتھ رہنے کا باریک بین ہنر بھی سیکھتی رہی (جس کے بارے ایک الگ کتاب بنتی ہے)، ٹیلی ویژن پر پروگرام پیش کرتی رہی، اور عمومی طور پر شمالی امریکہ کے بیس اور کچھ برس کے فرد کی ہمہ جہت زندگی بسر کرتی رہی۔ جب میرے ٹیلی ویژن کے پروگرام نے مجھے مزید عوامی اور مقبول بنا دیاتو میری اسلام اور ہم جنسیت کو موافق کرنے کی امیدوں کو پہلے سے بھی سرگرم بنا دیا۔

ناظرین مجھ سے اِن دو شناختوں کے بعید ازامکان جوڑ کے بارے وضاحت چاہتے تھے۔ میں اپنی ذہنی و جذباتی کیفیت کے سنجیدہ دور میں گم تھی، حتکہ اپنے پیار کی خاطربالآخر اسلام چھوڑ دینے کے امکان پر بھی دل کو مائل کر رہی تھی۔ ارے ، پیار پر کسی چیز کو قربان کر دینے سے عمدہ کیا بات ہو سکتی ہے؟ لیکن ہر دفعہ میں دین کی صف سے خروج کے دہانے پر پہنچی لیکن خود

کو روک لیتی تھی۔ کسی خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ
اپنے ساتھ غیر جانبداری کے خیال سے ۔۔ ایک سوال میں
فقط خیال آوری کیلئے ادب کے ساتھ پیش کرتی ہوں، اگر
ہر شے جاننے والا، تمام طاقت رکھنے والا خدا مجھے ہم
جنس نہ بناناچاہتا تب اُس نے میری جگہ پر کوئی اور
کیوں نہ پیدا کیا؟
۱۹۹۸ء کے بعد خود کو بیان کرنے کے ناموافق دعوے
تقریباً روز ہی وقوع پذیر ہونے لگے۔ اُس برس میں نے
''کیویر ٹیلی ویژن'' کی نظامت کا آغاز کیا تھا، یہ ہم
جنس مرد اور عورتوں کی طرزِ حیات کے حوالے سے ایک
بے مثال ٹی وی اور انٹر نیٹ کا سلسلہ تھا۔ یہ شو لوگوں
کے بارے تھا، عریانیت کے بارے نہیں تھااور اِس کے
باوجود مسلمانوں نے مسیحی بنیاد پرستوں کے ساتھ مل
کراسکرین پر میری موجودگی کے خلاف رِٹ دائر کی۔ یہ
سچ ہے میں اِس سے کم توقع بھی نہیں کرتی تھی۔ لیکن
کیا میں اتنی ہی بھولی تھی کہ میں کچھ مکالمہ کی امید
رکھتی تھی، خالص مذمت کی بجائے؟
یقین کیجئے، میں نے مکالمہ قسم کی شے کرنے کی
کوشش کی۔ متنوع مزاج ہونے کی وجہ سے ، بشمول

نقطہ ہائے نظر کے حوالے سے متنوع مزاج ہونے کے باعث میں نے کبھی اپنے مخالفین کو بے کار نہیں گردانا۔
حقیقت تو یہ ہے کہ میں انہیں باقاعدگی سے اپنے پروگرام میں پیش کرتی ہوں۔ مثال کے طور پر، ’’میں آپ کو یہ بتانے کیلئے لکھ رہی ہوں کہ واحد اور اصل خدا، بائبل کے خدا، نے دکھ کے ساتھ واضح کیا ہے کہ تمام اغلام باز (مراد ہم جنس پرست اور اُن جیسے منحرفین سے ہے) اپنے بگاڑ، جنسی بے راہ روی اور شیطانی ہوس پرستی کے سبب اپنی انسانیت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اِسی لئے وہ کریہہ مخلوق بن چکے ہیں اور انسان نہیں رہے اور اِن کو کتابِ مقدس اور عظیم پادری کے حکم کے مطابق سزائے موت دے دینا چاہئے۔
مسلمانوں کی اکثریت جنہوں نے ’’کیویر ٹیلی ویژن‘‘ کو فون کئے یا ای میل بھیجیں، نے مسیحیوں کے اِن خیالات سے اتفاق کیا(سوائے اُس حصہ کے جس میں واحد اور اصل خدا کی بات کی گئی تھی، جو صرف بائبل کا خدا تھا)۔ ابھی تک کسی فرد واحد مسلمان نے بھی میرے اُس جوابی دعوے کا جواب نہیں دیا۔ ۔ بحث میں بار بار کیا جانے والا میرا نوکیلا حملہ، پھر قرآن کیوں ایک مقام

پر تو ہم جنسیت کو رد کرتا ہے اور دوسرے مقام پر دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ بھی بنایا ہے شاندار بنایا ہے؟ ‘‘مجھ پر تنقید کرنے والے اِس حقیقت کی کیسے وضاحت کریں گے کہ وہ کتاب، جس پر وہ نہائت محتاط طور پرایمان لاتے ہیں، میں خدا نے قصداً دنیا کے تنوع کا اہتمام کیا ہے؟وہ سوال کہ ہم جنسیت اسلام کے خلاف ہے ، نے میرے عقیدے کی ٹھیک ٹھاک پڑتال کی۔ غوروفکر کے اِس سارے عمل سے گزرنے کے ساتھ میں نے یہ سیکھا کہ صحت مند تبادلہ خیالات ممکن ہے اگر ہم اس بات کا کم خیال کریں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور اِس بات کا زیادہ کہ خدا خود کس مقام پر ہے۔

اَب میں دوسرے سوال کی طرف آتی ہوں جس کا بتانے کاوعدہ میں نے آپ سے کیا تھا۔ مجھ سے یہ بات گیارہ ستمبر کے سانحہ سے کئی ماہ پہلے پوچھی گئی اور اِس سوال نے میرے عقیدے کو ہلا کر رکھ دیا۔

دسمبر ۲۰۰۰ء میں ایک دفتری لفافہ ’’کیویر ٹیلی ویژن‘‘ کے دفتر میری میز پر پہنچا ۔ یہ لفافہ میرے باس موسس زنیمر کی جانب سے تھا۔ کرسمس کی چھٹیوں سے پہلے میں اپنے پروگرام کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ اقساط

مکمل کرنے پر جُتی ہوئی تھی ، اور اَب ایک دم سے خود
کو خالی الذہن پا رہی تھی اور اپنے کام سے (تھوڑی دیر
کیلئے) بھاگ جانے کے بارے محسوس کر رہی تھی۔ سو
اِسی کیفیت میں میں نے یہ لفافہ کھولا اور ایک اخباری
تراشہ باہر نکالا۔ اِس اخباری تراشے میں ایجنسی
فرانس پریس کی ایک خبر تھی۔

لڑکی کو ایک سو اسی کوڑے مارنے کا حکم
ؔ۔۔ صیف (نائجیریا) ایک سترہ سالہ حاملہ ، جسے ایک
اسلامی عدالت نے شادی سے قبل مجامعت کرنے پر
ایک سو اسی کوڑے مارنے کی سزا سنائی ہے ۔
” لڑکی چند دنوں میں بچہ جننے والی ہے“، یہ بات
لڑکی کے گھر والوں نے گزشتہ روز بتائی۔
باریہ ابراہیم ماگازو نے عدالت کو ستمبر میں بتایا کہ
اُس کو تین آدمیوں کے ساتھ مجامعت کرنے پر مجبور
کیا گیا جو اُس کے باپ کے دوست ہیں۔ لڑکی نے
سات گواہ پیش کئے۔ لڑکی کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ
وہ آئندہ چند روز میں بچہ جننے والی ہے ۔ اور اُس کے
کم ازکم
چالیس روز بعد اُسے یہ سزا دی جائے گی۔

موسس نے مرتعش سرخ روشنائی کے ساتھ لفظ ’’اسلامی‘‘ کے گرد دہرا دائرہ کھینچا ہوا تھا،تعداد ۱۸۰ کے نیچے لکیر کھینچی تھی اور اپنے قلم کے ساتھ حاشیوں پر تلمودی انداز میں یہ فقرہ لکھا تھا۔

ارشاد

اِن دنوں مجھے یہ بتاؤ کہ

تم اِس پاگل پن، عورت کے اعضائے رئیسہ کو کاٹنے کو

اپنے مذہب اسلام کے ساتھ

کس طرح مطابقت کرو گی

موسس

اوہو۔ کیا یہ واقعہ میری تسلی کرانے کے واسطے ’’کیویر ٹیلی ویژن‘‘ کے ناظرین کیلئے کافی نہ تھا کہ مجھ سے پوچھ سکیں کہ مجھے اپنے جنسی رجحان اور مذہبی رجحان میں سے کس کا انتخاب کرنا ہے؟

کیا میرے باس کا اخلاقی طور پر میرے اوپر بوجھ لادنا ٹھیک تھا؟ خاص طور پر جب میں ذہنی طور پر اپنے کام کے آخری مراحل میں تھی؟

میں نے لفافے کو ایک طرف کیااور اِس آدمی سے نپٹنے کا سوچا۔ لیکن اگلے چند گھنٹوں میں موسس کے چیلنج

نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ آپ بتائیے کہ یہ بات آپ کے ضمیر کو نہیں جھنجھوڑتی؟ زنا کی شکار اس جواں سالہ لڑکی کی کہانی ہر مناسب شخص کو متاثر کرتی ہے ، کیونکہ اِس کیس کی تفصیلات کچھ بھی ہوں، اِس خبر سے عقلیت پسندی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ عورت، جس کی عزت کو پہلے ہی لوٹ لیا گیا ، اَب وہ سات گواہوں کی بیان کردہ تفصیلات کے عذاب سے بھی گزرے۔ سات (دیکھنے والے)، اور وہ ابھی بھی ایک سو اسی کوڑوں کی مستحق ہے۔ یہ لعنتی بات کیسے ممکن ہے کہ میں ایک بنیادی بے انصافی کی اپنے مذہب اسلام کے ساتھ مطابقت کروں؟

میں تو اِس مسئلے کو نپٹنے کیلئے منہ کے بل سامنے آ رہی تھی، حالتِ دفاع میں نہیں، نہ زبانی کلامی بلکہ مکمل دیانتداری کے ساتھ۔۔

سانحہ گیارہ ستمبر کی بناء پر دنیا نے تو لنگر اٹھا لئے تھے ، میں نے اس واقعہ کے ایک برس سے بھی کچھ قبل ایک 'دھتکاری مسلمان' کے طور پر اپنی زندگی کے ایک نئے باب میں داخل ہونے کیلئے خود کو تیار کر لیا تھا۔

حوالہ جات:

۱۔’’ آج اسلام سے متعلقہ بچوں کی کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے بشمول یوسف اسلام (سابق کیٹ سٹیونز) کی کتاب ’’اے فور اللہ‘‘ کے۔۔‘‘ نوٹ: ایک سو ایک بائیبل کہانیوں کی طرز پر اَب کمال سید کی تحریر کردہ بہترین قرآن کہانیاں بھی دستیاب ہیں۔

www.fadakbooks.com پر جائیے اور ’بچوں کی کتابیں‘ کے بٹن کو کلک کیجئے۔

۲۔ ’’اِن زبانوں نے عیبردین سنٹر کے اندر کسی غلاف کی طرح گھیراؤ کیا ہوا تھا، یہ سنٹر کچھ سالوں بعد تعمیر ہوا ، ایشیائی نمائندگی کے ضمن میں اِس سنٹر کا شمالی امریکہ کی بڑی عمارتوں میں شمار ہونے لگا۔‘‘ حوالہ: اخبار گلوب اینڈ میل، ستمبر ۱۰، ۲۰۰۲ء کی اشاعت، مصنف البرٹ وارسن، ’ایک نئے مال کے اندر مشرق مغرب گلے ملتے ہیں‘ بی سی میں ایشین سنٹر جس کو وسیع صارفین کی توجہ حاصل کرنے کیلئے ازسرِ نوتعمیر کیا گیا۔

۳۔ ’’اِس رجحان کے ساتھ میں نے گوشہ نشینی میں نماز پڑھنا شروع کر دی(’’اکیلے سر جھکا کر‘‘جیسا کہ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر سماجیات رابرٹ پُٹمین کا

کہنا ہے)۔‘‘ نوٹ: یہ اشارہ کتاب ' Bowling Alone' (نیویارک سے Simon & Schuster کی سال 2000ء کی اشاعت کردہ ہے) کی طرف ہے۔ رابرٹ پُٹمین نے امریکہ میں بھائی چارے کی کم ہوتی صورتحال کے حوالے سے یہ کتاب لکھی ہے۔

۴۔ ’’وہ امریکی عرب دانشور ہے جس نے ۱۹۷۹ء میں ’’اورینٹلزم‘‘ (مشرقی تہذیب کا مطالعہ)کی اصطلاح مسلمانوں کو مغرب کی طرف سے نوآبادتی نظام میں جکڑنے کے فرض شدہ رویے کے پیشِ نظر برتی اورجس کے مطابق مغرب کی جانب سے مسلمانوں کو مشرق کی انوکھی مخلوق بتایا گیا ہے۔‘‘ نوٹ: ایڈورڈ سعید کی کتاب ’اورینٹلزم‘ دیکھئے (نیویارک، Vintage Books, (1979

۵۔’’ ہم میں سے کتنے یہ بات کس حد تک جانتے ہیں کہ اسلام ’’یہودیوں کا عطا کردہ‘‘ تحفہ ہے؟‘‘نوٹ: یہ شاندار پیرا تھامس کاحل کی کتاب سے ہے، The Gifts of the Jews: How a Tribe of Desert Nomads Changed the Way Everyone Thinks and Feels ((New York: Nan Talese/Anchor books, 1998

۶۔ ’’جب تک میں نے خود علم حاصل نہ کر لیا تب تک مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ مسلمان اُسی خدا کی عبادت کرتے ہیں جس کی عبادت یہودی اور مسیحی بھی کرتے ہیں۔ قرآن بھی اِس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔‘‘
حوالہ : قرآن، ۲۹: ۴۶ اور ۲:۱۳۶ بھی دیکھئے۔
۷۔ ’’ لہذا آپ دیکھئے ، مسلمانوں نے ایک خدا کو ایجاد نہیں کیا، انھوں نے اُس کو اللہ کا نیا نام دیا۔ اللہ ’’دی گوڈ‘‘ کا عربی نام ہے، یہودیوں اور مسیحیوں کا گوڈ۔۔‘‘
حوالہ: کیرن آرمسٹرونگ، خدا کی تاریخ: یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی چار ہزار سالہ جستجو۔ (نیویارک ۔ A.A. Knopf، 1994)، صفحہ ۱۴۱ ، قرآن بھی دیکھئے ، ۲۹: ۶۱۔۶۳
۸ ۔’’ اسلام کی ’’ضرورت سے زیادہ ہنسنے ‘‘ کے خلاف معروف تعلیمات ہیں۔ مذاق نہیں، ایک کتابچہ بعنوان ’’مسائل اور اُن کا حل‘‘کے مصنف شیخ محمد صالح المناجید اِن تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔‘‘ نوٹ اور حوالہ، کتاب کا اصل نام ’شکوہ وہولول‘ ہے، اِسے www.islam-qa.comسے ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔
اِس ویب سائٹ کے مطابق شیخ محمد صالح المناجید

ایک' معروف اسلامی لیکچرر اور مصنف 'ہیں، جن کا''
مقصدِ حیات اسلام کے بارے کسی کے سوال کا بھی
ذہین اور کامل جواب دینا ہے۔۔ اور لوگوں کے عمومی اور
ذاتی سماجی مسائل کا حل پیش کرنے میں مدد کرنا
ہے۔''
۹۔ '' اگر ہنسی کا کالا جادو اتنا ہی مجرمانہ ہے تو
خواب آور اور موسیقی زدہ عربی زبان ، جب اونچے
سروں میں پڑھی جائے تو اُتنی ہی دھمکا دینے والی ہونی
چاہئے۔'' نوٹ: ذہن میں رکھئے کہ قرآن میں قراًت سے
مراد اونچی آواز میں پڑھنا ہے۔
۱۰ ۔ ''پھر قرآن کیوں ایک مقام پر تو ہم جنسیت کو رد
کرتا ہے اور دوسرے مقام پر دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ نے جو
کچھ بھی بنایا ہے شاندار بنایا ہے؟ '' حوالہ: قرآن ۳۲:
۶۔۷۔ آیت یوں ہے ، ''وہی تو ہے جو ہر شے کو جانتا ہے
جو مخلوق کی فہم سے باہر ہواور ہر اُس شے کو بھی جو
ہر پیدا ہونے والی شے کے حواسوں اور ذہنوں میں ہے ،
وہی تو ہے تمام جہانوں کا مالک جس نے جو کچھ بنایا ،
شاندار بنایا۔'' پھر قرآن میں ۳۸:۲۶ میں دیکھئے ، ''ہم
نے صرف آسمانوں اور زمین کو ہی نہیں پیدا کیا بلکہ اِن

دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ، وہ سب کچھ بھی۔"
۳:۱۹۱ اور ۳:۴۸ کے مقام پر بھی ایسی ہی آیات ہیں، جن میں سے آخری آیت میں کہا گیا ہے ، "خدا جسے بنانا چاہتا ہے بناتا ہے"۔

۱۱ ۔ "مجھ پر تنقید کرنے والے اِس حقیقت کی کیسے وضاحت کریں گے کہ وہ کتاب، جس پر وہ نہائت محتاط طور پرایمان لاتے ہیں، میں خدا نے قصداً دنیا کے تنوع کا اہتمام کیا ہے؟" نوٹ: میری ایک سخت گیر ناقد واحدہ والیانتی ہیں جو کینیڈین اسلامک کانگریس کی نائب صدر ہیں۔ جب اُن سے میرے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے میرے اسلامی معیارات کو یکسر رد کر دیا کیونکہ اُن کے بقول ہم جنس پرست مسلمان قسم کی کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ اِس کے باوجود ایک ٹیلی ویژن چینل پر انہوں نے اقرار کیاکہ ہم کیا ہیں، ہم جو کچھ بھی ہیں، سب خدا کے مظہر ہیں۔ "اور خدا کی تخلیق کو مکمل طور پر سمجھنا ایک راز ہے" (کرسچئین ٹیلی ویژن اسٹیشن ، نومبر ۲۳، ۲۰۰۲ کا پروگرام "فیتھ جرنل") ۔ یہ اعتراف کرنے کے بعد کیسے وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہیں کہ میں راندہ درگاہ ہوں؟ واحدہ،

خدا کے سربستہ ’’راز‘‘ کا معاملہ کہاں گیا؟
۱۲۔’’ شادی سے قبل مجامعت کرنے پر ایک سو اسی کوڑے مارنے کی سزا ‘‘، حوالہ: اخبار گلوب اینڈ میل، دسمبر ۷، ۲۰۰۰ء

ستر باکرہ حوریں

جب سے میرا مدرسہ کے ساتھ تعلق بنا تھاتب سے میں ایک اہم ترین سوال سے گتھم گتھا تھی، کیا مجھے اسلام کو خدا حافظ کہہ دینا چاہئے؟ اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے مجھے ایک اور سوال درپیش ہوتا کہ کیا اسلام کوئی مسئلہ لاینحل ہے یا پھر اسلام میں کوئی خاص چیز ہے جو اِس کواپنے جیسے معاصر مذاہب مسیحیت اور یہودیت سے زیادہ سخت گیر بناتی ہے۔ میرے باس کے چیلنج نے میرے سر کو دلدل تک دھکیلا ہوا تھا۔

جس بات نے مجھے پریشان حال کیا ہوا تھا وہ فقط نائجیریا میں زنا بالجبر کا شکار ہونے والی ایک لڑکی کی کہانی نہ تھی۔ آپ کسی بھی اسلامی ملک کو اٹھا کر دیکھ لیجئے ، انسانی تضحیک کے جبر آپ کے دل و دماغ کو پکڑ لیں گے۔ پاکستان میں اوسطاً دو لڑکیاں روزانہ کے حساب سے غیرت کا قتل کے نام پر مرتی ہیں، مرنے والیوں کے قاتلوں کی اکثریت کے لبوں پر خدا کے نام کا ورد جاری ہوتا ہے۔ مالی اور موریطانیہ میں چھوٹی عمر

کے لڑکوں کو جنس زدگی پر مجبور کر کے اُن کے مکروہ مسلمان آقا اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ سوڈان میں انسانی غلامی اسلامی فوج کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ یمن اور اُردن میں انسانی فلاح کا کام کرنے والے مسیحی کارکنوں کو سرعام گولیاں ماری گئی ہیں۔ بنگلہ دیش میں جن مصنفین نے اقلیتوں کے حقوق کی وکالت کی انہیں یا تو جیلوں میں بند کر دیا گیا یا پھر سرے سے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ دستاویزی طور پر محفوظ ہے۔

ارے ہاں، میں مذہب کو ثقافت کے ساتھ پھر اُلجھا رہی ہوں، لیکن کیا واقعی؟ حتکہ ٹورونٹو، جس کی ثقافت بنگلہ دیش سے کہیں مختلف ہے وہاں ظالم و ناشائستہ اسلام ناچتا پھل پھول رہا ہے۔ اَب آپ میرے ساتھ رہئے گا، میں آپ کو بتاؤنگی کہ میں کیسے یہ سب کچھ جانتی ہوں؟

موسس سے خط ملنے کے تھوڑے دنوں بعد میں نے ''کیوریر ٹیلی ویژن'' کا ایک پروگرام مسلمان ہم جنس پرستوں کے مسائل عیاں کرنے کیلئے بنایا۔ اِس پروگرام کی داستانوں میں ایک داستان پاکستان کے ایک ہم جنس مرد کی تھی جو لندن میں رہ رہا تھا اور دوسری داستان

ایک ایرانی ہم جنس لڑکی کی تھی جو اپنے آبائی وطن ایران سے بھاگ کر وینکوورآگئی تھی۔
مریم، ہم جنس پرست لڑکی کو اپنے وطن میں مذہبی پولیس نے روئے زمین کی بدکار ہستی قرار دیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے پروگرام میں ایران سے آ مدہ ایک وڈیو یہ حقیقت ثابت کرنے کیلئے نشر کی کہ اگر یہ لڑکی وہاں رہ رہی ہوتی اور گرفتار ہو جاتی تو اِس کے ساتھ کیا ہوتا۔ یہ ٹیپ دو ہم جنس عورتوں کو ایک ساتھ زندہ باندھے ہوئے دکھا رہی تھی، جن کو ایک سفید چادر پر لٹائے تازہ کھودے ہوئے گڑھے میں ڈالا جا رہا تھا۔ آدمیوں اور لڑکوں کا ایک ہجوم اُن کے گرد کھڑا تھااور مٹھی کی سائز کے پتھر اُن کے سروں پر مارنے کیلئے تیار تھا۔اکثر پتھر نشانے پر لگتے اور جہاں پر لگتے وہاں سے گہرے سرخ رنگ کے فوارے پھوٹتے۔ مریم نے بتایا کہ وہاں کے قانون کے مطابق پتھر مارنے والوں کو اپنی بغلوں میں قرآن ساتھ اڑسنا ہوتا ہے تاکہ پتھر مارنے کی قوت کم نہ ہو۔ یہ فرمان ہر وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ اپنی زندگی کے بارے ابھی بھی خوفزدہ مریم نے اپنی کہانی پردہ سکرین کے پیچھے رہ کر سنائی۔

عدنان ، ہم جنس پرست مسلمان شخص، کیمرے کے سامنے آنے کو تیار ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن ہم جنس پرستی کے خلاف ہے ، لیکن اُس نے اَب اِس قرآنی فرمان کو تسلیم کر لیا ہے ۔ وہ اپنے ساتھی لڑکے کو مسلمانوں سے ملانے ٹی وی پر نہ لایا ، اُس کا ساتھی لڑکا اُس کی ماں سے پاکستان میں ملا تھا۔عدنان کا خیال ہے کہ مذہب کی قطعیت اپنی جگہ پر درست ہے لیکن اِس کا اطلاق روشن خیال لندن میں کسی صورت بھی ممکن نہیں، جہاں پر وہ اور اُس کا ساتھی لڑکا رہتے ہیں۔ یہ پروگرام لندن اسلامک کلچرل سنٹر کے ترجمان کے اِس تبصرے پر ختم ہوا کہ جب ہم جنس پرستوں کے بارے فیصلہ دینا ہو تو ہمیں احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ اُس نے کہا کہ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ اسلام میں ہم جنس پرستی کی گنجائش نہیں لیکن خدائے ذوالجلال کے دربار میں کچھ بھی ممکن ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اِس شو کے نشر ہونے کے بعد کیا ہوا؟ وہ تمام شکایات جو میں نے ٹورونٹو ایریا کے مسلمانوں سے سنی ، میں سب سے زیادہ مشترک شکایت یہ تھی کہ یہ ہم جن پرست ''سور'' اور ''کتے'' جنہیں تم نے

اپنے پروگرام میں پیش کیا، پروگرام بناتے وقت تمہیں ضرور یہودیوں نے باندھ کر رکھا ہو گا۔ کسی نے ایرانیوں کی سنگساری والی اُس نہائت قبیح ٹیپ کا تذکرہ کرنا گوارا نہیں کیا اور نہ عدنان کی اُس بات کا ذکر کیا جس میں وہ اپنی ہم جنس پرستی کو مذہب کی طرف سے دھتکارے جانے کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے اور نہ اسلامی سنٹر کے ترجمان کی بات پر توجہ دی جب وہ ہر کسی کا فعل خداکے حضور حاضر ہونے کی بات کرتا ہے۔ اِن میں سے کوئی بات بھی اُن برافروختہ مسلمانوں نے غور طلب محسوس نہیں کی تھی جنہوں نے مجھے فون کئے یا خط لکھے۔ اِن سب نے ایک ہی بات پر توجہ مرکوز رکھی کہ ہم جنس پرست مرد اور عورتیں"ہم" میں سے کسی صورت نہیں ہو سکتے۔ "اُن" کیلئے ہم جنس پرست قانونی طور پر کالا دھبہ تھے۔ یہ صورتحال عالمی شہرت رکھنے والے بڑے شہر ٹورونٹو کے سایہ عاطفت میں سامنے آئی ہے۔

میں جیسے جی متلا دینے والی کیفیت میں مبتلا تھی۔ مسلمان جس طرح کی ثقافت میں رہ رہے ہوں ، چاہے وہ پسماندہ ہو یا ڈیجیٹل اور جس طرح کی نسل سے اِن کا

تعلق ہو، چاہے وہ تارکینِ وطن کیلئے ستر کی دہائی کی مسجد کے علمبردار ہوں یا پھر نئے ہزاریئے کے میڈیا سے جڑے ہوئے شہروں میں رہنے والے ہوں، اسلام شدید طور پر قبائلی مذہب کے طور پر ہی سامنے آیا ہے۔ کیا ہمیں کبھی اسلام کی تشکیل نو کی ضرورت محسوس ہوئی ہے؟

لیکن ''تشکیلِ نو'' سے ہماری کیا مراد ہے؟ سچ یہ ہے کہ میرے پاس تو اِس کا ایک خاکہ ہی تھا۔ میں جو جانتی ہوں کہ تاریخ میں مذاہب کے متقلدین ذہنی طور پر اُس طرح مویشیوں کے گلے کے طور پر کبھی بھی نہیں رہے جس طرح مسلمان رہے ہیں۔ مسیحی رہنما اپنے مرتبوں کے مطابق دانشورانہ ہمہ جہتی سے آگاہ رہے ہیں۔ جبکہ (مسیحی علماء میں) کوئی بھی دیگر مختلف النوع آراء کو رد کر سکتا ہے اور بہت سارے کرتے بھی ہیں لیکن کوئی مختلف النوع آراء کی کثرت کے وجود سے انکار نہیں کرتا۔ اور جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے ، وہ اِس سارے ہجوم میں بہت آگے ہیں۔ یہودی تو دراصل اپنے مذہبی عقائد کے گردا گرد اختلافات کو تجزیوں اور مباحث کی تشکیل سے اپنی عبادت گاہ تلمود کے اندر

لوگوں میں متعارف کراتے ہیں۔ اِس کے برعکس، مسلمانوں کی اکثریت قرآن کو ایک ایسی دستاویز کے طور پر مانتی ہے جس کی صرف پیروی کرنا مقصود ہے ، تفہیم کرنا نہیں، جس سے ہم اپنی سوچنے کی صلاحیتوں کا خود ہی گلہ گھونٹ دیتے ہیں۔
حتکہ مغرب میں بھی مسلمانوں کو حسبِ معمول یہی پڑھایا جاتا ہے کہ قرآن ہی خدا کی منشا کا آخری منشور ہے جس نے بائبل اور تورات کی جگہ لے لی ہے۔ بطور آخری منشور، اب یہی '' مکمل'' مذہب ہے ۔ ۔ جس پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا اور نہ اِس کی تفہیم ممکن ہے ، بس اِس پر ایمان لانا ہے۔ یقیناً پیغمبر محمد نے جبرئیل فرشتہ سے جو پہلا لفظ سنا اور خدا کی جانب سے اُسے بولنے کا حکم ملا وہ تھا ، 'اقرا '۔۔ دیگر تمام تراجم میں اس کا مطلب ''پڑھ'' ہے۔ کوئی بھی طریقہ ہو، لفظوں کو اس طرح دہرانا کہ جیسے اُن کی جگالی کی جا رہی ہو ، ہماری اکثریت ہمیشہ سے کرتی آرہی ہے ۔ اچھا ، اسی طرح کی جگالی کرنا ہی تفہیم کہلاتی ہو گی۔
اسلامی مبادیات کے دوسرے منبعہ حدیث کے ساتھ بھی

ہمارا یہی رویہ ہے۔ یہ احادیث پیغمبر محمد نے جو کچھ کہا اور ساری زندگی جس پر عمل کیا، اُس کی ’’اصل‘‘ عکاس ہیں۔ جن سوالات کے جوابات فوراً قرآن نہیں دیتا۔۔ یہاں لفظ ’’فوراً‘‘ پر غور کیجئیے۔۔ اُن کے جوابات حدیث سے ملنا طے کر لیا گیا ہے۔ صدیوں کے عرصہ میں یہ احادیث جمع ہوئیں اور معتبر ترین علماء نے اِن احادیث کو ہماری ضرورت کے پیشِ نظر مرتب کیا۔ اَب ہمیں کیا کرنا ہے، اِن احادیث کے آگے خود کو جھکا دینا ہے (یا یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ اُن احادیث کے سامنے جنہیں ہمارے اماموں نے ہمارے لئے منتخب کیا ہے)۔ اوہ، اِس چھوٹے سے مسئلہ کے بارے میں کہ پیغمبر محمد ایک ذی عزت انسان تھے اور کسی بھی چیز کے بارے فیصلہ کرنے کے متعلق فطری غلطی کر جانے کا احتمال بھی رکھتے تھے؟ جیسا کہ احادیث خدا کے آخری نبی کی زندگی کو انسانیت پر آشکار کرتی ہیں، اِس لئے اِن احادیث کے بارے شک و شبہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں ہماری پاکبازی کی ایکسپریس ٹرین کہاں لئے جا رہی ہے؟ ایک ایسی منزل جسے ذہن کی موت کہتے ہیں۔

جب زیادتی اسلام کی امان گاہ کے اندر سے جنم لے تو مسلمانوں کی ایک اقلیت جانتی ہے کہ کس طرح دلیل دینی ہے ، ازسرِ نو جائزہ لینا ہے یا تجدیدِ نو کرنا ہے۔ یہ سب کچھ ویسا ہی اچھا ہے ، جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ زیادتی تب تک نہیں ہو سکتی جب تک ہم اسلام کے اصل متن کے ساتھ سچے ہیں۔ ارے ، کیا فرار کی منطق ہے !ذہنِ رسا کی یہ گول مول تربیت روشن چراغوں کو کند ذہن بنانے کیلئے کافی ہے اور بہت ضرررساں بھی ہے۔ بلاشبہ ہر مذہب کے ساتھ چپکنے والے ہوتے ہیں جو اپنے مذہب کی نقالی کرتے رہتے ہیں۔ صرف عصری اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ وہ اپنی مرکزی تعلیمات کا نقال رہنا چاہتا ہے۔ بروس فیلر ایک امریکی مصنف ہے ، انہوں نے اپنی کتاب 'ابراہیم: تین مذاہب کے دلوں تک کا سفر' پر کام کرتے ہوئے اِس امتیاز کابغور مطالعہ کیا۔ یروشلم میں فیلر الاقصیٰ مسجد کے امام شیخ ابو سنینا سے ملے۔ امام نے اسلام کی طے شدہ کاملیت پر زور دیا۔ امام نے لندن کی تیز دھار انگریزی بولتے ہوئے فیلر سے کہا کہ ''آپ کو ہر صورت آخری نبی کو ماننا ہو گا'' جسے خدا نے بھیجا ہے۔ بصورتِ دیگر خدا کی دھونک سے '' آپ

لوگ مارے جاؤ گے“ جس طرح ہٹلر نے خدا کی منظوری سے لاکھوں یہودیوں کو ”زندہ بھون“ دیا تھا۔ فیلر نے انٹرویو کو بیزاری کے ساتھ چھوڑ دیااور بعد میں اِس واقعہ کا تذکرہ مذہبی امور کے ماہر صحافی کے ساتھ کیا۔ ”بدقسمت سچ “ یہ ہے ، صحافی نے کہا ” کہ شیخ سنینا اِس وقت اسلام کے مرکزی دھارے کی نمائندگی کرتے ہیں، آپ کو ایسے یہودی بھی ملیں گے جن کا یہود قومیت کے بارے ایسا ہی پیغام ہو گا لیکن بہت زیادہ تعداد میں نہیں، آپ کومسیحیت کے ایسے طرفداد ملیں گے لیکن ہنوز کم تعداد میں مگر یہ امام مسلمانوں کی اکثریت کی ترجمانی کرتا ہے ، کم ازکم وہاں بسنے والے مسلمانوں کی ۔۔“ سنینا نے بہت سے مسلمانوں کے اذہان کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے ، صرف یروشلم میں ہی نہیں بلکہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے مسلمان گروہوں کو بھی۔ مجھے میرے قصبے رچمنڈ کی ’اکیڈمی فار لرنگ اسلام‘ کی رپورٹ ۲۰۰۲ء کا حوالہ دینے کی اجازت دیجئے۔ اکادمی دعویٰ کرتی ہے کہ اسلام کے دو بڑے فرقوں، شیعہ اور سنی میں مشترکہ باتیں زیادہ ہیں۔ ایسا کیسے ہے؟ ”دونوں مطلق راستی اور قرآن کی

کاملیت کی بات کرتے ہیں۔ دونوں محمد کو آخری نبی مانتے ہیں اور محمد کی تعلیمات اور عمل پر پیروی کرانے کیلئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں‘‘۔ جب یہ تقلید تمام مسلمانوں تک پہنچتی ہے تو ہم میں سے اکثر اپنے تعصبات کو دریافت کرنے میں ناکام رہتے ہیں یا اس بات کو تسلیم کرنے میں کہ ہم میں کوئی تعصب ہے۔ ہم پختہ ایمان رکھتے ہیں اُن پر جن پر ایمان لانا فرض ہے، بس بات ختم ہو گئی۔

ہے۔ میں نے جب بھی کبھی بائبل سے ہم جنس پرستی کے خلاف خیالات پڑھ کر سنانے والے مسیحیوں کو نشر کیا تو پروگرام دیکھنے والے ناظر مسیحیوں کو یقین ہوتا تھا کہ اِن خیالات کا توڑ کسی قابلِ قبول تفہیم کے ساتھ اسی پروگرام میں آئے گا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا جب مسلمانوں نے مجھے چلا چلا کر نیچا دکھانا چاہا۔ بظاہر ایسا نہیں تھا کہ وہ ہم جنس پرستی کے خلاف اسلام کی بنیاد پر بولتے تھے، اس موقع پرسبھی مذاہب کی بنیاد پر بولتے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم جنس پرستی کے خلاف آخری مسلمان تک بولتا ہے۔الفاتحہ ایک ایسا (ہم جنس پرست) ’کیویر‘ مسلمان گروہ ہے جس کی

شاخیں شمالی امریکہ اور یورپ کے بڑے شہروں میں واقع ہیں۔ ٹورونٹو میں اِس کی عشائیہ تقریبات میں چند مسلمان والدین بھی شرکت کرتے ہیں۔

سو اگر بہت سارے مسلمان اسلام کے مرکزی دھارے کے تعصبات سے اتفاق نہیں بھی کرتے تو یہ مرکزی دھارے کے تعصبات کو چیلنج بھی نہیں کرتے۔ میں کسی کو کیسے بتاؤں کہ کیوں ایک مسلمان نے بھی 'کیویر ٹیلی ویشن' کو قرآن کی متبادل اور نرم تفہیم کی غرض سے فون نہیں کیا اور خط نہیں لکھا؟

اِس پس منظر میں موسس کے چیلنج کی مخالفت کیلئے نہ صرف تیار نہ تھی بلکہ اِس چیلنج کو آگے بھی بڑھانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اندازہ کرنے سے پہلے کہ اسلام ناقابلِ تبدیل سخت گیر مذہب ہے، مجھے ''دوسروں'' کے بارے اسلام کے دائرہ کار میں جاننے کی ضرورت تھی۔۔ عورتوں کے معاملہ میں، اور یہودیوں و نصرانیوں کے معاملہ میں بھی۔ اور غلاموں کے بارے میں بھی۔اور ہر اُس شخص کے بارے میں جس کی وابستگی مسلمان دنیا میں آج دکھائی دینے والے ظلم و جبرکے ساتھ بے مثال بندھن میں بندھی ہوئی ہو۔ قرآن اپنے خدا کی مخلوق کے

بارے یہاں کیا کہتا ہے ؟ کیا کوئی شنوائی صاف صاف لفظوں میں یا حتکہ باتوں سے ورغلانے والے انداز میں ہی (خدا کے ہاں) کوڑوں سے پٹی زنا بالجبر کی شکار عورت کیلئے ہے ، گواہان کے اُس مجمعے کی نسبت جس نے اُس کے ساتھ جرم ہوتے دیکھا؟ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ قرآن عورتوں کو واقعی ہی امامت سے روکتا ہے ؟

میں نے آئندہ چند ماہ تک قرآن کا ایک بار پھر مطالعہ کیا ، آنکھیں کھول کر اور مدافعت کو اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے کے مقابلے میں کم تر کر کے۔

شروع میں عورت کی بابت سوال درپیش تھا۔ خدا نے کس کو پہلے پیدا کیا۔۔ آدم یا حوا کو؟ قرآن اِس امتیاز پر مکمل طور پر خاموش ہے۔ خدا نے اکیلی روح میں زندگی پھونکی اور اُس کے بطن سے ساتھی پیدا کیا۔ کون روح ہے اور کون ساتھی؟ یہ بات غیر متعلقہ ہے۔

علاوہ ازیں، یہاں پر آدم کی پسلی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جہاں سے بائبل کے مطابق حوا پیدا ہوئی۔ قرآن یہ بھی نہیں کہتا کہ حوا نے آدم کو ممنوعہ پھل کھانے کی ترغیب دی۔ خلاصہ یہ ہے ، یہاں پر آپ مردانہ برتری کا

جواز نہیں ڈھونڈ سکتے۔ اصل میں صورتحال اِس کے سراسر مختلف ہے۔ قرآن مسلمانوں کو خبردار کرنے کیلئے یاددہانی کراتا ہے کہ تم لوگ خدا نہیں ہو، لہذا مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے اپنے حقوق طلب کرنے کے معاملے میں برابر کے شریک ہیں۔ اور یہ مقام تو عورتوں کیلئے بظاہر سب سے بڑھ کر رتبہ دینے والا ہے ، ’’اپنی ماؤں کی عزت کرو جن سے تم پیدا ہوئے ہو، خدا تمہیں ہمیشہ دیکھنے والا ہے ‘‘۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اُسی پارہ میں چند سطریں آگے قرآن مکمل متضاد بات کہتا ہے۔ قرآن کا کہنا ہے ،

’’مردوں کو عورتوں پر اختیار ہے کیونکہ خدا نے ایک کو دوسرے پر برتر کیا ہے اور کیونکہ وہ اپنی دولت کو اُن پر خرچ کرتے ہیں، نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں۔۔۔ اور وہ جن سے تم نافرمانی کا خطرہ پاؤ، اُن کو تنبیہہ دو، اُنہیں اپنے ساتھ نہ سلاؤ اور اُن کو مارو۔‘‘

مجھے اِس بات کی تشریح کرنے دیجئے ، مار پیٹ کی مستحق ہونے کیلئے کسی عورت کا مرد کی نافرمانی کرنا ضروری نہیں، مرد کو عورت کی نافرمانی کا خطرہ محسوس کرنا ہی کافی ہے۔ مرد کا احساسِ عدم تحفظ

عورت کیلئے مسئلہ ہے۔ آپے سے باہر نہ ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں بات کو ضرورت سے زیادہ ہی مبہم طور سے بیان کر رہی ہوں لیکن ابہام نہائت قبیح قوانین کے روزافزوں نشوونما کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ میں آپ کو ایک ٹھوس مثال دونگی۔ قرآن کی ایک سطر۔۔ کہ آدمی عورتوں پر حکم چلا سکتے ہیں کیونکہ ''وہ اپنی دولت اُن پر خرچ کرتے ہیں''، نے کائرو ڈیکلریشن کو بھی متاثر کیا۔ ۱۹۹۰ء میں مسلمان ممالک نے ایک بظاہر خوش کن انسانی حقوق کے عہد نامہ کو تشکیل دیا۔ یقیناً اِس عہد نامے کی ایک شق مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کی تائید کرتی ہے لیکن دوسری شق مردوں کو اپنے کنبے کا کفیل قرار دیتی ہے۔ یہ شق مردوں کو بطور کفیل امتیاز تو نہیں بخشتی لیکن بلاتامل اعلان کرتی ہے کہ ''شوہر کنبے کی کفالت اور بہبود کے ذمہ دار ہیں''۔ اور جیسا کہ قرآن کا کہنا ہے کہ مرد کفالت کے کردار کی وجہ سے عورتوں پراختیار رکھتے ہیں۔۔ اَب باقی سارے معاملے کو آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نائجیریا میں زنا کی شکار عورت کے حوالے سے، قرآن کا ایک اقتباس میرے سر کو گھما دیتا ہے، ''عورتیں تمہاری

کھیتیاں ہیں‘‘ اِس کا متن ہے۔ ’’تم اپنی کھیتیوں میں جاؤ جب تم مطمئن ہونا چاہو، اچھے کام کرو اور اپنے خدا سے ڈرو۔۔‘‘ ہا؟ عورت کے اندر گھس جاؤ جب تم چاہو، اور پھر بھی نیک رہو؟ کیا عورتیں ساتھی ہیں یا جائیداد؟ ساتھی، قرآن کے ایک معروف دانشور جمال بداوی نے زور دیا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ’جنسی طور پر روشن خیال بنانے والی‘ یہ آیت مساج کی حمایت کرتی ہے۔ عورتوں کو بھی کھیتیوں کی طرح تخم کو اصلی انسان بنانے کیلئے گداز کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ’’کسان کا بیج اُس وقت تک بے معنی ہوتا ہے جب تک زرخیز زمین موجود نہ ہو جو اِس بیج کو نمو دیتی ہے‘‘، بداوی نے اپنی روشن خیال توجیہہ کو نہائت مطمئن بخش پا کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن انہوں نے تو فقط اِن لفظوں کی توجیہہ پیش کی، ’’اپنی کھیتیو ں میں جاؤ‘‘، اِن لفظوں کی کیا تشریح ہے، ’’جب تم چاہو‘‘؟ کیا اِس کا یہ مطلب نہیں کہ مالک مردوں کو حد سے زیادہ اختیارات دے رہا ہے؟

سوال پھر یہ ہے کہ خدا کس مثالی نمونہ کی وکالت کرتا ہے۔۔ آدم اور حوا برابر ہیں یا عورت زمین جوتنے والی

کھیتی کی طرح ہے (میری ضرب کاری پر مجھے معاف کیجئے گا)۔
سچ یہ ہے کہ میں جانتی تھی کہ کونسی تشریح مجھے چاہئے لیکن میں اِس بات کے بارے یقین سے نہیں کہہ سکتی (اور ابھی بھی نہیں) کہ خدا کو کونسی تشریح مطلوب ہے۔ ایک ہی وقت میں بہت سارے تضادات کی موجودگی میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ جو عورت کو بودے جرم کی پاداش میں اُدھیڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں ، وہ بھی قرآن سے اِس کا ضروری جواز لے سکتے ہیں۔ لہذا وہ بھی قرآن سے جواز حاصل کر سکتے ہیں جو لڑکیوں کی امامت نہیں چاہتے۔ اور جو مساوات کی تلاش میں ہیں وہ بھی قرآن کی اعانت لے سکتے ہیں۔
اِس بات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہ میں اپنے مذہب اسلام کو زناکی شکار کو کوڑوں کی ظالمانہ سزا کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کرتی ہوں ، میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ میں اِن کولا پرواہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر سکتی ۔ میں اس طرح بے نیازی کے ساتھ نہیں کہہ سکتی جیسا کہ میں نے بہت ساری حقوقِ نسواں کی حامی مسلمان عورتوں کو کہتے سنا کہ قرآن بذاتِ

خود انصاف کی ضمانت دیتا ہے۔ میں بے توجہگی کے ساتھ اِس حقیقت کو نہیں پھلانگ سکتی کہ نائجیریا کے باکمال ججوں نے شرعی قانون کو نافذ کرتے ہوئے میرے شفاف ہمہ گیر مساوات کے حامل مذہب کے ساتھ اغلام بازی کی ہے اور یہ کہ قرآن عورتوں کے ساتھ شفاف مساوی سلوک نہیں کرتا اور یہ متنازعہ ہونے کی وجہ سے شفاف نہیں ہے۔ نوم چومسکی سے معذرت کے ساتھ، یہ مسلمان ہیں جو اللہ کے نام پر اپنی مرضی کو ایجاد کر لیتے ہیں اور قرآن کی بنیاد پر ہم جو فیصلے کرتے ہیں وہ خدا کے بنائے ہوئے نہیں ہیں، ہم نے وہ فیصلے اپنی آزاد رو مرضی سے بنائے ہیں۔

یہ سب کچھ مسیحیوں ااور یہودیوں پر آشکار ہے ، لیکن یہ اُس مسلمان پر آشکار نہیں جس کی بطور مقلد پرورش ہوئی ہے۔۔ ہم میں سے اکثریت کی پرورش ایسے ہی ہوئی ہے ۔۔ کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ ہمارے ’سیدھے راستے‘ کیلئے ہے اور یہ ہمارا فرض اور حق ہے کہ اِس کی تمثیل بنیں۔ یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔ کیا آپ مجھے سنتے ہیں؟ ایک بہت بڑا ، داڑھی والے چہرے جیسا جھوٹ۔کامل ہونا تو دور کی بات ہے ، قران تو دقیق طریقے

سے اپنے ساتھ ہی جنگ آرا ہے کہ مسلمان جو 'بمطابق کتاب حیات بسر کرتے ہیں' کے پاس کوئی گنجائش نہیں کہ وہ یا تو عمل کرنے والے بن جائیں یا کنی کترا جائیں۔ شاید اسی لئے یہ آسان بات ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنا تعصب کسی ایک آیت کو بنیاد بنا کر پیش کر سکتا ہے اور دوسری آیت کو نظر انداز کر سکتا ہے۔

اور آپس کی بات ہے کہ چاہے روشن خیال ہوں یا جہادیے ، دونوں ایک جیسا کام کرتے ہیں۔ دونوں قرآن کی منفی آوازوں کی اس طرح پچکاری مارتے ہیں کہ ہمارے مخالف نے مثبت باتوں کو کس طرح اخذ کیا ہے۔ ہم سب کا اپنا منشور ہے ، کسی کا زیادہ برابر ہے بہ نسبت دوسروں کے۔۔

مگر جب تک ہم یہ ثابت کرنے کے آخری کھیل میں گھرے ہوئے ہیں کہ ''میرے نظریہ عقائد کے ترپ کا پتہ'' 'اُن کے' نظریہ عقائد سے بہتر ہے ، ہم اُس بڑے چیلنج کو نظروں سے کھو رہے ہیں۔ یہ بڑا چیلنج قرآن کی کاملیت کاکھلا سوال ہے تاکہ (اس سوال کی) بھگدڑ کسی درست نتیجے کی طرف لے کر جائے اور جو یہ کہنا کہ قرآن کا 'اصل' یہ ہے ، کہنا کم ہو جائے اور وقت کے ساتھ

ساتھ قرآن لفظی تشریح کی بجائے لکھنے پڑھنے کی مشق بن جائے۔ اُس مرحلے پر، اسلام کی تشکیل نو ایک عام مسلمان کو یہ نہ بتائے کہ کیا نہیں سوچنا بلکہ اسلام کے ایک بلین سے زائد مقلدوں کو سوچنے کی اجازت دے۔ جیسا کہ قرآن مجموعہ تضادات ہے، کم ازکم جب یہ خواتین کے بارے کہتا ہے اور ہم خواتین کے پاس یہ سوچنے کا پورا حق ہے۔

اس خیال کو مزید آگے بڑھانے کی خاطرمجھے دیکھنا پڑا کہ آیا کہ قرآن کے دانستہ تضادات کا کوئی خاص سانچا ہے۔ آسانی کے ساتھ یوں لیجئے، کیا اسلام کی مذہبیات دیگر انسانی حقوق کے معاملات کے حوالے سے مبہم یا متضاد ہیں، جیسا کہ غلامی؟ اگر ایسا ہے ،تو کیا اکیسویں صدی کے مسلمانوں کے پاس اکیسویں صدی اپنانے کی گنجائش ہے؟ میں نے سوڈان کے بارے سوچا اور بعد میں سوڈان سے باہر اِس کی غلاموں کی تجارت کے بارے پڑھا۔ خرتوم میں، ’’طالبان طرز کی مسلمان ریاست صیہونیوں ،مظاہر پرستوں اور غیر عرب مسلمانوں پر خود ساختہ جہاد لاگو کر رہی ہے‘‘ ۔ یہ الفاظ چارلس جیکبس کے ہیں، جو ’امریکن اینٹی سلیوری

گروپ‘ کے صدر اور ’ سوڈان کمپین‘ کے ڈائریکٹر ہیں۔ جیکبس کا کہنا ہے کہ خرتوم کی یورش نے سیاہ فام غلاموں کی تجارت کی یاد تازہ کر دی ہے ، جس کو قریب ایک صدی قبل غلامی کے مخالف برطانویوں نے تقریباً ختم کروا دیا تھا۔ ۔۔ اُس کے بعد غلاموں کے گلے تک کاٹ دئیے جاتے ہیں، لڑکوں، عورتوں اور بچیوں کے ساتھ اجتماعی زنا ہوتا ہے اور مزاحمت کی صورت میں اُن کے گلے کاٹ دئیے جاتے ہیں۔ دہشت سے زندہ بچ جانے والے غلاموں کو شمال کی سمت بھیج دیا جاتا ہے جہاں اِن کو عرب آقاؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے ، عورتیں داشتائیں بن جاتی ہیں، بچیاں گھریلو ملازمائیں اور لڑکے چرواہے۔۔

مجھے ایک بار مزید شمالی نائجیریا کا خیال آیا ، ایک دوسری جگہ جہاں اسلامی گورنمنٹ عیسائیوں کو غلام بنانے کی ترغیب دیتی ہے ۔ اچھا ، میں مانتی ہوں کہ اِس بات کا تعلق مذہب سے زیادہ نائجیریا کی خانہ جنگی کی سیاست سے ہے ۔ لیکن یہ بھی ہے کہ روایتی طرز کی اس سیاست کو قرآن کی اعانت کے بغیر بھی لاگو نہیں کیا جاتا۔ کس حد تک اعانت؟ یہ میرا سوال تھا۔ میں

منبعہ (قرآن) تک گئی اور میں نے یہ اقتباس پایا،
''تمہارے وہ غلام جو آزاد ہوناچاہیں، اُن کو آزاد کر دو اگر تم اُنہیں اُن کا اہل پاؤ۔۔۔''
اوہو۔۔ میں نے اُس حصہ پر غور کیا اور رُک گئی۔ اِس کو قریب سے پڑھئے اور آپ کو اندازہ ہو گا کہ قرآن ہمیں تمام غلاموں کو آزاد کرنے کی ہدایت نہیں دیتا، صرف اُن کے بارے میں جن کے آقا یہ فیصلہ کریں کہ یہ بہتر طور پر قدم جمانے کے اہل ہیں۔ آپ کو یہ سب کچھ ہمارے معروضی احساسات کے مطابق کیسا لگ رہا ہے، ہمارے ضمیر کو کیسا لگ رہا ہے اور ہماری آزاد روی کو کیسا لگ رہا ہے؟ دوسرے لفظوں میںآج مسلمان قرآنی احکامات کے مطابق ساتویں صدی کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔۔ اگر وہ اس پر کاربند رہنا چاہیں۔ قرآن نائجیریا کے آئین سازوں کو حق دیتا ہے کہ وہ غلامی کے تازیانے کو ختم کر دیں۔ عورتوں کے بارے میں، غلاموں کے بارے میں، مسلمان جو فیصلے کرتے ہیں وہ اُن کے اپنے ہیں، اِن فیصلوں کو خدا پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔
کیا ایسا تو نہیں کہ اسلام مسلمانوں کی قرآن کے بارے اُن کے اپنے لئے اُن کی ذاتی تشریح کو قبول نہیں کرتا

لیکن یہی تلاش اور جڑاؤ ہی ’’اپنے اسلام کو جاننے ‘‘ کیلئے واحد طریقہ ہو؟

اِس ادراک سے جیسے مجھے توانائی مل گئی ہو، میں انسانی حقوق کی ایک اور فائل کی طرف متوجہ ہوئی، غیر مسلمانوں کے ساتھ سلوک کے بارے۔۔چونکہ اسلام یہودی و عیسائی روایت سے ماخذ ہے ، قرآن یہودیوں اور مسیحیوں کے بارے بہت کچھ کہتا ہے۔ وہ ابراہیم پر ڈھیروں درود بھیجتا ہے ، تینوں مذاہب کے دادا جان پر۔ یہ عیسیٰ کی بطور مسیحا ایک سے بار مدح خوانی کرتا ہے۔ عیسیٰ کی والدہ مریم کا کئی مقام پر مثبت الفاظ میں تذکرہ ہے۔ اپنی شروعات میں یہودیوں کو قرآن اعلیٰ مرتبہ قوم کے طور پر ہماری یاد دہانی کراتا ہے۔ ارفع و بلند تر؟ یہودی؟ میں نے اِس پر یقین کرنے کیلئے کئی انگریزی تراجم چھان مارے۔ اپنے مذہبی پرکھوں کو گرم ملائم خطابات سے نوازتے ہوئے قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کو تاثر دیتا ہے کہ مطمئن ہو جاؤ اور اُنہیں ’کوئی خوف یا افسوس‘ نہیں ہونا چاہئے جب تک وہ اپنے مذاہب کے ساتھ ایماندار رہیں۔

دوسری طرف قرآن صاف صاف اسلام کو واحد ’سچے

مذہب' کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ناقابلِ فہم بات ۔۔ کیا یہ ہے؟ یہاں پر ایک سب سے اہم خیال ہے ، جو وقت کی تقسیم سے بھی کہیں اہم ہے۔۔ اس سوال کا تعلق اس بات سے ہے کہ کیوں اسلام وجود میں آیا؟
مسلمان جس جس چیز پر ایمان لائے ہیں، ہزاروں برس قبل یہ سب کچھ یہودیوں پر عیاں تھا۔ یہ تب بھی تھا جب چند یہودیوں نے آشکار سچ سے انحراف کر لیا، بتوں کی پرستش شروع کر کے جیسے سونے کا بچھڑاجس سے انہوں نے اللہ کا قہر اپنے سر لے لیا۔ خالق کس قسم کا ہے جو ایک بھینس کے بچے سے حسد کرتا ہو؟ میں نے کہا ہے کہ خالق جومسلسل متحارب قبائل کو مشترکہ دین کے مرکزی نقطہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بھینس کی طرف واپس چلتے ہیں۔ بت پرستی کی نئی سرگرمی اس ضرورت کو جنم دیتی ہے کہ اولاد ابراہیم سے کسی کو صیہونی دنیا کو مالک کی سچائی بتانے کے واسطے بھیجا جائے۔ اِس طرح عیسیٰ کی آمد ہوتی ہے ، اور اسی طرح بائبل کی آمد بھی موسیٰ کی ہیبرو کتابوں کو اکٹھا کرتی ہے (عیسائیوں کیلئے پرانے عہد نامہ کے نام سے جانی جاتی ہے)۔ آخر کار اگرچہ

عیسائیوں کے مخصوص گروہ نے عیسیٰ کو واحد اور واحد خدا کا انسانی قاصد کہنے کی بجائے خدا اور خدا کا بیٹا قرار دینا شروع کر دیا۔ بت پرستی نے ایک بار پھر پیچھے سے اس تصور کے سر یا سروں پر وار کرنا شروع کر دئیے۔

لہذا سن ۶۱۰ ء میں خدا نے پیغمبروں کے 'پول' کا پھر دورہ کیا اور محمد کا انتخاب کیا، ابراہیم کی آل اولاد سے ایک اور، اُس تمام گندگی کو صاف کرنے کیلئے جو یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے عقائد پھیلانے کے دوران پھیلائی تھی۔اسی لئے اسلام اثر پذیری اور مقام کی خاطر اپنی بنیادی یہودی تعلیمات کو لے کر آتا ہے ۔ کچھ بھی ہو میں جہاں سے بھی قرآن کھولتی ہوں، میں بار بار دہرائے جانے والے پیغام سے دور نہیں ہوتی جس کے مطابق پہلے سے اُترے مذاہب کو ادب و احترام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

اُس اہم ترین خیال کو خوش آمدید جس کا میں نے اشارہ وکنایہ میں چند منٹ پہلے تذکرہ کیا ہے: قبائلی خود سری سچ نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ میں نے قرآن کو مزید ایک بار 'دوسروں' کی آنکھ سے دیکھنے کیلئے پڑھا، میں

نے جانا کہ مسلمانوں کو تمام یہودیوں سے دور رہنے کیلئے نہیں کہا گیا بلکہ اُن یہودیوں سے دور رہنے کیلئے کہا گیا جو اسلام کوبطور استحقاق غلط کہتے ہوئے پھبتی کستے تھے۔ اور مسلمانوں کو یہودیت سے انکار نہیں کرنا چاہئے بصورتِ دیگر ہم اپنے ہی مذہب کو رد کرنے والے ہونگے۔

اگر اسلام اور یہودیت ایک ہی مذہب ہیں، اِن کو الگ الگ شکل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح عیسائیت کو برقرار رکھنے کا جواز کیا ہے؟ یا پھر ہندوازم، بدھ ازم، سکھ ازم یا کوئی بھی خالی ازم جسے آپ خود بھر لیں؟ کیوں ہم ایک ہی جست میں تمام میثاقوں کو گنوا نہیں سکتے اور ایک دوسرے کو ایک ہی خالق کے کام کے طور پر دیکھنا شروع نہیں کر دیتے؟ قرآن دق کر دینے والے اِس سوال سے نہیں ہچکچاتا۔ قرآن کا کہنا ہے، کہ مختلف مذاہب زندہ رہ سکتے ہیں، لہٰذا انسان کو 'اچھے کام' کے مقابلہ کیلئے کوئی ترغیب ملتی رہنی چاہئے۔ قرآن مانتا ہے کہ اچھے کام اپنے آپ کو اِن جھگڑوں میں اُلجھا کر نہیں کئے جا سکتے کہ کون خدا کی مرضی کو "سچے" طریقے سے اپنا رہا ہے۔ آپ اور میں نہیں جان

سکتے ، ہمیں اِس انبار کو چیر کر نکلنا ہو گا۔ قرآن ہمیں یقین دہانی کراتا ہے کہ خدا ہمارے عقائدی جھگڑوں کا فیصلہ کر دیگا جب ہم اُس کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اس اثناء میں اچھے کاموں کی دوڑ کاروبار نما فن کی طرح ہے کہ جیسے مذہبی مٹی کے ڈھیلے کو تراشنا شروع کیا جائے اور مسلسل تراشی ہوئی شے کی خوبصورتی کو بہتر کیا جائے۔ خدا کا دوسرے لوگوں کو پیدا کرنے کا دوسرا مقصداس مشق کو پھیلانا تھا تاکہ ایک دوسرے کو جاننے کی ضرورت کو ہم محسوس کریں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر خالق ہمیں اس امتیاز کے استعمال کو سکھاناچاہے کہ شروعات کرنے کی بجائے مختلف سمتوں میں پیچھے ہٹنے کا جواز کیا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس طرح کی تشریح پسند ہے لیکن تشریح کیلئے ہر بات کو اوپر اوپر سے ہی بیان کر دیا جاتا ہے کیونکہ قرآن مسلمانوں کو یہودیوں اورعیسائیوں کو دوست بنانے سے منع کرتا ہے ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ''اُنہی جیسے'' ہو جائیں۔ قرآن انہیں ''غیر منصف'' لوگ بتاتا ہے جن کی 'خدا ر ہنمائی نہیں کرتا۔ یہاں پر سزا دینے ، قتل کرنے اور غیر مسلمانوں پر

مخصوص ٹیکس لاگو کرنے کی بات ہے جو اُنہیں مسلمان فاتحین کو جزیہ کے طور پر دینا ہے۔ یہاں پر کھولا دینے والی سچی بات یہ ہے کہ یہ اقتباسات اُن مسلمانوں کو وہ یقین دیتے ہیں جو باہمی عقیدے کے بھائی چارے پر تھو تھو کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے، غیر مسلمان جی تو سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ کسی طور بھی اُن کی سطح پر نہیں آ سکتے۔ اس سطح کے قریب بھی نہیں آ سکتے، اسلام باقی مذاہب کو ملا کر ایک مذہب نہیں ہے ، یہ تو کامل کے لفظ کی چوٹ لگاتے ہوئے اور ایک خدا کا پرچار کرنے والے آخری نبی کی بنیاد پر سب سے برتر ہے۔ قرآن کو اس طرح پڑھنے کا اختیار بھی ہے، کیا ایسا نہیں؟ لیکن ہم اس بات کی پرواہ کب کرتے ہیں کہ ہم نے اس طریقہ کو اختیار کرنا ہے۔

''رک جاؤ''، آپ احتجاج کر سکتے ہیں۔ ''میں یہ تفہیم کسی صورت بھی استعمال نہیں کر رہی، میں اپنے ہمسائے کو حنوکہ منانے پر مکہ نہیں مارنا چاہتی لہذا مجھے یہودیوں کو پاش پاش کرنے والوں کے ساتھ شمار نہ کیجئے۔ میں لعنتی طور پر شریف النفس انسان ہوں''۔ جی ہاں، شاید آپ بھی ہیں۔ پھرشرافت سے باہر کون،

اپنے آپ سے پوچھئے ، کیا میں نے اسلام کے مرکزی اعتقاد کو چیلنج کرنے کا راستہ چنا ہے کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت کو اُلٹا کر رکھ دیتا ہے ؟ لہذا اس سارے عمل میں غلطاں ہم ایسی مذہبی نرگسیت کا شکار ہیں کہ زیادہ تر مسلمان دوبارہ نہیں سوچتے بلکہ ایک بار بھی نہیں سوچتے اُس ضیاع کے بارے میں جو ہمارے رویے کی وجہ سے دنیا پر مسلط ہو رہا ہے۔ ہم لاشعوری طور پر اس حقیقت کو مانتے ہیں، لیکن ریت سے سر نکال کر 'انتہا پسندوں' کی طرف اشارہ کرنے کو، اور بعض اوقات تو اتنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

کیا میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہوں؟ یہ واقعہ پڑھنے کے بعد مجھے بتائیے۔ سانحہ گیارہ ستمبر سے چند ہفتے قبل میں نے مسلمانوں کے ایک پینل میں''اسلامی دنیا کے تاثر پر بحث'' کی غرض سے شرکت کی۔ نرم خو لفظوں میں شکر ریزی کے انداز میں میں نے دعوت کلام دیتے ہوئے موضوع چھیڑا ، ''آئیے مغرب کے متعلق شکایات کا اظہار کریں''، میرے ساتھ پینل میں شرکاء شمالی امریکہ کے 'پاپ کلچر' کو حسبِ معمول سرزنش کرنا شروع ہو گئے: ہالی وُڈ ہمیں شدت

پسندوں کے طور پر پیش کرتا ہے ، شدت پسند ہمیشہ کالے دکھائے جاتے ہیں، اور ہر دوسری سطر میں اصولوں کا شکار ہونے والے بتائے گئے۔ میں نے ایک نہ رکنے والے مقرر سے بور ہو کر ایک دوسرا موضوع چھیڑا ، کہ ہم مسلمان دوسروں کو زیادہ موقع نہیں دیتے کہ لوگ ہمیں بھاری بھر کم شے سمجھنے کی بجائے کچھ اور بھی جان سکیں۔ یہاں پر میں نے پوچھا کہ جب طالبان نے قبل اسلام زمانہ کے بدھا بت گرائے تب ٹورونٹو، مونٹریال اور وینکوور کے مسلمانوں نے افغانستان کی بامیان وادی کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا؟'' دین میں کوئی جبر نہیں ہے ''، قرآن کا کہنا ہے۔ ہمیں طالبان سے کوئی توقع تو نہیں ہونی چاہئے کہ وہ یہ گیت گائیں گے لیکن مغرب میں بسنے والے مسلمانوں نے اس راگ کا انتخاب کیوں نہیں کیا ، ان کی اکثریت تو اِس موقع پر گونگی ہو گئی؟ اس احتجاج کے خلاف ہماری سڑکوں پر مسلمانوں کے جتھوں کی غیر حاضری کیوں تھی؟

میں نے توقف کیا۔

میری بات پر سارا ردعمل ایک مسلمان خاتون کا آیا، جو

حقوقِ نسواں کی ایک زبردست حامی خاتون ہیں، اور کسی طور بھی اس سے کم نہیں۔ ’’منجی‘‘ انہوں نے دیدے گھمائے۔ ’’تمہیں پتہ ہے کہ فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟‘‘ہائیں، معاف کرنا؟ جیسے کسی نے مجھے زمین کے اندر گھڑ دیا ہو یا میرے چو تڑوں کو نظامِ شمسی کے کسی حصے پر پہنچا دیا ہو جہاں پر ہم انصاف اور جواز کا فرق معلوم کرتے ہیں۔ میں اِس کو جواب دونگی، یہاں پر اسلامی حتمیت کی اُٹھان اور مشرق وسطیٰ کی ضدی سیاست کا آپس میں کچھ تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن تانے بانے کا یہ تعلق مغرب میں مذہبی بالا دستی کیلئے مسلمانوں کی خاموشی کا کیا جواز فراہم کرتا ہے، بدھا کے بتوں کو بموں سے گرانا، عورتوں کو کوٹنا، پتنگ بازی بند کروانا، طالبان مخالف کی سزائے موت؟

اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ جواب میں میری ’بہن‘ پیچھے ہٹ گئی۔ مغرب کے بارے اُس کی تمام سوچ نے نہ سوچنے والے اسلام کی طرح سر سے پاؤں تک برقعہ پہنا ہوا تھا۔ اگر خود کو حقوقِ نسواں کی حامی ظاہر کرنے والی عورت اپنی طرف سے یہی بہتر بات کر سکتی تھی

تو میں یہ تصور کر کے لرز گئی کہ ہم کس طرف کو جا رہے ہیں۔
ہر کوئی سانحہ گیارہ ستمبر والے دن پر توجہ مرکوز کرتا ہے ۔ میں اُس کے بعد والے دنوں پر توجہ مرکوز کرنا چاہتی ہوں۔ ہم مسلمانوں نے میڈیا، سیاستدانوں اور خود اپنے آپ کو اسلام کے بارے کیا یقین دہانی کرائی؟ روایتی چہروں کے ساتھ، ہم نے کہا کہ ہمارے مذہب کو ''ہائی جیک'' کر لیا گیا ہے۔ یہ درست ہے ، امریکہ ہائی جیک ہو گیا ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، جرمنی۔ ہمیں بھی اپنی آزادی پسند ہے ، آسٹریلیا۔ ہم اس مسئلے پر ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، کینیڈا۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہائی جیک ہو گئے ہیں۔
میں اس استعارے کو ہضم نہیں کر سکتی۔ یہ اِس بات کی دلالت دیتا ہے کہ جیسے اسلام خود ایک جہاز ہو جو انسانی حقوق کے کسی جنتی آسمان کی طرف خراماں خراماں رواں ہو اور گیارہ ستمبر کا واقعہ جیسے ہوا ہی نہ تھا، ائیر قرآنستان کے مسافر اپنے حیرت انگیز پتہ پر ایک ہلکے سے بمپ کی آواز کے ساتھ اُتر گئے ہوں، آپ کا بہت بہت شکریہ۔۔ ہائی جیک ہو گیا۔ جیسے ہمارا مذہب

مسلمانوں سے مرتکب ہونے والے فاش جرم کے باوجود بے قصور ہو۔ ہائی جیک ہو گیا۔۔ جذبات سے مغلوب لفظ جو مرکزی دھارے کے مسلمانوں کو اس ذمہ داری سے ماورا کرتا ہو کہ انہیں اسلام کی لفظی تصویر بننے سے بچنا ہے۔ پہلے اور سب سے اہم، خود پر تنقید کرنے سے یہ مراد ہونی چاہئے کہ ہم قرآن کی باعثِ کوفت باتوں کی طرف صاف طور پر آئیں اور دیکھیں کہ یہ کیسے دہشت گردی کرنے کے بارے بتاتا ہے۔

میں نے گیارہ ستمبر کے بعد، مسلمانوں سے متعدد بار یہ بھجن سنا۔ قرآن صاف طور پر یہ بتاتا ہے کہ جہاد کب اور کب نہیں فرض اور دہشت گردوں نے بلاشبہ قوانین کو توڑا۔ اس طرح کی ایک آواز کا حوالہ دیتے ہوئے، اللہ ''صاف صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ کسی معصوم انسان کا قتل ایسے ہی ہے کہ جیسے ساری انسانیت کا قتل ہو۔'' آرزو مندی کے ساتھ لپائی، میں کہتی ہوں۔ آپ کو وہ پارہ اور آیت معلوم ہے جو صاف صاف یہ بتاتی ہے؟ یہ اصل میں گول مول بات کرتی ہے، ''ہم نے اسرائیلیوں کیلئے یہ مقرر کر دیا ہے کہ جس نے انسان کو قتل کیا، سوائے سزا کا موجب قتل یا زمین پر

برے کرتوت کا موجب قتل، ایسے ہی ہے کہ جیسے ساری انسانیت کا قتل کیا''۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس شق کی ''سوائے'' سے شروعات مسلمان جہادیوں کو اُن کے جہاد کا ایندھن فراہم کرتی ہے۔

مثال کے طور پر اُسامہ بن لادن نے ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آخری حصہ میں پورے ریاست ہائے متحدہ کے خلاف جہاد کرنے کا اعلان کیا۔ اس ضمن میں قرآن نے اُس کی معاونت کی۔ اس آیت کی طرف واپس آئیے، ''سوائے قتل برائے سزا یا زمین پر فساد برپا کرنے والوں کا''۔ کیا اقوامِ متحدہ کی عراق کے خلاف پابندیوں (جنہیں امریکہ کے مطالبے پر عائد کیا گیا تھا) کے نتیجہ میں آدھے ملین بچوں کا ''قتل'' ہوا ؟ بن لادن کا یہی کہنا ہے۔ کیا سعودی دھرتی پر امریکی فوجیوں کے بوٹوں کے نشان ''زمین پر فساد'' کی طرح ہیں؟ بن لادن کے ساتھ آپ اس معاملہ میں شرط لگا سکتے ہیں۔ کیا عام امریکی شہری کسی ''قتل'' یا ''فساد'' کے معاملے میں معصوم ہیں جب اُن کے ٹیکس کے پیسوں سے اسرائیل ٹینک خرید کر فلسطینیوں کے گھر گراتا ہے؟ بن لادن کیلئے دماغ کی کمی نہ تھی۔ جیسا کہ اُس نے ۱۹۹۹ء میں سی این این

کو ایک انٹرویو دیا، ’’امریکی حکومت نے فلسطین پر اسرائیلی قبضے کے سلسلہ میں ایسے کام کئے ہیں جوبیحد غیر منصفانہ، گھناؤنے اور مجرمانہ ہیں، یہودیوں کی ماتحتی کے نتیجہ میں امریکہ کا تکبر اس مقام پر آ گیا ہے کہ وہ عرب پر قابض ہو گئے ہیں، جو مسلمانوں کی سب سے مقدس جگہ ہے۔ زیادتی کی اِس اور دیگر وجوہات کی بناء پر ہم نے ریاست ہائے متحدہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔‘‘

آپ اور میں اس بات پر متفق ہو سکتے ہیں کہ اخلاقی طور پر اسامہ بن لادن قدیم دور کے اُس انسان کی طرح ہے جس کا ماتھا کسی قدر کوتاہ اور دبا ہوا ہو ، جو اس نوعیت کے جہاد کی لہر شروع کر رہا ہے۔ لیکن کیا ہم اس بات پر متفق ہو سکتے ہیں کہ اُسے اور اُس کے صلہ کے طالب فوجیوں کو مذہب کی حمایت بھی حاصل ہے؟ میں یہ سب اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ ہم ایمانداری سے صورتحال کو دیکھیں۔

یہ سب کیا ہے؟ کیا مجھے قرآن کے متشدد اقتباسات کے تناظر کو سمجھنا چاہئے؟ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں ، میں نے اچھے لکھنے والوں کا مطالعہ کیا جو اِن آیات کی

”اِن کے پس منظر“ میں تشریح کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہاں پر گول مول بات کا ایک فینسی سا رقص ہے۔ اس رقص کی کوریوگرافی کسی سازش کے تحت نہیں ہے ، بلکہ جڑوں میں بیٹھے اِس مفروضے کی بناء پر ہے کہ قرآن ایک کامل کتاب ہے ، لہذا نفرت کی کوئی کامل ٹھوس وجوہات ہونگی، وہ نفرت جس کا بار بار اظہار ہوا ہے۔

ایک بلند پایہ دلیل پر غور کیجئے جو اسلام کو امن کا مذہب ”یقینی طور پر“ ثابت کرتی ہے۔

اس دلیل کے مطابق، جب خدا نے محمد کو اچھے اور برے وقتوں میں ہدایتیں دیں تو قرآن کی بری آیتیں صرف اُن برے وقتوں کی عکاس ہیں جو محمد نے اسلام کے پھیلاؤ کے پچیس یا زائد برسوں میں دیکھے۔ محمد نے مکہ سے نئے مذہب کو پھیلانا شروع کیا ، جہاں غلام بیواؤں یتیموں اور غریب کارکنوں نے اُن کے غیر معمولی پیغام رحمت سے وابستگی کا آغاز کیا۔ خدا جانتا ہے کہ اِن بے خانماں لوگوں کو رحم کی بھیک عرب کے اخلاقی سطح پر زوال پذیر امیر دارالخلافہ میں اقتصادی مدد کی صورت میں دی گئی۔ شروع میں تو قرآن کی آگہی

ہمدردی پر زور دیتی ہے۔
مگر دیکھتے ہی دیکھتے مکہ کے کاروباری اجارہ دارطاقتور سے طاقتور ہوتے چلے گئے۔ محمد اور اُن کے ساتھیوں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور اپنے بچاؤ کی خاطر مدینہ ہجرت کر گئے۔ بنیادی طور پر یہیں سے قرآن کا پیغام رحم سے انتقام کی جانب مڑ گیا۔ مدینہ میں کچھ لوگوں نے مسلمانوں کی آمد کا استقبال کیا اور کچھ نے خوش آمدید نہ کہنے کا فیصلہ کیا۔ اُن میں سے جنہوں نے استقبال نہ کیا تھا وہ مدینہ کے ممتاز یہودی قبائل تھے جنہوں نے مکہ کے کافروں کے ساتھ مل کر محمد کو قتل کرنے کی سازش کی ہوئی تھی اور نو مسلموں کو ملیا میٹ کر دینا تھا۔ وہ کیوں اپنے مقصد میں ناکام ہوئے کیونکہ خدا نے محمد کو ہدایت دی کہ وہ اِن پر پیش قدمی کے طور پر حملہ کر دیں۔ دلیل کے مطابق یہ وہ مقام ہے جب قرآن میں طعن و تشنیع در آتی ہے۔ دلیل آگے چلتی ہے ، انتقام ہی وہ جذبہ نہ تھا جس سے مسلمانوں نے شروعات کیں۔ انہوں نے تو فقط تحفظ ذات کی خاطر اِس کا سہارا لیااور صرف عارضی طور پر۔۔ اسلام کے پرانے ”اصلی “ پیغام پر تو محمد نے اپنے مذہب کی بنیاد

رکھی تھی، یہ پیغام انصاف، برابری، اتحاد اور امن کا ہے۔
جذباتی طور پر کتنا تشفی بخش معاملہ ہے۔ میں اِن چیزوں کو ماننے میں راحت محسوس کرتی رہتی ، لیکن میں جتنا زیادہ پڑھتی اور تفکر کرتی رہی اُتنا ہی اِن چیزوں نے مجھے مشکوک کر دیا۔ قرآن پڑھنے کا آغاز کرنے والے پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ محمد پر کونسی آیت کب اُتری تھی۔ قرآن کی ترتیب سورہ کے سائز پر دکھائی دیتی ہے ، لمبی سے چھوٹی سورتیں، وحیوں کی زمانی ترتیب کے لحاظ سے نہیں۔۔ کیسے کوئی پہلے اُترنے والی آیتوں کو الگ سے کرے ، اور ان کو الگ سے قرآن کے ''اصلی'' پیغام کے ساتھ پڑھا جائے؟ ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑیگا کہ قرآن کا پیغام تمام خونی نقشے پر پھیلا ہوا ہے۔ رحم اور تذلیل، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ عورتوں کے بارے قرآن کے موقف کو دیکھئے۔ حق میں اور مخالفت میں آیتیں ایک دوسرے سے چند سطروں کے فاصلے پر ہیں۔ مذہبی بھائی چارہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اس نام نہاد کامل ، بلا مباحث اور صاف کھرے متن میں کوئی چیز بھی مبالغہ

آمیز نہیں۔ جبکہ قرآن کی کاملیت پر بے پناہ شبہات ہیں۔
ارے محترم، کیا میں حد کو پھلانگ گئی ہوں؟ میرا حد سے گزر جانا القاعدہ کی دہشت گردی کو بھی مات کر دیتا ہے۔ میرے سے مختلف، یہ لوگ قتل کرنے کیلئے باہر نکل آئیں گے۔ اگر ہم دم گھونٹنے والی مطلق العنانی کے ساتھ لڑنے میں مخلص ہیں تو ہم یہ پوچھتے ہوئے ڈر نہیں سکتے، کیا ہے کہ اگر قرآن کامل کتاب نہیں ہے؟ کیا ہے کہ اگر یہ مکمل طور پر خدا کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے؟ کیا ہے کہ اگر یہ انسانی تعصبات کا معما ہے؟ آئیے اس امکان کو بھی ہم تھوڑی دیر کیلئے اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کو اسلحے سے بھرے جہاز مارنے والوں کے سرغنہ محمد عطاء نے اپنے گینگ کی جانب سے قتل کے نوٹ میں لکھا ہے، ''ہمارے لئے کافی ہے کہ قرآن کی آیات زمین اور سیاروں کے خالق کے لفظ ہیں۔۔۔'' عطا نے ایک بار نہیں بلکہ تین بار دلاسا دیتے ہوئے اس بات کی طرف رجوع کیا، ''تمام وہ چیزیں جن کا خدانے اپنے شہیدوں سے وعدہ کیا ہے''۔ خاص طور پر، ''کیا تم جانتے ہو جنت کے باغات اپنے تمام تر حسن کے

ساتھ تمہارے منتظر ہیں اور جنت کی حوریں تمہارا انتظار کر رہی ہیں، تمہیں بلا رہی ہیں، ادھر آؤ اگر تم خدا کے دوست ہو''۔

مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ پر دوسرے جہاں کی فلم کی اجنبی زبان کھول کر بیان کروں: عطا اور اُس کے ساتھ بمبار لڑکے جنت کی درجنوں باکرہ حوروں تک ہر پابندی سے ماورا پہنچ کی امید میں تھے۔ صرف وہی نہیں۔ گیارہ ستمبر سے ایک مہینہ قبل فلسطین کی مزاحمت کے نام پر دہشت گرد تنظیم حماس کے مجاہد بھرتی کرنے والے انچارج نے سی بی سی ٹیلی ویژن پر بتایا کہ وہ ہر امیدوار کو ستر حوریں نظر آنے کا لالچ دیتا ہے۔ یہ انزال کا ایک ایسا بلا رکاوٹ لائسنس ہے جو خود کو بم سے اڑانے کے صلہ میں ملے گا اور یہ ایک عرصہ سے کہا جا رہا تھاکہ قرآن نے مسلمان شہیدوں کیلئے اس انعام کا وعدہ کیا ہے۔

مگر جنت میں ا یک مسئلہ کی وجہ کا بھی ہمیں علم ہوا ہے ، ایک بشری غلطی جو قرآن میں سرزد ہوئی۔ نئی تحقیق کے مطابق شہداء اپنی قربانیوں کا جو صلہ توقع کر رہے تھے ، وہ حوریں نہیں ہیں بلکہ میوے ہیں۔ وہ لفظ

جس کو ماہرِ قرآنیات صدیوں سے ''کالی آنکھوں والی حوریں'' کہہ رہے تھے۔۔ ارے ۔۔۔ اُس کے درست معنی تو ''سفید میوے'' ہیں۔ (ہنسئے گا نہیں، بہرحال زیادہ نہیں۔ ساتویں صدی کے عرب میں میوے اچھے خاصے قیمتی ہونے کی وجہ سے جنت کا تحفہ شمار کئے جاتے تھے)۔ ابھی بھی ، حوروں کی بجائے میوے؟ پلیز، قرآن اس طرح کی غلطی کس طرح کر سکتا ہے؟

وہ تاریخ دان جنھوں نے یہ کیس بنایا ، اُن کا نام ہے کرسٹوف لکسنبرگ جو مشرقِ وسطیٰ کی زبانوں کے ماہر ہیں۔ انہوں نے قرآن کی جنت کشی کو مسحیت کے علم کی کڑی میں دیکھا ، مسحیت کا علم اسلام کی آمد سے صدیوں پرانا ہے جو ارامی زبان میں لکھا ہوا ہے اور اس زبان کو عیسیٰ بولتے تھے۔ اگر قرآن یہودو عیسائیت سے اثرات قبول کرتا ہے جو کہ پہلے مذاہب پر ایمان لانے کے دعوے کے عین مطابق ہے تب ارامی ہی انسانی ہاتھوں سے عربی میں ترجمہ ہوئی ہو گی۔ یا 'ارے' کی صورت میں غلط طور سے ترجمہ ہوئی ہو گی اور کون جانتا ہے کہ اس طرح (میوے) جیسے کتنے لف*۔۔۔۔

کیا عجب ہے کہ پوری آیات کا ہی غلط مطلب لے لیا گیا

ہو؟ بطورایک ان پڑھ تاجرپیغمبر محمدنے نقل نویسوں پر دارومدار کیا اُن لفظوں کو قلمبند کرنے کیلئے جو انہوں نے خدا سے سنے۔۔کبھی کبھار تو پیغمبر خود اُن لفظوں کی تشریح کرنے کی جان توڑ کوشش کرتے تھے جو وہ خدا کی جانب سے سنتے تھے۔ اس طرح ''شیطانی آیات'' کا ایک سیٹ معرض وجود میں آیا ، ایسی آیات جن میں کافر بتوں کی پوجا کی گئی تھی، اکٹھی ہو کر محمد تک پہنچیں اور قرآن میں اصل طور پر جگہ پا لی۔ پیغمبر کو بعد میں اِن آیات کو نکالنا پڑا ، شیطان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہ اُس نے چال چلی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مسلمان علماء کو صدیوں تک اس کہانی کو قرآن کی کاملیت کے حوالے سے پرانے زمانے کے شکوک کے طور پر بیان کرنا پڑا۔ اب پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہم اِن شکوک کو واپس لائیں۔

کیا ہے اگر سادہ ظنِ کامل کی بجائے محمد عطاء کی دل کو کھینچ لینے والے سوالات کی روشنی میں پرورش ہوئی ہوتی ؟ اور سب سے کم تر، کیا ہے اگر کالج کا یہ طالبعلم جانتا ہوتا کہ لفظوں کی اصلیت۔۔ حیات بعد موت کے بارے بنیادی لفظ جانچے جا سکتے ہیں؟ اور یہ سب لفظ

’’زمین اور سیاروں کے خالق کے لفظ‘‘ نہیں ہیں؟ اور کہ خود کی ہلاکت کا حاصل انسانیت کے قتل کے علاوہ کچھ نہیں، تو وہ متذبذب نہ ہوتا؟ اور کہ جنت کا امکان خیالی پلاؤ ہے ، یقینی نہیں؟ ممکن تھا تب وہ اپنی حرکت سے باز آ گیا ہوتا۔ ممکن ہے۔ امکان توجہ کا طالب ہے۔

قرآن کے بارے سوالات اٹھانے کا مقصد الجھن کی تجدید کے بنیادی معاملے جیسا ہے کیونکہ یہ سارے ہڑ کی عداوت مول لینے جیسا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ ماننے والے نہیں ہیں کہ جوابات دے دئیے گئے ہیں یا یہ کہ یہ جوابات آپ کو دئیے گئے ہیں۔

گیارہ ستمبر کے بعد مہینوں تک تمام سوالوں سے بھی بڑے ایک سوال نے مجھے تنگ کیا، جیسا کہ قرآن اپنی مرضی کی گنجائش دینے کی جگہ بناتا ہے پھر کیوں اسلام کے عصری اہلِ بصیرت تنگ نظری کی طرف گرتے دکھائی دیتے ہیں؟ کیوں ان کی اکثریت فراخ دلی کی طرف مائل ہوئی؟مجھے قرآن سے ماورا جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، مجھے مسلم تعصبات کے تشریحی اضطرار کے حفاظت کدے کو دھونڈنا تھا۔

یہ سب کرنے کیلئے مجھے اُن جھوٹوں کے چھلکے اُتارنا

تھے جو ہمیں بتائے جاتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔'' پاکستان میں اوسطاً دو لڑکیاں روزانہ کے حساب سے غیرت کا قتل کے نام پر مرتی ہیں، مرنے والیوں کے قاتلوں کی اکثریت کے لبوں پر خدا کے نام کا ورد جاری ہوتا ہے۔'' حوالہ: ڈاکٹر رفعت حسین نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کو بتایا، اِس بات کا تذکرہ نیوا ویلٹن اور لنڈا وولف کے ایڈیشنز ، Global Uprising:Confronting the Tyrannies of the 21th Century - Stories from a New Generation of Activists (Gabriola Island, British Columbia: New Society Publishers, 2001 کے صفحہ 214پر ہے۔

۲۔ ''مالی اور موریطانیہ میں چھوٹی عمر کے لڑکوں کو جنس زدگی پر مجبور کر کے اُن کے مکروہ مسلمان آقا اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔'' حوالہ: ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ، Freedom House and specific articles بشمول "Is Youssouf Male a Slave?" مائیکل فنکل، دی نیو یارک ٹائمز میگزین، نومبر ۱۸ ،

۲۰۰۱۔

۳۔ '' سوڈان میں انسانی غلامی اسلامی فوج کے ہاتھوں ہوتی ہے۔'' حوالہ: چارلس جیکبس، "Why Israel and not Sudan, is singled out" اخبار بوسٹن گلوب، اکتوبر۵، ۲۰۰۲۔

۴۔ ''بنگلہ دیش میں جن مصنفین نے اقلیتوں کے حقوق کی وکالت کی انہیں یا تو جیلوں میں بند کر دیا گیا یا پھر سرے سے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔'' حوالہ: روتھ بالڈوِن،''بنگلہ دیش میں طالبانائزیشن''، دی نیشن (آن لائن ایڈیشن، مئی ۱۸ ، ۲۰۰۲ء) دیکھئے www.thenation.com

۵۔ '' آدمیوں اور لڑکوں کا ایک ہجوم اُن کے گرد کھڑا تھااور مٹھی کی سائز کے پتھر اُن کے سروں پر مارنے کیلئے تیار تھا۔'' اِس دل دہلا دینے والے منظر کو وڈیو پر دیکھنے کیلئے مصنفہ کی ویب سائٹ پر باب ۲ کے فٹ نوٹ میں جا کر متعلقہ بٹن کو کلک کیجئے۔

۶۔'' ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ اسلام میں ہم جنس پرستی کی گنجائش نہیں لیکن خدائے ذوالجلال کے دربار میں کوئی چیز بھی ممکن ہے۔'' حوالہ: چارلس لی گائی ایٹن،

’کیویر ٹیلی ویژن‘، سٹی ٹی وی، اپریل ۸، ۲۰۰۱۔
۷۔ ’’امام نے لندن کی تیز دھار انگریزی بولتے ہوئے فیلر سے کہا کہ ’آپ کو ہر صورت آخری نبی کو ماننا ہو گا‘ ۔ حوالہ: بروس فیلر، ابراہام ، A Journey into the Hearts of Three Faiths (New York: William Morrow, 2002), p. 180.
۸ ۔ ’’یہ امام مسلمانوں کی اکثریت کی ترجمانی کرتا ہے ، کم ازکم وہاں بسنے والے مسلمانوں کی ۔‘‘
۹ ۔ ’’دونوں مطلق راستی اور قرآن کی کاملیت کی بات کرتے ہیں۔ دونوں محمد کو آخری نبی مانتے ہیں اور محمد کی تعلیمات اور عمل پر پیروی کرانے کیلئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں‘‘۔ حوالہ: رپورٹ اگست ۔ دسمبر ۲۰۰۲ ، اکیڈمی آف لرننگ اسلام ، رچمنڈ، برٹش کولمبیا۔ یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا وینکوور کے انتھراپولوجی میوزیم میں ’سپرٹ آف اسلام‘ کی نمائش کی تیاری کے موقع پر پیش کی جانے والی رپورٹ۔
۱۰۔ ’’خدا نے اکیلی روح میں زندگی پھونکی اور اُس کے بطن سے ساتھی پیدا کیا۔‘‘ حوالہ: قرآن، ۴:۱، مزید دیکھئے ۴:۵۷، یہاں کہا گیا ، ’’اُن لوگوں کیلئے جو ایمان

لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے، ہم اُنہیں ایسے باغات میں داخل کریں گے پانی کی بہتی ندیاں ہوں گیاور جہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پاکباز ازدواجی بندھن میں بندھے ہوں گے، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ہم اُنہیں ایک ایسے اعلیٰ مقام میں داخل کریں گے‘‘۔ نوٹ کیجئے، مرد عورت کی جنس سے ماورا ساتھیوں کا یہاں بھی ذکر ہے۔

۱۱۔ ’’ کون روح ہے اور کون ساتھی؟ یہ بات غیر متعلقہ ہے‘‘ نوٹ: جب ہم جنس پرستوں کے مخالفین نعرے لگاتے ہیں، ’’خدا نے آدم اور حوا کو پیدا کیاہے، آدم اور سٹیو کو نہیں‘‘، تو ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ قرآن شاید اِس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔۔۔

۱۲۔ ’’ اپنی ماؤں کی عزت کرو جن سے تم پیدا ہوئے ہو، خدا تمہیں ہمیشہ دیکھنے والا ہے۔‘‘ حوالہ: قرآن، ۴:۱

۱۳۔ ’’ اور وہ جن سے تم نافرمانی کا خطرہ پاؤ، اُن کو تنبیہہ دو، اُنہیں اپنے ساتھ نہ سلاؤ اور اُن کو مارو۔‘‘حوالہ: قرآن، ۴:۳۴

۱۴۔ ’’یقیناً اِس عہد نامے کی ایک شق مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کی تائید کرتی ہے لیکن دوسری شق

مردوں کو اپنے کنبے کا کفیل قرار دیتی ہے۔‘‘ حوالہ: کائرو ڈیکلریشن کی شقیں ۶ (اے) اور ۶ (بی) ، مزید دیکھئے : این الزبتھ مائر کی کتاب، Islam and Human Rights: Tradition and Politics (Boulder: (Westview Press, 1999

۱۵۔’ ’تم اپنی کھیتیوں میں جاؤ جب تم مطمئن ہونا چاہو، اچھے کام کرو اور اپنے خدا سے ڈرو۔۔‘‘ حوالہ: قرآن ۲: ۲۲۳

۱۶۔ ’’ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ’جنسی طور پر روشن خیال بنانے والی‘ یہ آیت مساج کی حمایت کرتی ہے۔‘‘حوالہ: سی بی سی ٹیلی ویژن کے پروگرام ’ہاٹ ٹائپ‘ کے آن کیمرہ ڈسکشن کیلئے، جسے ۵مارچ ۲۰۰۳ء کو ریکارڈ کیا گیا تھا۔

۱۷۔’’ خرتوم کی یورش نے سیاہ فام غلاموں کی تجارت کی یاد تازہ کر دی ہے ، جس کو قریب ایک صدی قبل غلامی کے مخالف برطانویوں نے تقریباً ختم کروا دیا تھا۔ ۔۔ اُس کے بعد غلاموں کے گلے تک کاٹ دئیے جاتے ہیں، لڑکوں، عورتوں اور بچیوں کے ساتھ اجتماعی زنا ہوتا ہے اور مزاحمت کی صورت میں اُن کے گلے کاٹ دئیے

جاتے ہیں۔ دہشت سے زندہ بچ جانے والے غلاموں کو شمال کی سمت بھیج دیا جاتا ہے جہاں اِن کو عرب آقاؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے ، عورتیں داشتائیں بن جاتی ہیں، بچیاں گھریلو ملازمائیں اورلڑکے چرواہے۔"
حوالہ: چارلس جیکبس، مضمون بعنوان ، Why Israel and not Sudan, is singled out، اخبار بوسٹن گلوب، اکتوبر ۵، ۲۰۰۲ء۔
۱۸۔' 'تمہارے وہ غلام جو آزاد ہوناچاہیں، اُن کو آزاد کر دو اگر تم اُنہیں اُن کا اہل پاؤ۔۔" حوالہ: قرآن، ۲۴:۳۳۔ ایک دوسرا حوالہ جہاں غلامی کے بارے مہر تصدیق مل سکتی ہے ، ۴: ۲۵
۱۹ ۔ "یہ عیسیٰ کی بطور مسیحا ایک سے بار مدح خوانی کرتا ہے۔ " حوالہ : قرآن، ۳:۴۵ اور ۴: ۱۵۷
۲۰۔" اپنی شروعات میں یہودیوں کی قرآن اعلیٰ مرتب قوم کے طور پر ہماری یاد دہانی کراتا ہے۔" حوالہ: قرآن، ۲:۴۷ اور ۲:۱۲۲
۲۱۔ "پنے مذہبی پرکھوں کو گرم ملائم خطابات سے نوازتے ہوئے قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کو تاثر دیتا ہے کہ مطمئن ہو جاؤ اور اُنہیں 'کوئی خوف یا افسوس' نہیں

ہونا چاہئے جب تک وہ اپنے مذاہب کے ساتھ ایماندار رہیں۔ “ حوالہ: قرآن ۲:۶۲ اور ۵:۶۹

۲۲۔ ”دوسری طرف قرآن صاف صاف اسلام کو واحد ’سچے مذہب‘ کے طور پر پیش کرتا ہے۔“ حوالہ: قرآن، ۳:۱۹۔

۲۳۔ ” مختلف مذاہب زندہ رہ سکتے ہیں، لہذا انسان کو ’اچھے کام‘ کے مقابلہ کیلئے کوئی ترغیب ملتی رہنی چاہئے۔“ حوالہ: قرآن، ۴:۴۸

۲۴۔” قرآن مسلمانوں کو یہودیوں اورعیسائیوں کو دوست بنانے سے منع کرتا ہے ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ”اُنہی جیسے“ ہو جائیں۔ قرآن انہیں ”غیر منصف“ لوگ بتاتا ہے جن کی ’خدا ر ہنمائی نہیں کرتا۔ یہاں پر سزا دینے ، قتل کرنے اور غیر مسلمانوں پر مخصوص ٹیکس لاگو کرنے کی بات ہے جو اُنہیں مسلمان فاتحین کو جزیہ کے طور پر دینا ہے۔“ حوالہ: قرآن ۵:۵۱، ۶۱:۴، ۶۱:۷، ۴۷:۴، ۳۹:۷۱۔۷۳ ، ۹:۲۹۔ یہاں پر ۴: ۵۶ کے مقام پر دل دہلا دینے والی آیت ہے ، جو یوں ہے۔ ”جو ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں ، اُن کیلئے دہکتی ہوئی آگ ہے ، جلد ہی اُن کی چمڑیاں وہاں جل جائیں ، پھر ہم اُنہیں نئی چمڑیاں

دیں گے تاکہ وہ کئے کی سزا پا سکیں۔ بلاشبہ خدا سب سے بڑا اور حکمت والا ہے۔‘‘

۲۵۔ ’’سانحہ گیارہ ستمبر سے چند ہفتے قبل میں نے مسلمانوں کے ایک پینل میں’’اسلامی دنیا کے تاثر پر بحث‘‘ کی غرض سے شرکت کی۔‘‘ حوالہ: سی ٹی وی کا پروگرام’’دی چیٹ روم‘‘، جو ۱۹جون ۲۰۰۱ء کو نشر ہوا۔

۲۶۔ ’’ دین میں کوئی جبر نہیں ہے ‘‘، قرآن کا کہنا ہے۔‘‘ حوالہ: قرآن، ۲:۲۵۶

۲۷ ۔ ’’ روایتی چہروں کے ساتھ، ہم نے کہا کہ ہمارے مذہب کو ’’ہائی جیک‘‘ کر لیا گیا ہے۔‘‘ نوٹ: یہ استعارہ مرکزی نوعیت کے پریس میں اتنا اعتبار پا گیاکہ اِس کا استعمال سانحہ گیارہ ستمبر کے ایک سال بعد بھی جاری رہا۔ مثال کے طور پر اخبار گلوب اینڈ میل کی ۱۷دسمبر ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں شیما خان کا مضمون "The Language of Islam has been hijacked" ملاحظہ فرمائیے۔

۲۸۔’’ اس طرح کی ایک آواز کا حوالہ دیتے ہوئے ، اللہ ’’صاف صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ کسی معصوم

انسان کا قتل ایسے ہی ہے کہ جیسے ساری انسانیت کا قتل ہو۔‘‘حوالہ: مقتدرخان، "A Memo to American Muslims"، اِس حوالے کو www.islamfortoday.com سے بھی ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔میں مسٹر خان کاالپائی کی مثال کے طور پر حوالہ دینے پر معذرت خواہ ہوں، بہت زیادہ معذرت خواہ کیونکہ اُن کا کام فکر انگیز اور دیانتدارانہ دکھائی دیتا ہے۔ اِس معاملہ میں مسٹر خان بے ضرر طور پر دکھاتے ہیں کہ حتکہ بے باک مسلمانوں کی اکثریت کا بھی قرآن کی تشدد کیلئے حمایت کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔

۲۹۔’’ ہم نے اسرائیلیوں کیلئے یہ مقرر کر دیا ہے کہ جس نے انسان کو قتل کیا، سوائے سزا کا موجب قتل یا زمین پر برے کرتوت کا موجب قتل، ایسے ہی ہے کہ جیسے ساری انسانیت کا قتل کیا‘‘۔ حوالہ: قرآن ، ۵:۳۲

۳۰ ۔ ’’جیسا کہ اُس نے ۱۹۹۹ء میں سی این این کو ایک انٹرویو دیا، ’’امریکی حکومت نے فلسطین پر اسرائیلی قبضے کے سلسلہ میں ایسے کام کئے ہیں جوبیحد غیر منصفانہ، گھناؤنے اور مجرمانہ ہیں، یہودیوں کی ماتحتی کے نتیجہ میں امریکہ کا تکبر اس مقام پر آ گیا

ہے کہ وہ عرب پر قابض ہو گئے ہیں، جو مسلمانوں کی سب سے مقدس جگہ ہے۔ زیادتی کی اِس اور دیگر وجوہات کی بناء پر ہم نے ریاست ہائے متحدہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔'' حوالہ: "People in the News: Osama Bin Laden, CNN سی این این نے سانحہ گیارہ ستمبر کے بعد اِس انٹرویو کو متعدد بار نشر کیا۔

۳۱۔'' ایک بلند پایہ دلیل پر غور کیجئے جو اسلام کو امن کا مذہب ''یقینی طور پر'' ثابت کرتی ہے۔'' نوٹ : میں جس دلیل کا حوالہ دے رہی ہوں وہ دلیل عبداللہ انعائم کی ہے جو 'نیو کوارٹرلی پرسپیکٹو' کی سرما ۲۰۰۲ء کی اشاعت سے بطور حوالہ لی گئی ہے جسے www.digitalnpq.org سے مضمون "The Islamic Counter-Reformation" کے حصہ سے ڈاؤن لوڈ کیا گیا۔

۳۲۔ '' قرآن پڑھنے کا آغاز کرنے والے پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ محمد پر کونسی آیت کب اُتری تھی۔'' حوالہ: بہت سارے مفکرین اِس نقطے کا سہارا لیتے ہیں بشمول ٹمپل یونیورسٹی کے محمود ایوبی۔ اُن کے اِس عمدہ باب

"The Islamic Tradition," پر ایک نظر ڈالئے ، جو اُن کی کتاب World Religions: Western Traditions مطبوعہ ڈان ملز اونٹاریو، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی سن ۲۰۰۲ء کی اشاعت کردہ ہے۔ پروفیسر ایوب لکھتے ہیں،''قرآن کے اصل مرتبین نے سورتوں کو لمبائی کے اعتبار سے ترتیب دیا تھا اور اِس ترتیب نے یہ تعین کرنا ناممکن بنا دیا کہ قرآن کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا جا سکے'' (صفحہ ۳۵۷)۔

۳۳۔'' اُس نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ ہمارے لئے کافی ہے کہ قرآن کی آیات زمین اور سیاروں کے خالق کے لفظ ہیں۔۔۔اِدھر آؤ،اللہ کے ساتھیو''حوالہ: عطا کا نوٹ، Anti-American Terrorism: A Documentary Reader (Oxford, New York: Oxford University Press), pp.223-238 By Barry Rubin and Judit Kolp Rubin

۳۴۔ ''گیارہ ستمبر سے ایک مہینہ قبل فلسطین کی مزاحمت کے نام پر دہشت گرد تنظیم حماس کے مجاہد بھرتی کرنے والے انچارج نے سی بی سی ٹیلی ویژن پر بتایا کہ وہ ہر امیدوار کو ستر حوریں نظر آنے کا لالچ

دیتا ہے۔“ حوالہ: ابنِ وراق، مضمون "Virgins? What virgins?" اخبار دی گارڈین، ستمبر ۱۲، ۲۰۰۲ء۔

۳۵۔ ”یہ انزال کا ایک ایسا بلا رکاوٹ لائسنس ہے جو خود کو بم سے اڑانے کے صلہ میں ملے گا۔۔“ نوٹ: ٹورونٹو میں انٹیلی جنس افسروں نے ، جو دنیا بھر میں دہشت گردی کے ماہرین کے خلاف کام کرتے ہیں، مجھے بتایا کہ خودکش بمباراپنے چڈوں پر ایک سے زائد جانگھیے پہنتے ہیں یا اُس حصے کواخباروں سے بھر لیتے ہیں تاکہ اپنے اعضائے رئیسہ کو بارود کے اثر سے بچا سکیں۔

۳۶۔ ” انہوں نے قرآن کی جنت کشی کو مسحیت کے علم کی کڑی میں دیکھا، مسحیت کا علم اسلام کی آمد سے صدیوں پرانا ہے جو ارامی زبان میں لکھا ہوا ہے اور اس زبان کو عیسیٰ بولتے تھے۔“حوالہ اور نوٹ: جن دنوں میں یہ کتاب لکھ رہی تھی تب کرسٹوف لکسنبرگ کی کتاب The Syro-Aramaic Reading of the Koran صرف جرمن زبان میں دستیاب تھی، لہذا میں نے بہت سارے جرمن پروفیسروں پر انحصار کیا۔ میں نے اِس کتاب پر تبصرے اور مضامین بھی دیکھے ہیں، بشمول الیکزینڈر

اسٹیلی کا مضمون، "Radical New Views of Islam and the Origins of Koran"، جو نیو یارک ٹائمز میں دومارچ ۲۰۰۲ء کو شائع ہوا تھا۔

بہرکیف ، ویب سائٹ www.badattitudes.com نے میوے/حوروں کو کہانی اِس تیز دھار سرخی کے ساتھ لگائی تھی، "Good news for vegan martyrs!"، بعض اوقات آپ کو ہنس لینا چاہئے۔

۳۷ ۔ ''کبھی کبھار تو پیغمبر خود اُن لفظوں کی تشریح کرنے کی جان توڑ کوشش کرتے تھے جو وہ خدا کی جانب سے سنتے تھے۔'' حوالہ: مثال کے طور پر کیرن آرم سٹرونگ کی کتاب 'خدا کی تاریخ' میں صفحہ ۱۳۹ اور ۱۴۸ دیکھئے۔

۳۸۔ '' اور یہ حقیقت ہے کہ مسلمان علماء کو صدیوں تک اس کہانی کو قرآن کی کاملیت کے حوالے سے پرانے زمانے کے شکوک کے طور پر بیان کرنا پڑا۔''نوٹ: مسلمان علماء تو صدیوں تک حوروں کی تعداد کے بارے ہی آپس میں لڑتے رہے ، اگر حساب ہی شفاف نہیں بن سکا، تب کوئی اور شے کیسے معروضی بن سکتی تھی، جیسا کے لفظوں کے معنی حتمی بن سکتے تھے

ہم نے سوچنا کب بند کیا؟

نومبر ۲۰۰۱ء میں،ہم سب قریب دو ماہ کی(سانحہ گیارہ ستمبر کی دل و دماغ کو) گھیر لینے والی تصویروں سے توجہ ہٹانا چاہ رہے تھے۔ تباہ شدہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی نہ ختم ہونے والی باتیں ہمارے ٹیلی ویژنوں پر چل رہی تھیں، ایک ایسی یاد کے طور پر جو نہ صرف ہلا دینی والی تھی اور جس کے بارے تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں کی شل کر دینے والی کیفیت میں کچھ کمی واقع ہوئی ، جو قدرتی امر تھا ، اور 'یہ کیسے ہوا' پر مباحثوں کا تندوتیز سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک سوال تو فوراً ہی سامنے آ گیا کہ اسلامی دنیا کواس زیادتی کا کیا تدارک کرنا چاہئے؟

فوری طور پر شمالی امریکہ کی اسلامی تنظیموں نے مصالحانہ پریس نوٹ جاری کرنے کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ شروع کر دیا۔ اخبارات کے مراسلاتی صفحات پر اِن کے رہنماؤں کی سرخیاں لگنے لگیں۔ صبح و شام 'نسلی تعلقات ' کے ماہر دھڑے بازوں نے کیبل نیوز کے

چینلز پر امریکہ اور اتحادیوں سے استدعا کرنا شروع کی کہ سانحہ گیارہ ستمبر کے نتیجہ سے پیدا ہونے والی ناآسودگی کو مسلمانوں کی طرف نہ نکالا جائے کیونکہ ہماری غالب اکثریت 'اچھے افراد' پر مشتمل ہے۔ یورپ سے میرے دوستوں نے وہاں کے میڈیا میں اسی طرح کی بھری ہوئی گھسی پٹی باتیں بطور مثال مجھے ای میل کیں۔ (۱)

مسلمان عملی طور پر پکار اٹھے ،'اے بی بی سی، ہم تمہاری نشریات سے متفق ہیں، ہم مانتے ہیں کہ اسلام میں ہی کچھ ٹیڑھا پن ہے ، آپ ہم سے مزید کیا چاہتے ہو؟ دیکھو روٹرز، ہم جہادیوں کی مذمت کیلئے باہر نکل آئے ہیں، جاؤ ہماری اس بات کا حوالہ دو۔ فوکس ، ہم تمہارے قدامت پسند دوستوں پر بحث کر رہے ہیں، اُن کی پیٹھ نہیں سلا رہے لہذا ہمیں ہمارے چوتڑ ڈھکنے (حیلہ تراشی) کا قصوروار نہ ٹھہراؤ۔

لیکن میں ہم مسلمانوں کو چوتڑ ڈھکنے (حیلہ تراشی) کا قصور وار ٹھہراؤنگی۔ اسلام کی حاشیہ بردار خامیوں کے بارے ہمارے تمام اعلانات کے باوجود مسلمانوں نے پورے دین سے ان خامیوں کو دور کرنے کیلئے کوئی بات

کرنے سے شعوری طور پر گریز کیا۔ ۔ جیسے اسلام کی بنیادات کو چھوا نہ جا سکتا ہو۔
گیارہ ستمبر کے دو ماہ بعد میں نے وہ کچھ کیا جو میں جانتی تھی اور جو میں کر سکتی تھی۔ میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں (مسلمانوں کو) اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دی تھی(۲)۔ بہرحال مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کو یہ عیاشی تو ہے کہ وہ ریاستی جبر کے خوف کے بغیر سخت سوالات اٹھا سکیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دو عمارتیں جو کنکری کی طرح ڈھینے کی مستحق نہ تھیں، اور (اسلام کی)وہ دو عمارتیں جو ڈھینے کی مستحق تھیں ، نے اطمینان بخش مگر تاحال اسلام کے نہ جانچنے والے حصہ کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا ، ایک عمارت کو آپ فریب کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو خام خیالی کا نام دے سکتے ہیں۔
فریب، میں نے اِس کی وضاحت یوں کی، کہ آج اسلام کے عمل کے ساتھ وابستہ گھمبیر مسئلے کی نشاندہی کرنے کی بجائے ہم نے لاشعوری طور پر اسلام کو رومانوی بنانا شروع کر دیا۔ ہمارا سارا زور یہی پیغام دینے میں رہا کہ ہم ’دہشت گرد نہیں ہیں‘۔۔یوں ہم نے سب سے

مشکل جہاد ،' خود احتسابی ' ،سے بچنے کیلئے اپنے آپ کو ورغلایا۔ اس سارے دباؤ پر ہتھیار ڈالنے کے بچکانہ انداز کی یہ حد تھی۔ اس سے بھی بڑی حد خام خیالی کی عمارت میں یہ لوٹنیاں لینا تھی کہ مغربی دنیا پر ہماری عزت کرنا انسانی طور پرواجب ہے لیکن ہم پر مغربی اقدار کی قدروقیمت کرنا واجب نہیں جو ہمیں عزت دینے کی بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ دیا کہ گیارہ ستمبر کے بعد ٹورونٹو سے تعلق رکھنے والی ایک مسلمان تنظیم نے کینیڈا کے سیاستدانوں سے اپیل کی کہ مسلمان مخالف کٹر پن کے خلاف بولا جائے۔ اس اپیل پر جن سیاستدانوں نے عمل کیا اُن میں کینیڈا کے ایک ہم جنس سیاستدان بھی تھے۔ میں نے لکھا کہ میں امید کرتی ہوں کہ یہ ہم جنس سیاستدان مسلمانوں سے بھی ویسے ہی ساتھ کی توقع کرسکتے ہیں کہ اگر کبھی کسی ہم جنس پرست کلب یا کتب خانے کو آگ لگائی گئی تو مسلمان بھی اُن کے حق میں بولیں گے۔

میں نے اپنے ساتھی مسلمانوں کیلئے اپنے نقطہ نظر کو اس طرح پیش کیا، کیا ہم مذہبی سطح پر ناپختہ ہیں کہ

الگ تھلگ رہنے اور اپنے مذہب پر پیروی کرنے کی توقعات کی زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں یا پھر کبھی ہم مکمل شہری کی صورت میں بالغ ہو سکیں گے ، اُس کثیر الثقافتی معاشرے کی تشریح اور تصورات کی حفاظت کیلئے جس کی بناء پر ہم اس مغربی دنیا میں اسلام پر عمل پیرا ہیں؟

جوابات کا سیلاب امنڈ آیا۔ غیر مسلمانوں نے مزید صاف گوئی کی تمنا کی۔ کچھ مسلمانوں نے بھی ایسی خواہش کا اظہارکیا ، تاہم مسلمانوں کی اکثریت نے ایسی خواہش ہرگز نہ کی۔ کچھ نے مجھے مدرسے سے نالاں صدمہ کار کہا اور کچھ نے میری ذاتی زندگی کی طرف اشارہ کیا ۔لیکن جہاں تک وہ صدمے کی بات کرتے رہے تو کیوں میں نے اتنے بڑے صدمے کے بارے ہلکی سی آواز بھی اِن مسلمانوں سے نہیں سنی جو چند با ایمان مسلمانوں نے گیارہ ستمبر کو پہنچایا۔ وہ اُس تباہی و بربادی کے حوالے سے ہمارے مذہب کے کردار کے بارے کیا کہیں گے؟ کچھ بھی نہیں۔ ۔ دوسرے مجھے تابک توڑ حملے کرنے کا قصوروار ٹھہراتے ہیں لیکن مجھے اصلی اسلام نے ٹھکرا دیا ہے۔ بے شک میں ٹھکرا دی گئی ہوں

لیکن میں اس پر ذرا بھی شرمندہ نہیں۔ مجھے ایک ایسے مرکزی دھارے کا حصہ بننے کی کوئی خواہش نہیں جو اخلاقی طور پر مفلوج اور دانشورانہ سطح پر انحطاط پذیر ہو۔(۳)

میں اگرچہ ہر خط پر مکالمہ نہ کرتی تھی۔ ایک مراسلہ نگار نے خاص طور پر مجھے بولنے پر ابھارا اور حالات کا گہری نظر سے جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ میری اسلام کے بارے پیش کی گئی ''پریشان کن تصویر کشی'' پر پریشان اس مسلمان شخص نے مجھے ایک انتہائی تعمیری پہلو کے بارے تعلیم دیتے ہوئے پوچھا، کیا میں اجتہاد کے بارے جانتی ہوں؟ جہاد نہیں اجتہاد (اُس نے حتکہ تلفظ میں بھی میری مدد کی)۔ اجتہاد۔۔ اُس نے مجھے بتایا، اسلام میں آزاد خیالی کی ایک روایت رہی ہے، جس کے بارے اُس کا دعویٰ تھا کہ اجتہاد ہر مسلمان عورت مرد، ہم جنس پرست یا مخالف جنس پرست، بوڑھے ،جوان کو عصری صورتحال کے مطابق اپنے مذہبی عمل کو ہم آہنگ بنانے کی اجازت فراہم کرتا ہے۔

اجتہاد۔۔ اسلام کی ایک روایت۔؟ آزاد سوچ کے متعلق؟

میں نے اپنے آپ کو کوسا (لفظی طور پر) ۔ اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے میں نے لفظ 'اجتہاد' کو بعد از مدرسہ کے زمانہ کے مطالعہ کے تناظر میں یاد کیا۔ لیکن یہ لفظ تو بغیر کسی استقبالیہ بگل کے میرے مطالعے میں آیا تھا، کسی انقلابی تصور کی بجائے ایک خشک سے مذہبی قانون کے طور پر۔ علاوہ ازیں، مجھے تو یہ تاثر بھی ملا تھا کہ صرف مذہبی کارپردارہی قرآن کی تشریح میں مشغول رہنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اجتہاد کے بارے سیکھتے ہوئے مجھے اس سوال نے بھی اکسایا: مذہبی کارپردار کون ہوتے ہیں؟ میرا مطلب تھا، کیا قرآن نے مذہبی عملے کی کوئی خاص نشانی رکھی ہوئی ہے؟ بالکل نہیں۔ کیا قرآن کا بے اختیار پھیلاؤ اپنے مواد کا خاص اور موقع و محل کی مناسبت سے تفہیم دینے کا انداز فراہم کرتا ہے؟ جی ہاں۔۔ لہذا کیا درحقیقت آزاد خیالی کا حق، اجتہاد کی روایت ہم سب کیلئے ہے؟ اس حق کو اپنے اوپر خود ہی ودیعت کرنے والے ، 'میرے فتوے پر عمل کرو' کہنے والے آیت اللہ اصل میں بدعتی و ملحد ہیں۔

معمول کے مطابق میں نے پھر اس موضوع پر پڑھنا،

کھوجنا اور علماء سے گفتگو کرنا شروع کر دیا۔ اجتہاد کو کس نے روایت بنایا؟ کہاں اس پر عمل ہوا اور وہ معاشرہ کیسا دکھائی دیتا تھا؟ میں نے اس صورتحال کا کھوج لگایا: کچھ جاننے کا جذبہ اسلام کے سنہری دور میں زندہ تھا، قریب عیسوی ۷۵۰ اور ۱۲۵۰ کے دوران۔ اسلامی سلطنت کے عین مرکز عراق میں عیسائی اور مسلمان یونانی فلسفہ کو ازسرنو اجاگر کرنے کیلئے ایک ساتھ تراجم کیا کرتے تھے۔

سپین میں مغربی دنیا تک اسلام کی پہنچ کے بعد مسلمانوں نے ایک تاریخ دان کے بقول یہودیوں کے ساتھ 'برداشت کی ثقافت' کو جنم دیا(۴)۔ اِن سب کمیونیٹیوں نے ہمیں ایک طرح سے عالمگیریت کے پیش رو دئیے جس سے ٹیکنالوجی، پیسے اور لوگوں کا باہم ملاپ ہوا۔ مسلمانوں نے غیر مسلمانوں کے ساتھ بھرپور انداز میں تجارت کی اور ایک ایسا نظام وضع کیا جس کے مطابق چیک مراکو میں لکھے جاتے تھے اور اُنہیں کیش شام میں کروایا جا سکتا تھا۔ تجارت کی اِس ریل پیل نے خیالات کی آپس میں آمدورفت کو بھی ممکن بنایا۔

مغربی تہذیب میں اسلام کی خدمات پر مجھے بھرپور

روشنی ڈالنے کی اجازت دیجئے (۵)۔ گٹار، کھانسی کا شربت۔ یونیورسٹی۔موقا کافی۔ الجبرا اور 'اولے' کی آواز کا تعارف، جس کی بنیاد 'اللہ' ہے (اس ضمن میں آپ دوتونبیوں والے ساز مراکاز کو بھی موردِالزام قرار دے سکتے ہیں)۔

اجتہاد کی روح اور آغاز تو اپنے ہی ہاتھوں میں تھی۔ جنوبی سپین کے شہر کورڈوبامیں ، مثال کے طور پر جنسی طور پر ایک انتہائی پُرکشش عورت ولادا نے ایک ادبی کیفے قائم کیا ہوا تھا(۶) جہاں لوگ خوابوں، شاعری اور قرآن کا ایک ساتھ تجزیہ کیا کرتے تھے۔ وہ اس پر بھی بحث کیا کرتے تھے کہ قرآن نے عورت اور مرد کو کیا قرار دیا ہوا ہے۔ وہ تو اس سوال پر بھی بحث کیا کرتے تھے کہ مرد کیا ہے اور عورت کیا ہے؟قرآن کی مختلف النوع اور فراخدل تشریحات نے ایسے دور کو جنم دیاتھا جب کوئی ہیجڑوں پراسلام کے اطلاق کی بھی بات کر سکتا تھا۔

اسی اثناء بغداد میں سلطنت کا مرکز جم گیا۔ یہاں پر اسلام کا خلیفہ بیٹھ گیا۔ چاہے انتخابات کے ذریعے یا پھر گلے کاٹ کر اور یا پھر اِن دونوں کے امتزاج سے،

خلیفاؤں نے پیغمبر اسلام کو مسلمانوں کے بڑھتے غول کی مذہبی رہنمائی کا حتمی رہنما مقرر کر لیا۔ بغداد میں نویں صدی کے خلیفہ المامون تھے جنہوں نے نام نہاد 'دانش کا ادارہ' قائم کیا(۷)۔ ٹمپل یونیورسٹی کے محمود ایوب کے بقول یہ ادارہ مغربی اور اسلامی دنیا میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ لیکن کورڈوبا کے ہمعصر وں کے خیالات کو کڑا قرار دے کر ختم نہ کیا گیا تھا۔ بغداد ستر لائبریریوں کا بھی گڑھ تھا۔ ہر ایک کیلئے ستر، آج کے مسلمان شہید کیلئے ستر حوریں جس کا اُسے وعدہ دلایا جاتا ہے۔ تب لائبرہریاں تھیں آج باکرہ حوریں۔۔ ترجیحات میں کیا تضاد آ گیا ہے، آپ اس بارے کچھ نہیں بولیں گے؟

یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے یہ فراخدلی کیسے پروان چڑھی تھی؟ یہ بات تہہ در تہہ ہے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ تحمل وبردباری نے اسلامی سلطنت بنانے اور اُسے قائم رکھنے میں بہترین کردار ادا کیا۔ اسی بات کو بنیاد بناتے ہوئے بہت سارے مسلمان فاتحین نے اس بنیادی اصول پر عمل کیا کہ اہلِ کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کو دین چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی شہنشاہیت کی حکمت عملی کا یہ اصول مسیحی شہنشاہیت کی نسبت کامیاب رہا۔ آئیے اس حقیقت کو بھی دیکھتے ہیں کہ کیتھولک کی صلیبی جنگوں نے یہودیوں اور بدعتی عیسائیوں کو اپنے مذہب کے مطابق عمل پیرا نہ ہونے دیا۔ مسلمانوں نے ایسا کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں غیر مسابقانہ علاقوں پر چڑھائی کے دوران مذہبی اقلیتوں سے کوئی مخالفت نہ ملی۔ لہذا مثال کے طور پر یہودیوں نے شادیانے بجائے جب مسلمانوں نے ۶۳۸ء میں یروشلم کو فتح کیا اور ڈیوڈ شہر کو بائی زینٹینز سے چھینا جس نے یہودیوں کے مقدس مقامات کو کوڑے کرکٹ ڈھیر کرنے کی جگہ کے طور پر استعمال کر کے بے حرمتی کی ہوئی تھی۔
مسلمان فاتحین نے اِن مقامات سے گندگی کو صاف کیا ور یہودی خاندانوں کو زیارت کیلئے دے دیا۔
بعد میں یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ تعاون ختم کرتے ہوئے ایک بار پھر کٹاؤ کر لیا اور مسلمانوں کے خلاف فوجی کارروائی کا ساتھ دیا۔ کٹر کیتھولک آقاؤں کے ہاتھوں ظلم و ستم کے شکار یہودیوں نے مراکو کے مسلمانوں سے التجا کی کہ انہیں آئبیرین پیننسولا لے کر

آزادی دلوائی جائے۔ ایک بے ڈھنگا سا اتحاد معرضِ وجود میں آیا۔ مسلمانوں نے پوپ کی فوج کی حیرت انگیز کارروائی کو پاش پاش کر کے یہودیوں کو آزادی دلوائی۔ یہودیوں کی اکٹھی کی ہوئی جاسوس معلومات کو بنیاد بنا کر مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں سپین کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ (اسی راستے سے مسلمانوں کے کمانڈر طارق بن زیاد نے پہاڑوں کے سلسلہ کو عبور کیا جس کا موجودہ نام جبرالٹر ہے (۸)۔ عربی زبان میں جبرالٹر کے معنی 'طارق کا پہاڑ' ہے، یہ بہت سارے 'اولے' میں سے 'اولے' کا پہلا موقع تھا۔

اس سلطنت کا اصل کارنامہ دولت کے انبار لگانا نہیں تھا بلکہ صلاحیتوں کو جمع کرنا تھا۔ یہ سلسلہ عربوں کیلئے دوگنا ہو گیا جو ایک تجزیہ نگار کی نظر میں جنگجو تھے منتظم نہ تھے (۹)۔ لیکن جنگجوؤں کے پاس اتنی ذہانت تھی کہ وہ آغاز سے آخر تک کی منصوبہ بندی کر سکیں۔ لہذا مسلمان گورنروں نے سلطنت کی بھاگ دوڑ چلانے کیلئے اپنے اپنے شعبوں کے ارفع صلاحیتوں کے لوگ فائز کئے۔ انہیں ادھر ادھر پھیلی ہوئی کمیونٹیوں کی نزاکتوں اور مسائل کو قابو میں

رکھنے کیلئے اپنے نائب درکار تھے۔ انہیں اپنے زمانے کے عالمی شہری چاہئے تھے۔ یہودیوں میں گھس کر دیکھئے اور بڑے تناظر میں دیکھئے۔ سپین سے عراق تک یہودی اعلیٰ سفارتکار، اعلیٰ فوجی حکام، عدالتوں کے اہلکاراور بینکار (آپ کوئی بھی اہم شعبہ دیکھ لیجئے) کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

مجھے یہ بھی دیکھنا پڑا کہ کیا یہودیوں نے بغداد کو اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بنانے کا قدرتی انتخاب کیاتھا۔ یہ تب ہوا جب سن ۷۰ء عیسوی میں اسرائیلی سلطنت کے زوال کے بعد یہودیوں کے جتھے نے تلمود کی تعلیمات کیلئے دنیا کا مشہور مرکز بغداد میں قائم کیا۔ جب مسلمان بغداد پہنچے تب یہ پرانا بابلیون کا شہر پہلے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ یہودی اشرافیہ سے بھرا پڑا تھا جن کو خلیفہ اپنی سلطنت کی مرکزی اسامیوں کیلئے استعمال کر سکتا تھا، جس کے نتیجہ میں بغداد کے ربیوں کیلئے اپنی تعلیمات کو سرعام دنیا بھر میں پھیلے یہودیوں تک پہنچانا آسان ہو گیا۔ اِن یہودیوں میں سے نوے فیصد مسلمان سلاطین کے زیر سایہ بس رہے تھے۔ (نویں اور دسویں صدی کے دوران یہودی سپین کی

آدھی آبادی پر مشتمل تھے(۱۰)۔) ایک یہودی عالم کے بقول، اُس زمانے میں اظہار آزای کی سہولت کے شکرگزار ہیں کہ ’ تلمود ی تعلیمات اور تورات کی تفاسیر یہودیوں کی زندگی میں مرکزی حیثیت اختیار کر گئیں‘۔ آپ کو اس مطابقت سے محبت کرنا ہو گی کہ اسلام نے جیسے ہی اپنے سنہری دور کا آغاز کیا اُس نے یہودیوں کی فراست سے اثرات قبول کئے۔ یہودیوں نے بھی مسلم عرب ثقافت سے اثر قبول کرتے ہوئے اپنی شاندار روایات قائم کیں۔ ہیبرو کی سیکولر شاعری شمعول ہا نجد کے قلم سے پھوٹی جو ربی اور شوقیہ رزمیہ گو تھے جنہوں نے دو مسلمان فرماں رواؤں کے دور میں سپین کی عدالتوں کے وزیراعظم کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اِن باتوں کو ہضم کرنے کیلئے اپنا وقت لیجئے۔

اس میں سے کوئی بات یہ ظاہر نہیں کرتی کہ اسلامی تمدن میں یہودیوں اور مسلمانوں میں بھائی چارہ بہت تھا۔ خدا کیلئے ایسا نہ سمجھئے۔ گیارھویں صدی کے بعد آنے والی سیاسی حکومتوں کے ظلم و جبر نے تحمل وبردباری کی فضا کو مٹا کر رکھ دیا۔ لیکن اس کے باوجود ثقافتی نفوذپذیری فوراً ختم نہیں ہو جاتی۔ تینوں

ابراہیمی مذاہب کو ماننے والوں نے ایک ساتھ زندگیاں بِتائیں، ازسرنو آباد ہوئے اور باہم شادیاں رچاتے رہے ، زبان سے لے کر فلسفوں کی داستانیں تک باہم مدغم ہوئیں۔

میں آپ کو بتاتی ہوں کس کا کام بھرپور توانا تھا۔ میں موسس بن مامون کی بات کر رہی ہوں جنہیں میمونائیڈز بھی کہتے ہیں جو ایک اعلیٰ مرتبہ یہودی فلسفی، ربی، طبیب اور ماہرِ مذہبیات تھے۔ اُن کا زیادہ تر کام عربی زبان میں شائع ہوا ہے۔ (اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریون نے دوپہر کے کھانے کے وقفوں کے دوران عربی سیکھی(۱۱) تاکہ وہ میمونائیڈز کے کام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔) اور ابھی تک میمونائیڈز روحانی طور پر زیادہ مشہور نہ تھے۔ وہ پہلے شخص ہونے کے ساتھ ساتھ جنہوں نے مذہبی قوانین کو عام یہودیوں کیلئے مرتب کیا (اپنی کتاب مشنہ توریٰ جو انہوں نے ہیبرو زبان میں لکھی) ، ایک اچھے ڈاکٹر بھی تھے جنہوں نے جیوش کلاسیک ’جنجال سے نکلنے کی گائیڈ‘ بھی لکھی۔ اس بات کا ادراک کرتے ہوئے کہ نت نئے خیالات کی جنونیت ذہنی الجھاؤ کا محرک بن سکتی ہے ،

میمونائیڈز نے چاہا کہ یہودی گونگے بہرے بنے بغیر روحانی اصولوں کو اپنائے رکھیں۔ اُن کی کتاب 'جنجال سے نکلنے کی گائیڈ' سے درج ذیل اقتباس اُن کی دانشورانہ دیانت کو ظاہر کرتا ہے۔ "یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اُس چیز کو پسند کرے جس سے وہ مانوس ہے اور جس کے ساتھ وہ پلا بڑھا ہے اور ہر اُس چیز سے ڈرتا ہے جو اُس کیلئے نامانوس ہو۔ ہمہ جہت مذاہب اور اُن کی ایک دوسرے کیلئے برداشت اس حقیقت کا نتیجہ ہے لوگ اُن تعلیمات کے ساتھ مخلص ہیں جو انہیں دی جاتی ہے (۱۲)۔"

اُن کے کام کو ایک چیز اور لائقِ اعتبار بناتی ہے کہ میمونائیڈز اُس ہنگامی دور میں زندہ تھے جب جھگڑالو مسلمانوں نے کورڈوبا پر قبضہ کر لیا تھاجو میمونائیڈز کی جائے پیدائش بھی تھا۔ عیسوی ۱۱۵۰ء کے قریب میمونائیڈز اور اُس کا خاندان شمالی افریقہ کو ہجرت کر گئے اور بعد میں مصر سے آج کے اسرائیل چلے گئے۔ مصر میں وہ صلاح الدین کی اعلیٰ کمان کے طبیب مقرر ہو گئے ، صلاح الدین مسلمان فوج کے وہ ہیرو تھے جنہوں نے پاپائے کلیسا کی یورش کے پہلے ہلے کو ناکام بنا دیا

تھا۔ اسلامی انتہا پسندی کی آمد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ، جو سپین سے ہوئی۔۔ اگر کہیں اور نہیں ہوئی تھی۔۔ میمونائیڈز اپنے مذہب یا تہذیب کی مطلقیت کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایسا نہ کیا۔ مصر میں انہوں نے طب کی پریکٹس جاری رکھی اور ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے رہے۔ وہ اپنے دروازے پر ہر وقت قطار میں کھڑے مریضوں کی نگہداشت کرتے رہے ، اپنی یہودی کمیونٹی کے ساتھ مطالعہ و تحقیق کاکام کرتے رہے اورانہوں نے دنیا کے وسیع تر مفاد کیلئے لکھا۔ ایسے لوگوں کا یہ ایک ایسا نہ رکنے والا تخلیقی وفور تھا جس نے سنہری دور کو جگمگایا ، اگرچہ یہ سنہری دور دھندلانا شروع ہو گیا تھا۔

میمونائیڈز کے ایک مسلمان ہمعصر تھے جو اُن سے نو سال بڑے تھے۔۔ فلسفی، طبیب، ریاضی دان اور کورڈوبا کے رہنے والے ابنِ رُشد (جو اپنے لاطینی نام ایوروس سے جانے جاتے ہیں)۔ سپین میں ابن رشد غوروفکر کی آزادی کے معمار تھے جسے میمونائیڈز نے دور مشرق تک بے مثل بنایا ہوا تھا ، مذہب پرستوں کا جرات کے ساتھ مقابلہ

کرتے ہوئے۔ ۔ مشرقِ وسطیٰ میں وحشی اسلام کی چڑھائی کے ساتھ ہی ابن رشد نے موقف اپنا لیا کہ ’فلسفی بہتر طور پر قرآن کی تمثیلی آیات کوسمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ اُن کی تربیت منطقی انداز میں ہوئی ہوتی ہے۔ ایسی کوئی مذہبی ہدایت نہیں کہ اِن آیات کی لفظی تشریح ہونی چاہئے (۱۳)۔‘ انہوں نے بات پر یہاں آمین پڑھ دی۔

اور کیوں یہاں پر بات ختم کر دی؟ اُس وقت کے کسی بھی یورپین دانشور، مسلمان یا کسی دوسرے سے زیادہ ابن رشد مرد اور عورت کی برابری کیلئے بولے۔ انہوں نے اپنے ایک تجزیہ میں کہا، ’’عورت کی صلاحیت کا ہمیں ابھی اندازہ ہی نہیں کیونکہ اُن کی تنزلی بچے کوجنم دینے، اُس کی پرورش کرنے اور چھاتیوں سے دودھ پلانے تک کر دی گئی ہے (۱۴)‘‘۔ انہوں نے زمانے کی تہذیب و تمدن کو متنبہ کرتے ہوئے پشین گوئی کی کہ عورت کو ’مرد پر بوجھ‘ سمجھنا ’غربت کی ایک وجہ‘ ہے۔ اس طرح کی جرات مندی کے سبب ابن رشد اعلیٰ مسلمان قیادت پر ایک ’بوجھ‘ بن گئے۔ اُس قیادت نے انہیں ملک بدر کر کے مراکش بھیج دیااور تیرھویں صدی سے کچھ

قبل ابن رشد مشکوک حالات میں مردہ پائے گئے۔
جب میں نے یہ جاننا شروع کیا کہ ابن رشد کے روشن دماغ کو کس چیز نے متاثر کیا تھا، میں نے تحقیق کا آغاز کیا کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ کیسے مسلم سپین آزاد خیالی کی جنت سے قدامت پرستی کی طرف ڈھلا؟ کب باقی اسلامی ریاستوں نے بھی غوروفکر پر پابندی لگائی؟ کیسے اسلام کے سنہری دور کے تابوت پر تالے پڑھے اور اس کا نتیجہ آج ہم سب کیلئے کیا نکلا؟
پہلے سب سے اہم باتیں سامنے آئیں۔ یہ معلوم ہوا کہ مسلم سپین مذہبی غارت گروں کے ہاتھوں اندھا ہو گیا۔ المتامد، سویلی کے مسلمان گورنر کو کیسل کے عیسائی بادشاہ کی دھمکیوں کے خلاف اپنی مملکت کو مستحکم کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ الفانسو کو دور رکھنے کیلئے المتامد کو مراکش کے المراود مسلمان آہنی بازوؤں کی مدد طلب کرنا پڑی۔ یہ تو سچ ہے کہ المراود نے الفانسو کی خوب خبر گیری کی لیکن بعد میں وہ مذہبی سچائی کی بنیاد پر آپے سے باہر ہو گئے جس کی المتامد کو بالکل توقع نہ تھی۔ المراود کو مسلم سپین کی آزادیوں سے نفرت تھی جو اُن کے خیال میں ناپاک تخلیقی رویہ

کا نتیجہ تھیں۔ وہ یہودیوں کو لائقِ حقارت جانتے تھے، عورتوں کی مذمت کرتے تھے، بحث و مباحثے سے کراہت محسوس کرتے تھے اور جنونی مذہبی اجارہ داری کو فرض گردانتے تھے۔ میری بات پر یقین کیجئے، ابن رشد کی جلاوطنی سے ان گرگٹوں کے عزم کا آغاز نہ ہوا۔ یہ قدامت پرست بہت آگے تک گئے۔ کیا آپ نے کبھی الغزالی کا نام سنا ہے؟ یہ بغداد میں مقیم ایک مفکر تھا جس نے روشن خیال مسلمان دانشوروں کو بے ربطی کا موجب ٹھہرایا، ایک ایسا موقف جس کے ساتھ المراود معانقہ کر سکتے تھے، مگر نہیں؟ بلکہ المراود نے الغزالی تک کو حد سے زیادہ لبرل قرار دیا، جنہوں نے اُس کے کام کو سرعام جلایا۔ انہوں نے مسلمان صوفیوں کی لگام کھینچی جو قرآن کو لفظی انداز میں پڑھنے کی بجائے بطور تمثیل پڑھا کرتے تھے۔

آپ کو بتاؤں کہ میں نے اس ساری داستان سے کیا اخذ کیا؟ مسلم سپین حریص عیسائیوں کی وجہ سے نہیں لڑکھڑایا۔ عیسائیوں نے یقینی طور پر اس کے حصے بخرے کئے لیکن وہ ظالم جنہوں نے مسلم سپین کو گرایا وہ مسلمان ہی تھے۔ اور آپ کو بتاؤں کہ اس ساری

داستان سے مجھے کیا سمجھ آئی؟ مسلمان یورپی نو آبادیت کے چھا جانے سے قبل ایک دوسرے کی آزادی پر مارشل لا مسلط کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ظلم و جبر روا رکھ رہے تھے۔

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہمارے مسائل کا آغاز گھٹیا صلیبی جنگوں سے نہیں ہوا۔ ہم خود ہی اپنے لئے مسائل کھڑے کرنے والے ہیں۔ آج تک مسلمان سفید آدمی کو وسیع پیمانے پر توجہ ہٹانے کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے وسیع پیمانے پر توجہ ہٹانے کی کوشش کہ ہم کبھی بھی محکوم ہونے کی حالت میں نہیں تھے، مغرب نے ہمیں محکوم بنایا۔

میں اس نقطہ کو بغداد کے ذکر کے بعد مزید بیان کرونگی۔ آپ کو نویں صدی کا خلیفہ المامون یاد ہے؟ اُس نے اسلام کے ایسے مسلک کو اپنایاجو عقلیت پسندی کو فروغ دیتا تھااور ہر اُس خیال سے پہلوتہی برتتا تھا کہ قرآن ایک الہامی منبع ہے۔ اِن سب سے بڑھ کر المامون کا مذہبی مسلک ہر شخص کی آزاد خیالی پر زور دیتا تھا۔ حیران کُن حد تک آزاد خیالی اور حقیقت پسندی کے انکاری افسران کی المامون نے عدالتی تحقیقات شروع

کیں ، جنہوں نے اُس کی اسلامی تشریح سے اختلاف کیا ، اُن میں سے کچھ کو کوڑے مارے گئے اور کچھ کو پابندِ سلاسل کیا گیا۔ المامون کا ایک جانشین تو ایسا تھا جس نے المامون کی اسلامی تعلیمات کو نہ ماننے والے کو سزائے موت سنادی(۱۵)۔اور کون تھا ، کیا مسلمان ہی اِن ظالمانہ کارروائیوں کے ذمہ دار نہ تھے ؟ کیا رومن چرچ ذمہ دار تھا؟ دوبارہ دیکھئے۔ یہودی ذمہ دار تھے؟ معاف کیجئے گا۔ ایم ٹی وی ذمہ دار تھا؟ بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ حساب لگائیے کون باقی بچتا ہے؟ تین دہائیوں پر مشتمل جبری ’ آزاد خیالی ‘ پہلے المامون کے دور میں جاری رہی پھر اُس کے ایک بھتیجے کے دور میں ۔۔ بعد میں ایک خلیفہ نے اس پالیسی کو بدل کر رکھ دیااور میدان ایک نئی پشت در پشت مذہبی حکمرانی کیلئے وسیع و عریض چھوڑ دیا۔ اس خلیفہ نے فرمان جاری کیا کہ اہلِ اسلام کو ’کیسے پوچھے بغیر‘قرآن کی ہر بات کو ماننا پڑے گا(۱۶)۔ قصہ مختصراً ہم یہ جاننے والے کون ہوتے ہیں کہ خدا نے کیسے خاص قوانین کو لاگو کیا کیونکہ ہم بُری طرح خود کو خدا کے ساتھ جوڑنے میں نااہل ہیں۔ نااہل ہیں اپنی ’اصل‘ کو

سمجھنے میں، ہم سری کرنے میں اور ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اُس کا ہر اتارا ہوا لفظ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس پر کاربند ہوں۔ ظاہر ہے ، ہر شخص اس پر کاربند نہ ہو سکا۔ ابن رشد اِس کی مثال تھے ، اُن کے ساتھ چند دیگر توہین کے مرتکب ہونے والے بھی تھے جنہوں نے اُس کی پیروی کی۔ تاحال اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ 'کیسے کے بارے نہ پوچھو' والی قدامت پرستی شادیانے بجا رہی ہے۔ اور یہ بڑھ چڑھ کر شادیانے بجا رہی ہے کیونکہ اَب اس کو سیاسی وابستگی بھی حاصل ہے۔ آزادانہ سوچنے کا جذبہ سلطنت کے کچھ گروہوں میں قائم رہا لیکن اجتہاد کی روایت کو قصداً نیست و نابود کر دیا گیا۔ آپ مجھ سے یہ پوچھنے میں بالکل نہ ہچکچائیے کہ یہ کیسے ہوا ۔

اس کا جواب دینے کیلئے مجھے وہ منظر نامہ پیش کرنا ہو گا کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے اندر اس بات پر قبائلی و خاندانی عداوتیں ہوئیں کہ کون عیسوی ۶۳۲ء میں پیغمبر کا جانشین ہے۔ کچھ نے اُن کے جوان داماد اور چچیرا زاد بھائی علی پر زور دیا۔ زیادہ مسلمانوں

نے محمد کے پرانے ساتھی ابوبکر پر مہر تصدیق ثبت کی۔ اِن خون آشام فسادات نے اسلام کو فرقہ بندی کی صورت سے دوچار کر دیا۔ شیعہ(علی کو چاہنے والے) سنیوں کی اکثریت (سنہ یعنی پیغمبر کی روایات پر چلنے والوں) سے الگ ہو گئے۔ آئندہ قریب ۲۷۵ برسوں تک یہ فرقہ بندی اندر ہی اندر لاوے کی طرح کھولتی رہی۔ یہ لاوا عیسوی ۹۰۹ء میں شدت کے ساتھ پھٹ پڑاجب شیعوں کے ایک بکھرے ہوئے گروہ نے سنیوں کی سلطنت میں اپنی الگ حکومت کا اعلان کر دیا۔ شیعوں کے آناً فاناً اعلان نے مسلم سپین کے حاکم کو موقع دیا کہ وہ اپنے مخالفین پر 'اہلِ ایمان کا کمانڈر' ہونے کا دعویٰ کریں، قصہ مختصراً اُس نے خود کو خلیفہ بنا لیا۔ اس دوران ایسی افراتفری مچی کہ بغداد کی سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔

آئندہ کچھ نسلوں تک بغداد ایک چیز کو بند کرنے پر مامور ہو گیا۔۔ اجتہاد کی راہیں اور جس کے نتیجہ میں آزاد فکری کی روایت بھی ختم ہو گئی۔ دنیا بھر کی مسلم اقوام کو نفاق سے بچانے کے بھیس میں بغداد کی اشیرباد کے حامل علماء نے اسلام میں مباحث کو منجمد

کرنے کا مشترکہ لائحہ عمل تشکیل دیا۔ اِن علماء کو اپنے سرپرستوں کی مکمل اعانت حاصل تھی اور یہ علما تب خوشی کے گیت آزادی کے ساتھ چھچھا نہیں سکتے تھے جب اُن کے آقا المیہ گیت سننا چاہتے تھے۔ لہذا اُن کے سیاسی محرکات کے تناظر میں مسلمان ہر اُس بات کو پہلے سے جانتے تھے جو اصل میں وہ جاننا چاہ رہے ہوتے تھے۔ اگر کسی کو کوئی نیا سوال درپیش ہوا؟ تب سنی فرقہ کے چار موجود مسالک اس سوال کا جواب دے سکتے تھے۔ ان مسالک کو ایسے نت نئے سوالات کبھی درپیش ہوئے تھے جو آپ کو ہوئے ہوں؟ تب یہ پرانی آیات سے علامتیں بیان کرتے ہیں۔ کسی قسم کے موجد کو برداشت نہیں کیا جائیگا۔

ہم آج اکیسویں صدی میں ایک ہزار سال پرانی حکمت عملی کے مضمرات میں سلطنت کو گرنے سے بچانے کی خاطر جی رہے ہیں۔ مگر میرے پاس آپ کیلئے ایک خبر ہے، اُس اسلامی سلطنت کا اب کوئی وجود نہیں ہے۔ میں دوبارہ دہراتی ہوں، اسلامی سلطنت گئی۔ ہم آج کی دنیا میں زندہ ہیں۔ اور اجتہاد کی راہیں، ہمارے اذہان بہت سارے معاملات میں بند ہو گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟

کیوں ’سچے‘ مسلمان اپنی ذہنی صلاحیتوں کو ختم کرتے جا رہے ہیں جب کچھ نہ سوچنے کا طے شدہ قانون ، عراق سے سپین تک مسلمان دھرتیوں کی بقاء کو قائم رکھنے والا۔۔ کیوں کانوں کو پھاڑ دینے والا تصفیہ طلب مسئلہ بنا ہوا ہے۔ میرے دوستو، اپنے سروں کو ہلائیے۔ اس سلطانی حکمت عملی نے جو واحد کامیابی حاصل کی تھی وہ مسلمانوں پر مسلمانوں کے ہٹیل ظلم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا، تفہیم کو پابندِ سلاسل کرنا تھا۔

مجھے مزید واضح کرنے دیجئے۔ جیسے ہی اجتہاد کے دروازے بند ہوئے، سوچنے کا حق مفتی کا استحقاق بن گیا۔ مفتی جسے ہم وکیل مولوی کا نام دے سکتے ہیں جو ہر شہر اور ملک میں پائے جاتے ہیں۔ ’’آج کے زمانے میں‘‘، محمود ایوب کا کہنا ہے، جو مفتی حضرات ’قانونی آراء جاری کرتے ہیں‘ اُن کو فتویٰ کہتے ہیں، جو اُن کے مسلک کے اصولوں کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ معروف فتوؤں کے مجموعے کو بھی اکٹھا کیا گیا ہے جو نسبتاً کمتر تخلیقی یا کمتر صلاحیتی مفتی صاحبان کیلئے ایک رہنما کتابچے کے طور پر کام آتا ہے (۱۷)۔ کمتر تخلیقی؟

کمتر صلاحیتی؟ کس سے؟ آپ سے یا مجھ سے؟ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہی کیوں ہے؟ اُن کے ایک دوسرے کے بارے فیصلوں کی وضاحتوں کی تعبیریں کرنے کی بجائے ہم اجتہاد کے دروازوں کو خود کیوں نہیں کھڑکھڑاتے اور اُن پر پڑے قفل کیوں توڑ نہیں ڈالتے؟

ایک اور مثال دیکھئے، ہم بیکار کی چیزوں سے کیسے ارادت مندی کر لیتے ہیں جیسے شریعہ کا قانون۔۔ مجھے یہی بتایا گیا کہ شریعہ میں اسلام کی اعلیٰ قدروں کی ترجمانی ہے، بہت سارے مسلمان شریعہ کو انتہائی مقدس جانتے ہیں۔ اوئے ہوئے۔۔' شریعہ کا انبار'، ایڈووکیٹ ضیاء الدین سردار لکھتے ہیں، 'سابقہ ججوں کی آراء کے علاوہ کچھ بھی نہیں'۔ دوسرے لفظوں میں شریعہ کا سنی فرقہ کے چاروں مسالک سے متعلق ہے۔ شریعہ کو اسلامی سلطنت کے دنوں میں تیار کیا گیا، تب سے اب اس کے فیصلوں کا انطباق کیا گیا۔ 'یہی وجہ ہے'، سردار کہتے ہیں، 'جب کبھی بھی شریعہ کو نافذ کیا جاتا ہے۔۔یہ اپنے اُس وقت کے سیاق و سباق کے مطابق نہیں جب اُسے تشکیل دیا گیا اور جب یہ ہم تک

پہنچی ۔۔۔مسلمان معاشرے قرونِ وسطیٰ کے زمانے کو اپنانا چاہتے ہیں'۔ ہم یہ صورت سعودی عرب میں دیکھتے ہیں ، ایران میں، سوڈان میں اور افغانستان میں جب یہ طالبان کے ماتحت تھا(۱۸)۔

یہاں تک کہ جہاں شریعہ کا نفاذ نہیں ہوتا وہاں بھی اُس کی پیروی ہو رہی ہوتی ہے۔ حال ہی میں فلسطین میں طلباء نے دوسری منزل پر واقع اپنے کلاس روم کی کھڑکی سے ایک استاد کو نیچے پھینک دیا۔ اُس کا جرم کیا تھا(۱۹)؟ ابتدائے اسلام کی تاریخ کی توضیع کرنا۔ وہ بچ گیا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ فلسطین تحقیق کو اس طرح حقارت کے ساتھ رد کر کے اپنی آبادی کی دانش کو بچا سکیں گے۔ اور اُس کے بعد چیچن حامیوں کی ایک ویب سائٹ ملاحظہ فرمائیں(۲۰)جو شریعہ کی پیروی کو ذرا اور فخر کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ ویب سائٹ میمونائیڈز کے ارفعٰ کام کو گالی دینے کے انداز میں کتابچہ ''قیدیوں کو مارنے کی الجھن کے حوالے سے ایک گائیڈ'' پیش کرتی ہے۔ میرے ذہنی سلجھاؤ کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں جب مجھے(اس ویب سائٹ کی وساطت سے) یہ معلوم ہوا کہ

کافروں کو مارنے (بلاشبہ، یقینی) کی اجازت ہے۔ ۔جب تک کہ امام یا اُس کا نائب اُس کو بخش دینے کا فیصلہ نہ دے دیں۔ اُف، کم ازکم اَب مجھے اس مسئلہ کے بارے سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جب میں نے یہ جاننا چاہا کہ پیروی اسلام کی قدر کیسے بنی تب میں ایک اور سوچ کے جنجال میں پڑ گئی۔ اگر ہمیں پیروی ہی کرنا ہے تب ہم ظلم واستبداد کی بجائے تحمل و بردباری کی کیوں نہیں کرتے؟ کیا ہمارے ہاں نقل کرنے کی کوئی صحتمند مثال نہیں ۔۔ اخ۔۔پیروی ۔۔ جس طرح مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ اسلام کے سنہری دور میں سلوک کیا؟ تب کیوں ہماری اکثریت غیر مسلموں کیلئے صاف نظر آنے والے زہریلے احساس کے کنویں میں گر گئی ہے؟

اِن سولات کے جواب میں مجھے اُس سے بھی زیادہ ملا جو میں نے کوشش کی تھی۔ کیونکہ میں نے جس طرح ٹٹولا مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی یہودیوں اور عیسائیوں کیلئے برداشت ہمیشہ ہی نازک اندام رہی ہے۔ سنہری دور میں یہ برداشت حقارت کے نچلے درجے پر تھی، قبولیت کی سطح پر نہ تھی۔

مصر میں پیدا ہونے والی ایک یورپین اسکالر نے میرے اس خواب آلود تصور کہ مسلمانوں نے تاریخی طور پر 'دوسروں' کے ساتھ کیا سلوک کیا، پر گڑھوں ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ بیٹ یی یور اس یورپین سکالر کا نام ہے۔ یہ اُن کا قلمی نام ہے جو انہوں نے اس لئے اپنایا کہ وہ جو دلیلیں دیتی ہیں وہ مسلمانوں کو برافروختگی کے دوروں میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ یی یور نے یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف نظریہ اسلام کی جملہ منافرت کو بیان کرنے کیلئے لفظ 'حصار (حفاظت)' کوہررُخ سے پیش کیا ہے (۲۱)۔ 'کیوں 'حفاظت'؟ یہ لفظ 'حصار' سے نکلا ہے ، اُن لوگوں کیلئے عربی کی اصطلاح جو اہلِ کتاب ہیں۔۔ جن کی مسلمان معاشروں میں حفاظت اُن کا استحقاق ہے۔

حفاظت؟ آئیے ہم اس اصول کی تہہ تک جاتے ہیں۔ کیوں یہودیوں اور عیسائیوں کو مخصوص حفاظت کی ضرورت تھی اگر وہ الکتاب سے تعلق رکھنے والے ہمارے جیسے ہی لوگ تھے ، وہ مسلمانوں جیسے حقوق اور فرائض کے مستحق تھے؟ یہ ایک مسئلہ تھا۔ مسلمان معاشروں میں یہودیوں اور عیسائیوں (کسی ایک کو الگ کر کے بھی

دیکھ لیجئے) کو عزت نفس کے شعبہ میں برابری کے سلوک کے ضمن میں مشکل دور کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کی وضاحت: تاریخ میں رقم ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میںیہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی حفاظت خریدنا پڑی، ایک خاص طرح کے لازمی ٹیکس کو ادا کرنے کی صورت میں، جو انہیں اپنی زندگیاں بچانے کی خاطر ہر صورت ادا کرنا ہوتا تھا ۔۔ اس ٹیکس کو جزیہ کا نام دیا گیا اور قرآن بقائے امن کی خاطر اس ٹیکس کو لاگو کرتا ہے۔ کیا یہ عزت نفس کو بھڑکانے والی بات نہیں؟ جی ہاں، پیغمبر محمد نے ثابت کیا کہ لوگ یہاں پر بھی اپنی مرضی سے کام لے سکتے ہیں۔ جب امن عامہ کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا، انہوں نے اس ٹیکس کو لاگو نہ کیا۔ پھر بھی اس ٹیکس کو رکھنے کی محض ضرورت مجھے ''بلیک میلنگ'' نظر آتی ہے۔ لیکن یی یور کی تحقیق نے اس الزام کی توضیع کی ہے۔ اِن باتوں پر غور کیجئے جب پیغمبر نے یہودی کسانوں کے ایک گروہ کو تب حکم دیا جب اُن کی فصلوں کے ذخائر کو پیغمبر کے فوجیوں نے مدینہ کے شمال میں خیبر کے مقام پرلوٹ لیا تھا۔ وہ لکھتی ہیں ، ''پیغمبر نے یہودیوں کو اُن کی

زمینوں میں کاشت کاری کی اجازت دی تھی لیکن فقط مزارع کی حیثیت سے (۲۲) ۔ انہوں نے آدھی فصل کی پہنچ کا مطالبہ کیا تھااور یہ حق اپنے پاس رکھا تھا کہ وہ جب چاہیں انہیں نکال باہر کریں۔“ یہاں پر میں پیغمبر پر تنقید نہیں کرنا چاہ رہی بلکہ صرف اسلام کی اصل ریاستی سیاست جو انہوں نے اپنائی ، بیان کر رہی ہوں۔

یہ بتانا عین انصاف کا تقاضہ ہے کہ دیگر تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ پیغمبر نے یہودی ہمسایوں کیلئے لائق مداح انداز میں تحمل و بردباری کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو یہودیوں کے مقدس روزے کے دن کے موقع پر اُن کا ساتھ دینے کی تلقین کی۔ انہوں نے مسلمانوں کی باجماعت نمازوں کا جمعہ کے روز سے ، جو یہودیوں کے سباتھ کے آغاز کا روز ہے ، آغاز کیا۔ انہوں نے اصل میں یروشلم کوقبلہ ٹھہرایا نہ کہ مکہ کو۔ کیا اچھا تاثر تھا۔ لیکن ہمیں اس سوال کو بھی کریدنا ہے : کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اپنے زمانے کے ایک عظیم سیاستدان کافقط تاثر ہی تھا اور اُن کا ضرورت سے زیادہ اصرار اسلام کے اندر مخفی کسی مہلک شے سے ہماری توجہ

ہٹانا تھا۔

میں اس سوال پر ایک اچھے مقصد کیلئے زور دے رہی ہوں۔ ایک پریشان کن اور فیصلہ کن دستاویز سامنے آئی، یہ پیغمبر کی وفات کے زیادہ برسوں بعد کا واقعہ نہیں۔ یہ فرمان جاری ہوا کہ غیر مسلمان کھڑے ہو جائیں گے جب مسلمان بیٹھنا چاہیں گے اور یہ کہ غیر مسلمان اپنی عبادت گاہوں کی مرمت یا بدلی نہیں کرائیں گے ، یوں وہ اپنی عبادت گاہوں کو گلتے سڑتے دیکھیں۔ عدالت میں مسلمانوں کے احکامِ پاک کی غیر مسلمانوں کیلئے یہ کارگزاری تھی۔ اَب آپ کو وحشت انگیز صورت معلوم ہوئی۔ اس دستاویز کو 'معاہدہ عمر' کا نام دیا گیا۔ عمر کون تھے ؟ پیغمبر محمد کے دوسرے خلیفہ۔۔ میں نے جو پڑھا ہے اُن کے مطابق ہر لحاظ سے ایک نفیس اور مفکر ساتھی ۔۔ یہ ایک معمہ ہے کہ اس طرح کے مسلسل فوق البشر واجب التعمیل احکامات کے ضمن میں اُن کا نام کیوں وابستہ (یا بدنام)کیا جا رہا ہے ۔ اور اس کا یہ حصہ واضح نہیں، اس لئے دوبارہ یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیوں مسلمانوں نے نابردباری کو بردباری پر معاہدہ عمر کے تحت فوقیت دی؟ میں نے اس کو 'معاہدہ' کا نام خود

دیا ہے تاکہ اس سوال کو اپنے ’ریڈار‘ پر رکھوں۔
اب میں آپ کو بتا سکتی ہوں کہ معاہدہ عمر کا شروع اسلام میں بہت برا تاثر پڑا اور بات بہت آگے تک بڑھی۔ نویں صدی کے اختتام پر ایک معروف ماہر قانون نے اس معاہدہ کو بنیاد بناتے ہوئے مسلمان گورنروں کو تجویز دی کہ وہ غیرمسلمانوں کے ساتھ اس کے مطابق سلوک کریں۔ اُس عالم نے ایک گرما گرم معاہدے کا نقشہ کھینچ دیا۔ اس معاہدے کی یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے کچھ شرائط پر نظر ڈالئے (۲۳)۔

*تم مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہوئے گلی کے درمیان میں کھڑے نہیں ہو سکتے ا ور مارکیٹ کی نشستوں پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ۔۔

* تمہیں خود کو اپنی کاٹھیوں اور زینوں سے مختلف دکھائی دینا ہو گا۔ ۔۔

*تمہیں سر پر اوڑھنے والے صافے پر اپنا ’مارکا‘ لگا کر خود کو جدا کرنا ہو گا۔۔۔

*تمہیں اپنے کپڑوں کے گرداگرد پیٹی باندھنا ہو گی، اپنے جبے اور دیگر کپڑوں کے اوپر بھی تاکہ یہ پیٹیاں کپڑوں کے اندر چھپی ہوئی نہ ہوں۔

استعمار پسندی، اس کے علاج کیا ہے؟ یونیورسٹی آف ورجینیا کے پروفیسر عبدل عزیز ساجیدینا کا اعتراف ہے کہ ان پابندیوں کو مسلمان قانون دانوں اور ججوں نے جبراً لاگو کیا بطور' الوہی نازل ہونے والے نظام کی نسلی منافرت پر مبنی شقوں' کی صورت(۲۴)۔۔ نسلی منافرت۔ الوہی عنایت۔ نظام۔ اگر آپ کو اس سارے سلسلہ میں کوئی دوسرا لفظ نہیں سوجھتا تو لفظ نظام پر ذرا دیر کیلئے رک جائیے۔ یہ آپ کو گٹھ جوڑ کے پورے کلچر کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ جس کا نام ڈمی ٹیوڈ ہے۔ اسلام کے سنہری دور کے پانچ سو سالہ عرصہ کے دوران معاہدہ عمر تمام کتابوں میں موجود رہا ، جس کی بناء پر مسلمانوں کی بردباری کا حال نازک ہی رہا جس کا اشارہ میں نے پہلے دیا تھا۔ مجھے اس پر مزید روشنی ڈالنے دیجئے: بہت سارے یہودی اور عیسائی اپنے آپ کو گومگو کی حالت میں دیکھتے رہے۔ وہ نرم خوئی سے کام لیتے ہوئے مسلمان گورنروں کو اس مسئلہ پر عوامی رائے لینے کی درخواست کر سکتے تھے ، اس معاملے میں گورنروں کے ناراض ہونے کا خدشہ تھا، لیکن اگر مسلمان حاکم عوامی رائے لینے پر آمادہ ہوجاتے تب

بھی غیرمسلمانوں پرمعاہدہ عمر کی شان کی خلاف ورزی کرنے پر قہر ٹوٹ پڑنے کا خدشہ تھا۔ اس صورت میں اُن کے خاندانوں اور کمیونٹیوں کو قیمت چکانا پڑتی۔

میں آپ کو شموئیل ہا نجد اور اُن کے بیٹے کی مثال دینا چاہتی ہوں۔شموئیل کے بارے آپ کو یاد ہو گا کہ وہ سپین میں دو مسلمان بادشاہوں کے وزیراعظم رہ چکے ہیں۔ ایک بھاری بھرکم تخلیقی شخصیت، شاعر، فوجی کمانڈر اور عالم دین ہونے کے باوجود انہیں امتیازی نشان کو نمائش کے طور پر آویزاں کرنا پڑا۔ ہیبرو یونین کالج کے مجلہ ریوون فائرسٹون نے اس واقعہ کو شائع کیا،

’’جب شموئیل کا ۱۰۵۵ء میں انتقال ہوا، اُن کے بیٹے یوسف کو اُن کی جگہ اُن کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا(۲۵)۔ اگرچہ وہ اپنے باپ کی طرح قابل تھا مگر وہ خودسرتھا اور اس طرح کی چیزوں کو ناپسند کرتاتھا۔ اُس کے ’دبے‘ رہنے والے رویے کے فقدان کے سبب اُسے تنزلی کا سامنا کرنا پڑا اور آخرکار ۱۰۶۶ء میں اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور گریناڈا کی یہودی کمیونٹی کا قتل عام ہوا۔ تکنیکی طور پر یوسف اور اُس

کے باپ دونوں نے مسلمانوں پر بااختیار ہو کر،بڑے عوامی عہدوں کو قبول کرنے کی شکل میں، ’معاہدہ‘کو توڑاتھا ۔ اس حقیقت کو تب تک نظر انداز کیا جاتا رہاجب تک شموئیل نے اپنے ساتھ عاجزی کے رویے کی مثال قائم رکھی، تب تک بادشاہت مجموعی طور پر اِن کے ساتھ رضا وراضی رہی۔ تاہم جب تناؤ نے جنم لیا اور یوسف نے اپنی ذات کی تحقیر کرنے سے انکار کر دیا تب اُس نے ’ڈھیما (حصار)‘ کی خلاف ورزی کی، اُس کو بھی مار دیا گیا اور اُس کی کمیونٹی کو بھی تباہ و برباد کر دیا گیا۔

اس کے باوجود مجلہ فائرسٹون اپنے قارئین کو ’’اسلام کے زیرسایہ یہودیوں کے بڑے عہدوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کی نسبتاً بہتر صورتحال کے متعلق‘‘، بات نظرانداز کرنے کا نہیں کہتا(۲۶)۔ بہت سارے (یہودی) دانشور اُن سے متفق ہیں۔ ایک پروفیسر نے تو اس بات کی طرف بھی اشارہ کیاکہ قرون وسطیٰ کی مسلمان عرب دنیا میں یہودی ہمسایوں کے ساتھ کلنک کے ٹیکے جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھاجبکہ عیسائی یورپ میں گرجا فعال سطح پر عیسائیوں اور یہودیوں کے باہم تعلق

کی حوصلہ شکنی اس طرح کرتا تھا کہ چرچ نے یہودیوں کو محدود علاقوں میں رہنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ 'یہودیوں کا علاقہ' یا ' فقط یہودیوں کی گلیاں'، عیسائیوں کے ذہنوں میں شبے اور دہشت کو عام کیا گیا تھا(۲۷)۔ (فائر سٹون میں) اسکالرز کا یہ نقطہ نظر بھی تھا، اِدھر اُدھر چند قتل عام کی وجہ سے اسلام کو موردِ الزام نہ ٹھہراؤ۔ اس کی بجائے صورتحال کا قرونِ وسطیٰ کے عیسائی دور سے موازنہ کیا جائے جس کا مقصد یہودیت کا مکمل خاتمہ نظر آتا تھا۔

میں توازن کے خیال سے اس دلیل کو مان لیتی ہوں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ توازن کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات پر بھی زور دیتی ہوں کہ ہمیں اُن مانوس ذکی الحس طریقوں کو بھی معمولی گرداننا نہیں چاہئے جو معاہدہ عمر میں اپنائے گئے ہیں۔ شمالی افریقہ میں یہودی اور عیسائی اپنے کندھوں پر سور اور بندروں کی تصویروں سے مزین بلے لگاتے تھے۔ انہیں یہ علامتیں اپنے گھروں کے دروازوں کے باہر بھی آویزاں کرنا ہوتی تھیں۔ بغداد، اسلام کے دانش کدے میں 'ڈھمی' لوگوں کواپنے پہننے والے کپڑوں پر پیلے رنگ کے نشانات لگانا ہوتے تھے، ویسا

نشان نازیوں نے دوبارہ نکالا تھا۔ مجھے توقع ہے کہ اِن تفصیلات نے آپ کوبات سجھانا شروع کر دی ہو گی۔ انہوں نے میری بھی اسی طرح مدد کی۔ مجھے یہ بات سمجھ آنا شروع ہو گئی کہ کیسے اسلام ایک الگ تھلگ دین کی صورت اختیار کرتا گیا اور اکثر اوقات حقارت کا اظہار کرنے والے دین کے طور پر۔ اگر کوئی سوچ بچار پر پابندی کو نسلی منافرت کے طویل عرصہ پر مبنی عمل کے ساتھ ملائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ تقلید اور نارواداری رویہ۔۔ اِن سب سے اوپر آپ کو نارواداری کی تقلید حاصل ہو گی۔

’یہاں پر رک جاؤ!‘ آپ میں سے کچھ دہاڑیں گے۔ ’کتنی بار مجھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مجھے یہودیوں اور عیسائیوں کی تذلیل بالکل پسند نہیں؟ میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے شہر میں پیلے ستاروں کے بلے لگا کر پھریں، اوکے؟تمام مسلمانوں پر ’نارواداری کی تقلید‘ کا نفاذ نہ کیجئے۔ ’براہِ مہربانی‘۔ لیکن نارواداری کی تقلید پیلے بلوں سے بھی بہت نیچے تک جاتی ہے۔ میں کسی ایسے مسلمان کو نہیں جانتی جو اس نظام سے مکمل طور پر ماورا ہو جو اس نارواداری کی تقلید

کی اعانت کرتا ہے۔
جیسا کہ میں دروں بینی کی دعوت دے رہی ہوں۔ میں آپ کو اپنی مثال دونگی۔ میں کتوں سے خوفزدہ ماحول میں پلی بڑھی کیونکہ اسلام نے مجھے تعلیم دی کہ کتے گندی مخلوق ہیں۔ اگر تمہیں اِن کو چوکیدار کی حیثیت سے رکھنے کی ضرورت ہے تو اپنے ناک بند رکھو۔ کسی حالت میں بھی تمہیں اِن پر ہاتھ نہیں پھیرنا چاہئے اور صرف ان کو پالتو جانور سمجھو۔ اور کالے کتے؟ وہ تو صاف اور خالص مافوق الفطرت شے ہیں۔ میں اچھا خاصہ اپنے بیسویں کے عشرے میں تھی جب میں نے پہلی بار کتے کو چھوا اس توقع کے بغیرکہ میں خدا کی حدود کو کاٹ نہیں رہی۔
اس بات کا ناروا داری کی تقلید سے ٹھیک ٹھاک تعلق ہے۔ احادیث ۔۔ جو پیغمبر محمد کے اقوال اور عملیات کی تفصیلات ہیں۔۔ میں کالے کتوں کا تمام تر تذکرہ عورتوں اور یہودیوں کی کم حیثیت کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ اگر ہم معروضی نہ ہوں تو یہ احادیث کالے کتوں کو 'دوسروں' کے ساتھ حاشیہ بردار کر کے دشنام طرازی کرتے ہوئے لعنت بھیجتی ہیں۔ اگر ہم احادیث کے بارے سوالات نہ

اٹھائیں اور تعصب کی نوعیت کے بارے اپنی آنکھیں نہ کھولیں تب ہم آسانی سے اُس نظام کو متعارف کرا سکتے ہیں جو خدا کی کروڑوں مخلوقات کو کمتر درجہ دے حتکہ ماورائے فطرت مخلوقات کو بھی۔

کیا یہ نظام پاگلانہ نہیں ہو گا، کیا ایسا نہیں؟ مگر اس کے عواقب یہی ہیں۔ یوسی ایل اے کے پروفیسر برائے اسلامی قانون خالد ابو الفدل کا تجربہ سنئے۔ وہ ایک نومسلم کو جانتے ہیں جس کو ملا نے حکم دیا کہ وہ اپنے پالتو کتے کو کھائی میں پھینک دے۔ اس نومسلم نے دیکھا کہ وہ کتے کو جہاں بھی چھوڑ آتا ہے وہ دوبارہ اُس کی دہلیز پر مڑ آتا ہے۔ اُس شخص نے ملا سے پوچھا کہ اس کتے کا کیا کروں جو جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔

اس کو بھوکا چھوڑ دو، ملا نے جواب دیا۔

جب الفدل نے یہ بے رحمانہ کہانی سنی، وہ سرکشی پر اُتر آئے۔ کویت میں پیدا ہونے والے اور مصرسے اسلامی قانون کے تعلیمیافتہ عالم اصل حوالوں اور ابتدائی تفاسیر میں یہ جاننے کیلئے مستغرق ہو گئے کہ ملا کے پاس یہ بات کہنے کیلئے کوئی ٹھوس بنیاد ہے؟ اور انہوں

نے تب یہ دریافت کیا کہ کیسے کتے، عورتیں اور یہودی گھٹیا انداز میں ایک ساتھ کمتر سمجھے جاتے ہیں(۲۸)، پیغمبر محمد نے ایسا نہیں کہا، وہ تو بظاہر کتوں کی موجودگی میں نماز پڑھنے کی اجازت دے کر کتوں کیلئے اچھی مثال چھوڑ رہے تھے لیکن بعد کے اسلامی دانشوروں کا یہ کیا دھرا ہے۔ شریعہ لاء کی تشکیل کی طرح، کتوں (یہودیوں اور عورتوں) کی تذلیل کا انتخاب بھی کیا جا سکتا تھا۔ خدا نے اس کا انتخاب نہیں کیا، خدا کے اوتاروں نے اس کا انتخاب کیا۔ ہم میں سے اکثر ان چیزوں کو اپنی زندگیوں کیلئے مول لیتے ہیں لیکن ہمیں اس میں سے کسی چیز کو اپنانا نہیں ہے۔ الفدل اور اُن کی بیوی گریس نے تین بے یارومددگار پلوں کو گود لیا ہوا ہے، اُن میں سے ایک کالے رنگ کا ہے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ گریس اکثر گھر میں امامت کرا رہی ہوتی ہیں۔ اجتہاد کا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے خالق کی محبت کو انسانی قوانین پر حاوی رکھا ہے۔

دیکھئے، ہمیں اجتہاد کے جذبے کا مظاہرہ کرنے کیلئے انعام یافتہ دانشور ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں ضرورت ہے اسلام کے بارے اپنے سوالات کو کھل کر بیان

کر دینے کی۔۔ اور ہم سب کے پاس سوالات ہیں جو ہمارے تحت الشعور کے نہاں خانے میں چھپے بیٹھے ہیں۔ گاہے گاہے ہم نے اپنے سوالات پر عمل بھی کیا ہے۔ بزدلی کی بات ہے۔ بہت زیادہ بزدلی کی بات ہے۔ مصر میں ایک سو سال قبل مارکسزم، لادینیت اور نظریہ ارتقاء پر مباحثے منعقدہوئے ۔ ایک محقق کے مطابق قریب پچاس روزنامے اور دوسو ہفتہ وار مجلے ایک بار مفت تقسیم ہوئے جس میں والٹئیر جیسے تیزطرارلامذہب دانشور تک کے حوالے تھے۔ اس موقع پر مذہبی اصلاحات کا معاملہ بھی منظرعام پر آیا۔ انیسویں صدی میں یورپ کے ساتھ سیاسی مصالحت کے سبب یہ اصلاحات متاثر ہوئیں اور یہ دانشورانہ نشاطِ ثانیہ نوآبادیت مخالف تقریروں اور عرب اتحاد کے سیاسی دباؤ نے ملیا میٹ کر کے رکھ دی، کیونکہ اِن سب کے معنی تھے کہ مغرب کی ہر شے کو رد کر دو۔ اور ۱۹۲۰ء کے عشرے تک اکثر سوالات معدوم ہو کر ایک سرگوشی کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اس دوران ایک مصری نے مسلم بھائی چارہ کیلئے اپنے عہد کی القائدہ بنائی۔ شروعات کے عمل سے برادرانہ دہشت گردی میں ڈھلنے والی کارروائی کا سہارا دو باتوں پر

تھا، قرآن اور ریوالور۔ کسی سوال کی اجازت نہیں تھی۔ ناورواداری کی تقلید کی تازہ مثال یہودیت مخالف پاگل پن ہے جو مصر میں بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ اس تھوڑی سی جگہ کے اندر کس کس بات پر روشنی ڈالی جائے، لہذا میں آپ کو ہنسانے کی خاطر ایک واقعہ بیان کرتی ہوں۔ ۱۹۹۰ء کے اواخر میں اسرائیل نے مصر کو دوستانہ سطح پر کاشتکاری کی ٹیکنالوجی فراہم کی، بائیبل کے اس مذہبی اجتہاد کے ساتھ کہ اپنی تلواروں کو پھالوں میں ڈھال دو۔ آہا، امن امن۔اس کے ساتھ مصر کے اخبارات نے زہریلے بیجوں اور سرطان زدہ کھیروں کی داستانیں شائع کرنا شروع کر دیں جو بھولے بھالے کسانوں کو فراہم کئے گئے تھے۔ افواہوں نے مصر سے جنم لینے والی اس تحریک سے زور پکڑ لیاکہ قصوروار اسرائیلی دو خبیث اشیاء کو فروخت کر رہے ہیں۔ چیونگم جو خواتین میں جنسی شہوت کی ہلچل مچا دیتی ہے اور جینیاتی طور پر تیارکردہ پھل جو شوہروں کے تخم کو جڑ سے کاٹ دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اُس عرب ملک میں ہوا جس کا اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ ۱۹۷۹ء سے ہے۔

اُردن دوسرا واحد ملک ہے جس کا اسرائیل سے معاہدہ امن ہے۔ لیکن اُردن کے متعدد اخبارات بشمول گورنمنٹ کے دو روزناموں کے ، نے گیارہ ستمبر کو یہودیوں کی کارروائی قرار دیا۔ پڑھئے ، ایک اردنی اخبار نے کیا چھاپا ، اس کا ترجمہ مڈل ایسٹ میڈیا ریسرچ انسٹیٹیوٹ نے (انگریزی میں)کیا ہے ۔ ’’یورپ کے یہودیوں نے امریکہ ہجرت کرنے کا ارادہ اس خیال سے کیا کہ امریکہ کے دارالحکومت، بینکوں، سٹاک مارکیٹ، میڈیا اور کانگریس کے دونوں ایوانوں کے سیاسی کنٹرول کو کلیتاًحاصل کیا جائے اور انہوں نے ایسا کیا۔ یہودی امریکی فوج میں گھسے خاص طور پر فضائیہ میں اور انہوں نے اپنے پائلٹوں کو جہاز لے کر جانے کیلئے تیار کیا۔ یہودی جانتے تھے کہ امریکی فوج میں بھرتی ہونے والوں کے شناختی کارڈ پر مذہب کا خانہ نہیں ہوتا۔ یہودیوں نے اس طرح جہازوں کو قبضے میں لیا ، جس طرح اخبارات، ریڈیو، ٹیلیویژن اور بینکوں کا سرمایہ اور سٹاک مارکیٹ اُن کے قبضے میں پہلے سے تھی ۔ یوں انہوں نے سیاسی فیصلہ بندی پر بھی کنٹرول حاصل کیا۔اب بش کیوں اس حقیقت کو نظرانداز کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ گیارہ

ستمبر کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے ، جاننے کیلئے تفتیش کی جائے گی؟ بش، اس کے پیچھے یہودی ہیں، یہودی!‘‘ آپ سمجھتے ہیں کہ کس بات نے میرے رونگٹے کھڑے کئے وہ یہ کہ یہ جھرلو سازشیں ایک ’معتدل‘ عرب ملک کے میڈیا میں شائع ہوئی ہیں؟ یہ سچ ہے کہ مغرب کے بارے مسلمانوں کا یہی رویہ ہے۔ مجھے اگر مزید ثبوت کی ضرورت پڑی تو یہ مجھے ایک خط کی صورت میں ملا جو گیارہ ستمبر کے بعد میرے اخباری مضامین کے حوالے سے مجھے لکھا گیا تھا۔ ’’میں خود کو ایک لبرل مسلمان سمجھتا ہوں‘‘، مراسلہ نگار نے اپنے خط کے آغاز میں لکھا ، اِس خط نے میرے تمام کام کو تباہ کر کے مجھے رولا کر رکھ دیا جو کام میں روشن خیالی کے ضمن میں کر رہی تھی۔ تمام مسلمانوں نے جو کام کیا وہ ’اسلام کے صحیح اور سچے پیغام‘ کو فروغ دینے کیلئے کیا۔ یہ ’صحیح اور سچا پیغام کیاتھا‘؟ مراسلہ نگار نے اُس کو نظرانداز کرتے ہوئے ، اپنی توجہ فقط یہ بتانے کیلئے وقف کی کہ یہودی ذرائع ابلاغ کو چلا رہے ہیں اور ’میرے کالم سیدھے یہودی تنظیموں سے آ رہے ہیں‘۔ اس لبرل مسلمان نے مجھے یقین دہانی کروائی۔ ’’میں تمہیں اپنی

تحریریں خود سنسر کرنے کو نہیں کہتا لیکن تمہارے جیسے مسلمان کے خیالات جب غیر مسلمان اور صیہونی بروئے کار لاتے ہیں تو تمہیں خود سے سوچنا چاہئے۔‘‘
مسٹر صحیح اور سچ نے ایک بات صحیح ثابت کی۔ صیہونی اصلاحات کے بارے میری شائع شدہ اپیلوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ایک ایسی صحافی کی صورت میں جو کھلے دروازوں کی شہرت رکھتی ہو، مجھے ۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں اسرائیل کے دورہ کی دعوت ملی۔ اس پیشکش پر غوروفکر کے دوران میرے ساتھ ایک امتیازی واقعہ پیش آیا۔ مسلمان عورتوں کے ساتھ اُسی ہولناکی سے پیش آتے ہیں جس طرح اُن کا رویہ یہودیوں کے بارے ہے۔ ہم ابھی بھی اپنے جغرافیائی ناسوروں اور جامد دانش کی ذمہ داری عورتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک پر نہیں ڈالتے۔ کیا کوئی صاف ذہن رکھنے والااسرائیل کو اس حوالے سے دیکھنا چاہے گا کہ اسلام کی اصلاحات کی کلیدی کنجی اسرائیل کے پاس ہے؟
میں نے اسرائیل جانے کی پیشکش کو دو شرائط پر قبول کیا: مجھے ہر وہ سوال اٹھانے کی اجازت ہوگی جو میں چاہونگی اور مجھے اپنے سفر کی روئیداد لکھنے میں

مدد درکار ہو گی۔ یہ وہ شرائط ہیں جو میں عرب اور مسلمان تنظیموں کے سامنے رکھتی ہوں جب مجھے اُن کی طرف سے اس قسم کے سفر کی پیشکش ہوتی ہے۔ اِن عرب اور مسلمان تنظیموں نے تو کبھی مجھے جواب نہیں دیا۔ لیکن میرے صیہونی میزبان نے میری شرائط کو قبول کیااور یقین دہانی کرائی کہ میں اپنے سفر کی ہمسفر ہو سکتی ہوں اور ہونگی ۔ تب میں نے خود سے دوبارہ استفسار کیا، کیا مجھے جانا چاہئے؟

مجھے مسٹر خاکی یاد آئے اور کیویر ٹیلیویژن کے وہ ناظرین یاد آئے جو ہم جنس پرست مسلمانوں کو یہودیوں کے ''سور'' اور ''کتے'' کہتے ہیں۔ میں نے حقوقِ نسواں کی حامی اُس مسلمان خاتون کو یاد کیا جس نے طالبان کے بارے بات کرنے سے بچنے کیلئے مجھ سے یہ پوچھا تھا، ''فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے''۔

اَب اُس لبرل مسلمان نے میرے رونگٹے کھڑے کر دئیے تھے جس نے مجھے اصلاحات کے بارے سوچ بچار کرنے سے متنبہ کیا تھا کیونکہ (بقول اُس کے) یہودی تنظیموں کی نگرانی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

مستقل ہمارے (مسلمانوں) چہروں پر یہودی عرب مسئلہ

کے طاری رہنے کی بناء پر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خود سے اسرائیل جا کر دیکھنا چاہئے کہ کیا اسرائیل مسلمانوں کے نہ حرکت کر سکنے والے غصہ وبرہمی کیلئے کس طرح موجب ہے۔ میں اُس غصہ و برہمی کی بات کر رہی ہوں جس کی بنیاد پر ہم اپنی حالت سے بری الذمہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔۔ حتکہ مغرب میں رہنے کے باوجودجہاں ہم اپنے اعمال پر غائر نظر ڈالنے کی اُس آزادی کے حمام میں ہیں جس میں باقی سب بھی ہیں۔ اگر ہم مسلمان ذہن کی ناروداری کو الٹ کر دیکھیں تو ہمیں اپنی آنکھوں پر چڑھے تعصب اور حیرت کے چشموں کو ہٹانا ہو گا: کیا واقعتاً اسرائیل وہ بھوت ہے جسے ہم نے باہر نکال کر رکھا ہوا ہے؟

صیہونی میرے ساتھ تھے جنہوں نے میرے لئے جہاز کی ٹکٹ لی تھی۔

حوالہ جات:

۱ ۔ ”یورپ سے میرے دوستوں نے وہاں کے میڈیا میں اسی طرح کی بھری ہوئی گھسی پٹی باتیں بطور مثال مجھے ای میل کیں۔“نوٹ: اگر آپ میرے دوستوں پر یقین

نہ کرنا چاہیں تو برطانیہ کے معروف اخبار دی انڈیپنڈنٹ کی باقاعدہ کالم نگار یاسمین علی بھائی براؤن پر یقین کر لیں۔ وہ لکھتی ہیں، ’’اُس پورے عرصہ کے دوران بی بی سی کے برطانوی مسلمانوں کے بارے پروگراموں میں کسی بھی خطرناک واقعہ کے بیان سے تن دہی کے ساتھ اجتناب برتا گیا کیونکہ سانحہ گیارہ ستمبر کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ بکھرے ہوئے برطانوی مسلمانوں کے بارے مثبت نوعیت کا عوامی اثر چھوڑا جائے۔ اسلام آگہی ہفتہ کے دوران دوسرے ٹی وی چینلز اور اخبارات نے اچھا محسوس ہونے والامواد پیش کیا‘‘۔ اَب آپ خود دیکھ سکتے ہیں، ’’مسلمان برطانوی میڈیا کے سر الزام دھرتے ہوئے غلط بات کہنے کے مرتکب ہو رہے ہیں،‘‘ اخبار دی انڈیپینڈینٹ ، اگست ۲۶، ۲۰۰۲ء۔

۲۔ ’’میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں (مسلمانوں کو) اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دی تھی۔‘‘اِس کی مثال دیکھنے کیلئے میری ویب سائٹ دیکھ لیجئے۔

۳۔ ’’مجھے ایک ایسے مرکزی دھارے کا حصہ بننے کی کوئی خواہش نہیں جو اخلاقی طور پر مفلوج اور

دانشورانہ سطح پر انحطاط پذیر ہو۔ ‘‘نوٹ: میں سمجھتی ہوں کہ یہ لڑنے جھگڑنے والے الفاظ ہیں۔ مگر میں مرکزی دھارے کے مسلمانوں کے بارے اپنی اِن آراء کہ وہ ’ اخلاقی طور پر مفلوج اور دانشورانہ سطح پر انحطاط پذیر ‘ ، پر قائم ہوں۔ یونیورسٹی آف ٹورونٹو کے اسٹوڈنٹس نیوز پیپر کی اشاعت فروری ۱۰ ، ۲۰۰۳ء کے شمارہ کی ایک داستان کا حصہ ملاحظہ فرمائیں۔ اِس داستان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان اور ایک یہودی ایک ’’منگنی کی تقریب‘‘ میں شریک ہوتے ہیں۔ دونوں جھجھکے ہوئے ہیں مگر خوشگوار نتائج کی توقع رکھتے ہیں۔ مسلمان، اِس داستان میں بتایا گیا ہے ، ’’دوسرے مسلمان طالبعلموں کے بارے جانتی ہے کہ انہوں نے تقریب میں نہ آنے کا فیصلہ کیا ہے‘‘۔ اخبار اس طرح لکھتا ہے کہ وہ بتاتی ہے ، ’’لوگ اُس کلنک کے ٹیکے کے بارے متفکر ہوں جو اُن کے ناموں پر لگ سکتا ہے یا اُن کے گروہ پر لگ سکتا ہے اگر وہ اُن خاص گروہوں کے ساتھ مل بیٹھیں جو اُن کے مرکزی دھارے میں قابلِ قبول نہیں ہیں۔‘‘ کیوں ایسی تقریب میں شرکت کرنے والوں کے ناموں پر کلنک کا ٹیکہ لگے گا؟ کیوں یہودیوں کے ساتھ

بات چیت مرکزی دھارے کے اسلام کو قبول نہیں، جب تک کہ وہ مرکزی دھارا اخلاقی یا دانشورانہ سطح پر یا پھر دونوں لحاظ سے قابلِ افسوس نہ ہو؟

۴ ۔ ’’سپین میں مغربی دنیا تک اسلام کی پہنچ کے بعد مسلمانوں نے ایک تاریخ دان کے بقول یہودیوں کے ساتھ ’برداشت کی ثقافت ‘ کو جنم دیا۔‘‘حوالہ: Maria Rosa Menocal, The Ornament of the World: How Muslims, Jews, and Christians Created a Culture of Tolerance in Medievel Spain (Boston: Little, Brown, 2002).

۵۔ ’’مغربی تہذیب میں اسلام کی خدمات پر مجھے بھرپور روشنی ڈالنے کی اجازت دیجئے۔ ‘‘George Raphael, "A is for Arabs," www.salon.com, January 8, 2002. Ole!" is traced to "Allah!" by Murad Wilfried Hoffman, Religion on the Rise: Islam in the Third Millennium (Beltsville, Maryland: Amana, 2001), p. 3.

۶ ۔ ’’جنوبی سپین کے شہر کورڈوبامیں ، مثال کے طور پر جنسی طور پر ایک انتہائی پُرکشش عورت ولادا نے ایک ادبی کیفے قائم کیا ہوا تھا جہاں لوگ خوابوں،

شاعری اور قرآن کا ایک ساتھ تجزیہ کیا کرتے تھے۔ “
حوالہ اور نوٹ: Her full name was Wallada bint-al-Mustakfi. See Tariq Ali, The Clash of Fundamentalisms: Crusades, Jihads and Modernity (London, New York: Verso, 2002), p. 56.

۷۔ ”بغداد میں نویں صدی کے خلیفہ المامون تھے جنہوں نے نام نہاد ’دانش کا ادارہ‘ قائم کیا۔ ٹمپل یونیورسٹی کے محمود ایوب کے بقول یہ ادارہ مغربی اور اسلامی دنیا میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ “نوٹ: Mahmoud Ayoub, "The Islamic Tradition," Willard G. Oxtoby, ed., World Religions: Western Traditions (Don Mills, Ontario: Oxford University Press, 2002) p. 395.

۸ ۔ ”اسی راستے سے مسلمانوں کے کمانڈر طارق بن زیاد نے پہاڑوں کے سلسلہ کو عبور کیا جس کا موجودہ نام جبرالٹر ہے۔ عربی زبان میں جبرالٹر کے معنی ’طارق کا پہاڑ‘ ہے۔“حوالہ: (اِس کے علاوہ بھی) Tariq Ali, The Clash of Fundamentalisms, p. 34.

۹ ۔ ”یہ سلسلہ عربوں کیلئے دوگنا ہو گیا جو ایک تجزیہ

نگار کی نظر میں جنگجو تھے منتظم نہ
تھے۔‘‘حوالہ" George Raphael, "A is for
.www.salon.com, January 8, 2002
۱۰۔ ’’یہودی سپین کی آدھی آبادی پر مشتمل
تھے۔‘‘حوالہ: Khalid Duran, Children of Abraham:
An Introduction to Islam for Jews (Hoboken,
New Jersey: Ktav Publishing House/American
.Jewish Committee, 2001), p. 100
۱۱ ۔ ’’اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریون نے
دوپہر کے کھانے کے وقفوں کے دوران عربی سیکھی تاکہ
وہ میمونائیڈز کے کام کو صحیح طور پر سمجھ
سکیں۔‘‘حوالہ: Khalid Duran, Ibid., p. 105.
۱۲۔’’ ہمہ جہت مذاہب اور اُن کی ایک دوسرے کیلئے
برداشت اس حقیقت کا نتیجہ ہے لوگ اُن تعلیمات کے
ساتھ مخلص ہیں جو انہیں دی جاتی ہے۔‘‘حوالہ:
Khalid Duran quoting Maimonides, Ibid., p.
.103
۱۳۔ ’’ ایسی کوئی مذہبی ہدایت نہیں کہ اِن آیات کی
لفظی تشریح ہونی چاہئے۔‘ ‘حوالہ: اِسی طرح کے

خیالات کا اظہار ابنِ رشد نے ایک سے زیادہ حوالوں میں کیا ہے، مثال کے طور پر دیکھئے ، Decisive Treatise on the Connection between Law and Wisdom, translation and notes by Charles E. Butterworth (Provo, Utah: Brigham Young University Press, 2001). ، یہ بھی دیکھئے ، The Incoherence of the Incoherence, translation and notes by Simon van den Bergh (London: M. Luzac, 1954).

۱۴۔ ''انہوں نے اپنے ایک تجزیہ میں کہا، 'عورت کی صلاحیت کا ہمیں ابھی اندازہ ہی نہیں کیونکہ اُن کی تنزلی بچے کوجنم دینے ، اُس کی پرورش کرنے اور چھاتیوں سے دودھ پلانے تک کر دی گئی ہے '۔'' Ibn Rushd quoted by Tariq Ali, The Clash of Fundamentalisms, p. 66.

۱۵۔ '' المامون کا ایک جانشین تو ایسا تھا جس نے المامون کی اسلامی تعلیمات کو نہ ماننے والے کو سزائے موت دے دی۔''نوٹ اور حوالہ: ابن رشد کے جس بھتیجے کا میں ذکر کر رہی ہوں، ابنِ وراق کے مطابق وہ الوتھک تھا۔ ابن وراق کے لفظوں میں، الوتھک نے ایک مذہب پرست کی گردن کاٹنا چاہی جس نے سرکاری الوہی حکم

کو مانا نہیں تھا۔ خلیفہ اِس میں کامیاب نہ ہو سکا اور
آخرکار اُس کو یہ فرمان ختم کرنا پڑا ‘‘۔ Ibn Warraq,
Why I Am Not a Muslim (Amherst, New York:
.Prometheus Books, 1995), p. 248
۱۶ ۔ ’’ اس خلیفہ نے فرمان جاری کیا کہ اہلِ اسلام کو
’کیسے پوچھے بغیر‘قرآن کی ہر بات کو ماننا پڑے
گا۔‘‘حوالہ: Mahmoud Ayoub, The Islamic
Tradition," World Religions: Western Traditions,
.p. 398
۱۷ ۔ ’’معروف فتووٗں کے مجموعے کو بھی اکٹھا کیا گیا
ہے جو نسبتاً کمتر تخلیقی یا کمتر صلاحیتی مفتی
صاحبان کیلئے ایک رہنما کتابچے کے طور پر کام آتا ہے۔
‘‘حوالہ: Mahmoud Ayoub, Ibid., p. 392.
۱۸۔ ’’ہم یہ صورت سعودی عرب میں دیکھتے ہیں ، ایران
میں، سوڈان میں اور افغانستان میں جب یہ طالبان کے
ماتحت تھا۔‘‘حوالہ: Ziauddan Sardar, "Islam:
Resistance and Reform," New Internationalist,
.May 2002. Download from www.newint.org
۱۹۔ ’’ اُس کا جرم کیا تھا؟ ابتدائے اسلام کی تاریخ کی

توضیع کرنا۔ ‘‘حوالہ اور نوٹ: Alexander Stille, "Radical New Views of Islam and the Origins of the Koran," New York Times, March 2, 2002.۔

ویسٹ بینک سے دوصحافیوں اور ایک انسانی حقوق کے وکیل نے اِس بات کی تصدیق کی ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ پروفیسر کا نام سلیمان بشیر ہے ، اُس کی کتاب پر تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔ Arabs and Others in Early Islam, in the International Journal of Middle East Studies, Vol. XXXII, No. 2, May 2000, pp. 277-79.

۲۰ ۔ ’’اور اُس کے بعد چیچن حامیوں کی ایک ویب سائٹ ملاحظہ فرمائیں جو شریعہ کی پیروی کو ذرا اور فخر کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ ‘‘www.qoqaz.com. At last check, its homepage streamed video of people and places being blown up.

۲۱۔ ’’ یی یور نے یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف نظریہ اسلام کی جملہ منافرت کو بیان کرنے کیلئے لفظ ’حصار (حفاظت)‘ کو گھما پھرا کر پیش کیا ہے۔‘‘حوالہ: Bat Ye'or, Islam and Dhimmitude: Where Civilizations Collide (Madison, New Jersey:

.(Farleigh Dickinson University Press, 2002
۲۲ ۔ ’’پیغمبر نے یہودیوں کو اُن کی زمینوں میں کاشت کاری کی اجازت دی تھی لیکن فقط مزارع کی حیثیت سے ۔ انہوں نے آدھی فصل کی پہنچ کا مطالبہ کیا تھااور یہ حق اپنے پاس رکھا تھا کہ وہ جب چاہیں انہیں نکال باہر کریں۔‘‘ حوالہ: Bat Ye'or, Ibid., p. 37.
۲۳۔ ’’ اس معاہدے کی یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے کچھ شرائط پر نظر ڈالئے۔ ‘‘حوالہ: یہ نقطے عبداللہ عزیز سچدینا کی دین ہیں۔ The Islamic Roots of Democratic Pluralism (Oxford, New York: Oxford University Press, 2001), p. 67.
۲۴۔ ’’ ان پابندیوں کو مسلمان قانون دانوں اور ججوں نے جبراً لاگو کیا بطور’الوہی نازل ہونے والے نظام کی نسلی منافرت پر مبنی شقوں‘ کی صورت۔‘‘حوالہ اور نوٹ: Abdulaziz Sachedina, Ibid., p. 65.، سچدینا واحد مسلمان اسکالر نہیں جو یی یور کے اِس دعوے کو مانتے ہیں کہ ’حصار‘ کا تصور اسلام میں رہا ہے۔ خالد دوراں لکھتے ہیں، ’’پہلے مسلمان فاتحین بحیرہ روم اور اُس کے پرے علاقوں کے پِسے ہوئے لوگوں کیلئے تسلی بخش پیغام

بن کر آئے۔بعد کی صدیوں میں تاہم مسلمان حکومتوں نے بعض اوقات اُن لوگوں کی اکڑ نکال دی جو ناجائز قابض تھے۔ ایک دفعہ جن اُن کا سیاسی اقتدار جم گیا، کچھ مسلمان حاکموں نے اقلیتوں کے ساتھ جابرانہ سلوک شروع کر دیا(صفحہ ۱۰۶)۔مگر ڈیوراں کے لفظ 'کچھ' پر غور کیجئے۔ ڈوراں 'حصار' کو اسلام کی قدر نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ اکثر 'ڈمی' قوموں کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا تھا۔۔(صفحہ ۱۰۹)۔ مجھے اِس بارے شک ہے۔

۲۵ ۔ ''جب شموئیل کا ۱۰۵۵ء میں انتقال ہوا، اُن کے بیٹے یوسف کو اُن کی جگہ اُن کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا۔''حوالہ: Reuven Firestone, Children of Abraham: An Introduction to Judaism for Muslims (Hoboken, New Jersey: Ktav Publishing House/American Jewish Committee, 2001), p. 56.

۲۶ ۔''اس کے باوجود مجلہ فائرسٹون اپنے قارئین کو ''اسلام کے زیرسایہ یہودیوں کے بڑے عہدوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کی نسبتاَ بہتر صورتحال کے متعلق''، بات نظرانداز کرنے کا نہیں کہتا۔''حوالہ:Reuven

.Firestone, Ibid, p. 57

۲۷۔" یہودیوں کا علاقہ' یا ' فقط یہودیوں کی گلیاں'، عیسائیوں کے ذہنوں میں شبیے اور دہشت کو عام کیا گیا تھا۔"حوالہ: Mark Cohen, Under Crescent and Cross: The Jews in the Middle Ages (Princeton: Princeton University Press, 1994), p. 126.، اس کتاب میں پہلے کوہن لکھتے ہیں، "عربوں اور عرب نواز مصنفین کا رجحان اسلامی رواداری کے طے کردہ اصول کے حوالے سے لکیر کے فقیر انداز میں رہا اور یہی رجحان باہم مذاہب کی نظر فریبی کے حوالے سے بھی رہا(صفحہ ۱۲۶)"۔

۲۸ ۔ "اور انہوں نے تب یہ دریافت کیا کہ کیسے کتے، عورتیں اور یہودی گھٹیا انداز میں ایک ساتھ کمتر سمجھے جاتے ہیں۔"نوٹ: الفدل اپنا یہ نقطہ کئی میڈیا میں اپنے انٹرویوکے دوران بیان کر چکے ہیں۔ اُن کے کام کو دیکھنے کیلئے www.scholarofthehouse.org.پر جائیے۔

۲۹ ۔" ایک محقق کے مطابق قریب پچاس روزنامے اور دوسو ہفتہ وار مجلے ایک بار مفت تقسیم ہوئے جس میں

والٹئیر جیسے تیزطرارلامذہب دانشور تک کے حوالے تھے۔‘‘حوالہ: "News from Egypt: Tried and Found Guilty of Deriding Islam," posted on www.secularislam.org. ، اِس صفحہ پرمڈل ایسٹ میڈیا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مصری صحافی فتح ماہ فاراگ کی رپورٹ پیش کرتا ہے جو الاحرام ویکلی، اشاعت تین اگست ۲۰۰۰ء کیلئے ہے۔ فاراگ لکھتے ہیں کہ انور مگھیتھ ، جو مصر کے جدید نقطہ نظر کے محقق ہیں، نے لکھا ہے کہ کس طرح ۱۸۸۹ء میں پچاس اخبارات تھے جو ۱۹۰۹ء میں بڑھ کر چوراسی ہو گئے جبکہ ہفت روزہ کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی، جن میں سے اکثریت کھلے دل کے ساتھ متنوع خیالات کو زیربحث لاتے تھے بشمول اُن کے جو صاف طور پر مذہب کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔‘‘

۳۰۔’’ا س کے ساتھ مصر کے اخبارات نے زہریلے بیجوں اور سرطان زدہ کھیروں کی داستانیں شائع کرنا شروع کر دیں جو بھولے بھالے کسانوں کو فراہم کئے گئے تھے۔ افواہوں نے مصر سے جنم لینے والی اس تحریک سے زور پکڑ لیاکہ قصوروار اسرائیلی دو خبیث اشیاء کو فروخت

کر رہے ہیں۔ چیونگم جو خواتین میں جنسی شہوت کی ہلچل مچا دیتی ہے اور جینیاتی طور پر تیارکردہ پھل جو شوہروں کے تخم کو جڑ سے کاٹ دیتے ہیں۔“حوالہ اور نوٹ: Bernard Lewis, "Muslim Anti-Semitism," The Middle East Forum, June 1998, p. 3 of online version. Download at ، www.meforum.org. ، اس طرح کی کہانیاں فلسطین میں بھی لکھی گئیں۔ عرب صحافی خالد ابو تومہے لکھتے ہیں کہ آخری انتفادہ کے آغاز کے مہینوں میں نوجوان فلسطینی مرد اور عورتوں کو بدعنوان بنانے کیلئے اسرائیل پر ادویات پھیلانے کا الزام لگایا گیا۔ اسرائیلیوں پر فلسطینی دکانوں میں جنسی شہوت ابھارنے والی چیونگم پھیلانے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ الزام لگانے کا مقصد یہ تھا کہ اِس بناء پر فلسطینی عورتوں کو طوائفیں بنایا جا سکے۔ جب تناؤ مزید بڑھ گیا تو فلسطینی حکام نے اِس بار اسرائیل پر ایسی تابکار کمرپیٹیاں پھیلانے کا الزام لگایا جن سے سرطان پھیلتا ہے۔ See Khaled Abou Toameh, "How the war began," Jerusalem Post, September 19, 2002.

۳۱۔ ’’ یورپ کے یہودیوں نے امریکہ ہجرت کرنے کا ارادہ اس خیال سے کیا کہ امریکہ کے دارالحکومت، بینکوں، سٹاک مارکیٹ، میڈیا اور کانگریس کے دونوں ایوانوں کے سیاسی کنٹرول کو کلیتاً حاصل کیا جائے۔۔کہ گیارہ ستمبر کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، جاننے کیلئے تفتیش کی جائے گی؟ بش، اس کے پیچھے یہودی ہیں، یہودی!‘‘ Al-Sabil newspaper, as quoted by MEMRI in A New Anti-Semitic Myth in Middle East Studies: The September 11 Attacks Were Perpetrated by the Jews, Washington, D.C., 2002, p. 31. MEMRI provides the original Arabic versions of all its sources. Download this report at www.memri.org.

۳۲ ۔ ’’ ’’میں خود کو ایک لبرل مسلمان سمجھتا ہوں‘‘، مراسلہ نگار نے اپنے خط کے آغاز میں لکھا، ۔۔۔۔۔۔ اس لبرل مسلمان نے مجھے یقین دہانی کروائی۔ ’’میں تمہیں اپنی تحریریں خود سنسر کرنے کو نہیں کہتا لیکن تمہارے جیسے مسلمان کے خیالات جب غیر مسلمان اور صیہونی بروئے کار لاتے ہیں تو تمہیں خود سے سوچنا

چاہئے۔‘‘حوالہ: Email dated May 19, 2002.
۳۳ ۔ ’’صیہونی میرے ساتھ تھے جنہوں نے میرے لئے جہاز کی ٹکٹ لی تھی۔‘‘ نوٹ: اسرائیل جانے سے پہلے چند ماہ کے دوران میں نے کئی عرب، فلسطینی اور مسلمان تنظیموں سے رابطہ کیا کہ مجھے مشرقِ وسطیٰ صحافیانہ مشن پر بھیجا جائے تاکہ میں معاملات کو غیر صیہونی تناظر میں دیکھ سکوں۔ کسی ایک نے بھی میری درخواست پر جواب نہ دیا

دروازے اور کمر پیٹیاں

علاقوں تک جانا کتنا مشکل ہو گا؟ میں نے پال سے پوچھا، جو اُس تنظیم کے عہدہ دار تھے جس تنظیم نے دورہ اسرائیل کا اہتمام کیا تھا۔ بلاشبہ میری علاقوں سے مراد مقبوضہ علاقے تھے۔ ویسٹ بینک اور غزہ کی پٹی۔

اوہ۔ مشکل ہے۔' اُس نے گھٹی سی آواز میں جواب دیا۔ اُن دنوں فلسطین اسرائیل تنازعہ اپنی نزاکت کے انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔ امن کی کوششیں مکمل طور پر جل کر راکھ ہو چکی تھیں اور ایک نئے انتفادہ کے غیظ وغضب کا آغاز ہو چکا تھا۔ فلسطینیوں کے خودکش بم دھماکے بڑھتے جا رہے تھے اور اسرائیل برابر کا جواب قبضے ، غیر قانونی آباد کاری، ہیلی کاپٹروں کے ناجائز حملے ، بیجا سرحدوں، کرفیو اور رمالا میں یاسر عرفات کے دفاتر کی تباہی و بربادی کی صورت دے رہا تھا ۔ (اس صورتحال میں) اسرائیل غیر ملکیوں کی حفاظت کا اضافی بوجھ نہیں چاہتا تھا لیکن یہ تاثر بھی دینا نہیں

چاہتا تھا کہ وہ صحافیوں کو دوسری طرف کی تصویر پیش کرنے سے روک رہا ہے۔ میرے کہنے سے پہلے ہی پال نے متعدد عرب آرٹسٹوں اور دانشوروں سے میری ملاقاتیں اس دورہ میں شامل کی تھیں۔ اِن سب کے بارے ، مجھے معلوم ہو گیا کہ انہیں اسرائیلی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں تھی۔ مجھے فلسطینی علاقوں تک پھر بھی جانا تھا۔ چار دیگر صحافی جن کے ساتھ میں سفر کر رہی تھی، اُن کی بھی یہی خواہش تھی۔

’دیکھتے ہیں ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں‘۔ پال نے کہا۔

تب تک جب میں ٹورونٹو ائیرپورٹ پر تل ایویو کی فلائٹ کیلئے پہنچی، ہمیں ہاں کا جواب نہیں ملا تھا۔ لیکن ہمیں نہ بھی نہیں کی گئی تھی۔

اسرائیل کی قومی ائیر لائن ایل آل نے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی۔ میں ائیر لائن کے آفیسر کا حال چال پوچھنے کیلئے آگے بڑھی۔ ’’کہاں پیدا ہوئی ہیں؟‘‘ اُس نے آغاز کیا۔

’یوگنڈا‘ میں نے جواب دیا اور پھرشہریت کا کارڈ لہرایا

جس پر ایک ننھی مہاجر کی تصویر چسپاں تھی جس کے بارے مجھے احساس ہوا کہ اِسے کوئی پہچانتا نہ تھا۔

’یوگنڈا؟‘ میں انڈیا سے ہوں۔

’ایک جنوبی ایشیائی یہودی؟‘ میں نے شرارتاً کہا۔

’یہ کیسے ہوا؟‘اُس نے سنجیدہ ہونے سے قبل میرا شجرہ نسب جاننا چاہا۔ میں نے کہاں کہاں سے پڑھا تھا؟ کیا میرے کبھی اس طرح کے پلان رہے ہیں کہ اپنے رشتہ دار کو کبھی پارسل بھیجنا چاہا ہو یا اپنے کسی انکل کو ایک ملک سے دوسرے ملک بذریعہ کشتی پار پہنچایا ہو؟ (وغیرہ وغیرہ)۔ گہری جانچ پڑتال کے بعد وہ ایک دم سے جوش و ولولے میں آ گیا۔ ’میں نے تمہیں ٹی وی پر دیکھا ہے‘۔ اُس کا مطلب کیویر ٹی وی تھا۔ سو میں نے اپنی ساتھی مشعل کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی جو چند گز کے فاصلہ پر کھڑی تھی اور ہماری گفتگو کی نوعیت میں دلچسپی لیتی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے مشعل کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور مجھے خوشگوار سفر کی تمنا کے ساتھ رخصت کر دیا۔

تب مشعل نے کنگ ڈیوڈ لاؤنج (۱)کے بورڈ کے ساتھ میری

تصویر کھینچی (کنگ ڈیوڈ لاؤنج کا نام مجھے کسی شودے آرٹ کی طرح دلچسپ لگا)۔ ہم نے ایک دوسرے میں ضم ہوتی اپنی مسکانوں، رگوں اور الوداعیہ کلمات کو باہم کیا۔ مسکانوں نے سرگوشی کی، یہی سب کچھ ہے۔ رگوں نے سرگوشی کی، کیا یہ سب کچھ ہو سکتا ہے؟

مشعل پریشان ہونے کے ضمن میں عصیبت زدہ نہیں تھی۔ ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ ایک مصری تارک وطن نے لاس اینجلس میں ایل آل کی ٹکٹ کھڑکی پر ہلہ بول دیا تھا اور دو لوگوں کو مار گرایا تھا۔ ٹورونٹو سے تل ایویو جانے والے جہاز لاس اینجلس سے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ اگر میں نے ایک دن بعد جانے کا انتظار کیا ہوتا تو میں شاید کچھ عرصہ تک اسرائیل نہ جا سکتی۔ مشعل نے مجھے جانے نہیں دینا تھا اور میں اُس پر الزام بھی نہ دھر سکتی تھی۔

مشرقی افریقہ کی ایک مسلمان سے جنوبی ایشیا کی یہودی میں ڈھلنے کے تصورانہ عمل میں کھوئے کھوئے مجھے اسرائیل کی ہمہ گیریت کا ایک اور ثبوت ملا۔ جہاز کی حفاظتی تدابیر والی وڈیو اگرچہ ہیبرو میں تھی لیکن اس کی ذیلی سرخیاں عربی میں تھیں۔ عربی اسرائیل

کی ایک سرکاری زبان ہے۔ اس کا کس کو علم تھا؟ میں کسی حادثے کے بغیر اتر گئی۔ میرا چھ روزہ دورہ دو بڑے حصوں میں تقسیم ہونا تھا، پہلے چند روز اسرائیل کے کاروباری مرکز تل ایویو میں گزرنا تھے اور دوسرے حصہ میں مجھے روحانی مرکز یروشلم جانا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں عربوں اسرائیلیوں کی آبادی پر مشتمل چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی رکنا تھا۔اور رستے میں ، میں نے اپنی امید جاری رکھی، ہمیں فلسطینی مقبوضہ علاقوں میں بھی کچھ وقت گزارنا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ پاگل کر دینے کی حد تک کام تھا۔ لیکن تل ایویو میں میرے پہلے بھرپور دن نے مجھے سمجھا دیا کہ اسرائیلی سودائیوں کی طرح جیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اُن کی ثقافتی سیالیت کے عین مطابق تھا۔ دوپہر کے کھانے پر ایک اسرائیلی صحافی نے مجھے بتایا کہ تھیٹر 'مائی فئیر لیڈی'ہیبرو میں پیش کیا جا رہا ہے جس میں مرکزی کردار عرب عورت کا ہے۔' اسی کے عشرے میں فلسطینی قومی تھیٹر قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی(۲)' اُس نے مجھے مزید بتایا۔ 'تمام پرگرام عربی زبان میں پیش ہوتے تھے اور منتظمین باقاعدگی

سے اسرائیل تھیٹر کے مبصرین کو دعوت دیا کرتے تھے۔ درحقیقت اس تھیٹر کو دیکھنے والے لبرل یہودیوں کی ایک ولولہ انگیز تعداد بن گئی لیکن یہ کبھی بھی فلسطینیوں میں مقبول نہ ہو سکا ‘۔یہ تھیٹر ڈگمگا گیا جب اِس کے بانی جوڑے کی آپس میں طلاق ہو گئی۔ تاہم یہ ایک طرح کا انتفادہ تھاجس نے تل ابیب کے آرٹ میوزیم میں یہودیوں اور عربوں کے ربط کو ختم کر دیا۔ ہم اس آرٹ میوزیم کو دیکھنے جا رہے تھے۔

اس آرٹ میوزیم کا تھوڑا پس منظر آپ کو پہلے بتاتی ہوں۔ یہ میوزیم ۱۹۳۰ء کے عشرے میں معرضِ وجود آیا تھا، اسرائیل کی آزادی سے بہت پہلے اور اُس وقت جب اونٹ سڑکوں پر عام دیکھے جا سکتے تھے۔ یہ باور کرتے ہوئے کہ ہر قصبہ شہر میں ڈھل چکا ہے اور ہر بڑا شہرا فنکاروں سے بھرا ہوا ہے، تل ابیب کے مئیر نے دنیا بھر سے نوادرات کے تاجروں کو قرضہ دینے کی اپیل کی۔ جرمن کے یہودیوں نے غیر یقینی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے سارے ذخیرے مئیر کو بھیج دئیے۔ اس طرح حیران کن مجسمے اور تصویری فن پارے ضبطی یا مکمل نابود ہونے سے بچ گئے۔ یہ قصہ مزید دلچسپ ہو

جاتا ہے۔ وہ آرٹ جو یہودیوں تک پہنچا، یہودیوں اور عربوں دونوں کا بھیجا ہوا تھا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بڑے حصہ تک فلسطینی مشرقی یروشلم کی آرٹ گیلری کے ڈائریکٹر نے تل ابیب کے فنی نوادرات کو اپنے ہاں نمائش کیلئے پیش کیا اور اُس نے تل ابیب کے میوزیم کو عرب فنکاروں کا کام بھیجا۔ امن کی راہ کے نقطہ عروج پر ایک مصری فنکار نے تل ابیب میں اپنی تصویروں کی نمائش کی۔ اس میوزیم نے اس فنکار کی فلسطینی مقبوضہ علاقوں کی راہ میں سفری نمائشوں کابھی اہتمام کیا۔

اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ 'ہم اُس کے ساتھ آج بھی کام کرنا چاہیں گے'(۳)۔ تل ابیب میوزیم کی محافظ نے مشرقی یروشلم کے محافظ کے بارے کہا۔ انتفادہ سے اب تک وہ رابطہ کرنے کی کئی لاحاصل کوششیں کر چکی ہے۔ ''وہ غالباً ہم سے رابطہ کرنے میں اب بہت خوفزدہ ہے (فلسطینی حکام سے)، غالباً؟ وہ ایسا کیوں فرض کر رہی تھی؟ میں نے ایک اس چھوٹی سی بات پر سوچا، ایک لاحاصل بات ۔ اُس کے نرم لہجے کا انداز یہ بات کرتے ہوئے تھوڑا تلخ ہو رہا تھا۔ مگر میں جلد ہی اُس

کے بیان کی طرف واپس آؤنگی۔
عمارت سے باہر نکلتے ہی ایک بصری تقابل نے مجھے روک دیا۔ تل ابیب آرٹ میوزیم کی نیچے پھیلی ہوئی پتھر کی کاخ اوپر کی چوٹی تک سامنے سڑک کے رخ تھی، اسی طرح اسرائیلی ڈیفنس فورسز کی مرکزی عمارت بھی تھی۔ تخلیقیت اور سلسلہ مراتب کا یوں پہلو بہ پہلو نظر آنا اتفاقی امر بھی ہو سکتا تھالیکن یہ چیز اسرائیل میں ہر جگہ نظر آتی تھی، گھر سے لے کر روایت پرست یہودی سیاسی پارٹیوں تک اور مشرق وسطیٰ کی واحد ہم جنس پرست پریڈ میں بھی۔ اس نقطہ نے کسی اسرائیلی کے ساتھ میرے پہلے مکالمہ کو جنم دیا۔ وہ اسرائیلی وہی صحافی تھاجس نے مجھے قومی فلسطینی تھیٹر اور اُس کے یہودی مداحوں کے بارے بتایا تھا۔ وہ میرے اس وجودی اور حساس سوال پر چکرا سا گیا، ’’کیا اسرائیل کو ایک یہودی ریاست کے طور پر رہنا چاہئے یا اس کو خالصتاً سیکولر ریاست کے طور پر سامنے آنا چاہئے جہاں مذہب ایک اتفاقی معاملہ ہو؟‘‘ ’اور ہولو کاسٹ کو کیا کردار ادا کرنا چاہئے، اسرائیل کی فقط سرکاری حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک پناہ گیر ملک

کی آج کی شناخت میں؟‘یہ درست ہے کہ میں نے سوچا تھا ایک عام اسرائیلی یہ باتیں خود سے سرعام پوچھتا ہو گا مگر (اس بات پر) میری طرح آپ خود کو اکیلے اجنبی پائیں گے۔

درحقیقت میرے قیام کے عرصہ کے دوران، اسرائیلی ذرائع ابلاغ انہیں سوالوں پر جوش و ولولے کے ساتھ بحث کرتے رہے۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ آپ ایک یہودی ریاست میں مذہب پر یوں تابڑ توڑ حملے کر سکتے ہیں۔ میں غلط تھی۔ میں نے اسرائیل کی قانون ساز اسمبلی کنیسٹ کے ایک سیکولر رکن کے بیان کو پڑھا جس نے کہا تھا کہ ملک کو شمالی امریکہ سے یہودی مذہبی تارکین وطن کی مزید ضرورت نہیں ہے ۔ ایک اخبار نے تھوڑا بھڑکانے والے اس بیان کی تعریف کی۔ اُس نے بعد میں وضاحت کی کہ اُس کی مراد کٹڑ مذہبی یہودیوں سے ہے (۴)۔ جو بھی ہو۔ اسرائیل کے قوانین اظہار آزادی کی مکمل ضمانت دیتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔

میں نے خاص طور پر اخبارات کے اداریوں سے حظ اٹھایا جن میں موضوعات کا انتخاب مکمل طور پر آزاد پریس ظاہر کرتا تھا۔ ’ہارٹز‘ کی مثال لیجئے جو اسرائیل

کا نیو یارک ٹائمز ہے ، اس اخبار نے اسرائیلی گورنمٹ کی اس تجویز کو سیخ پر پرو کر تنقید کی کہ گورنمنٹ سرکاری زمین کو خاص طور پر یہودی شہر بنانے کیلئے استعمال کرے گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ’ہارٹز‘ نے اس بل پر کس طرح تنقید کی(۵)؟ ’نسل پرست ‘۔ جلی سرخی یوں تھی، ’’ایک نسل پرست بل‘‘۔ کوئی لگی لپٹی نہیں تھی، کوئی مبہم بات نہیں تھی، معذرت خواہانہ انداز نہیں تھا۔ یہ بل شدیداسرائیلی تنقید میں اپنی موت آپ مر گیا۔

میں آپ کو ایک اور اختلافی مسئلہ کے بارے بتاؤنگی جو میرے دورہ کے دوران اخبارات میں چھڑا۔ یہ مسئلہ اُس تقاضے کے گرد گھومتا تھا جس کا تعلق فلسطین اسرائیل تنازعہ کو غیرملکی ذرائع ابلاغ میں پیش کرنے سے تھا۔ اسرائیل کے وزیر اطلاعات نے دھمکی دی تھی کہ وہ سی این این کی نشریات کو قومی نشریاتی رابطوں سے نکال کراُس کی جگہ فوکس کی نشریات کو دے دیں گے۔ اس پر ’ہارٹز‘ نے ردعمل ظاہر کیا، ’’اگر تم ایسا کرو گے تو تم عرفات سے بہتر نہیں ہو جس نے ایک بار سی این این کی کرسچنا امان پور کا فون پٹک کر

نیچے رکھ دیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کے اصول کی مدافعت کو اجاگر کرنے کیلئے اسرائیل کے سب سے موثر اخبار نے زور دے کر کہا، ’’یہ جاننا اسرائیلیوں کا حق ہے کہ سی این این اور بی بی سی اسرائیل کے سرکاری نقطہ نظر کے عکاس نہیں۔۔۔‘‘ (ہنوز ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے ورق اُلٹا ۔۔ فقط مزید خود تنقیدی کو دریافت کرنے کیلئے۔ ’’کیا یہودی تاریخ اپنی خواتین رہنماؤں کے کارناموں سے پورے طور پر آگاہ ہے(۷)؟‘‘ ایک مصنف نے پوچھا تھا۔ ’’شاید نہیں۔۔۔‘‘ اُس نے ڈونا گراسیا نیسی نام کی ایک یہودی بینکار کی داستان کا آغاز اِن لفطوں سے کیا ۔

اس عورت نے سپین میں ہزاروں یہودیوں کو عدالتی تحقیقات سے اپنی اقتصادی بصیرت کو سیاسی قوت کے طور پر استعمال کر کے بچایا۔ اس کے چند روز بعد ایک اور مضمون شائع ہواجس میں اسرائیل نے ایک اور عورت کو بطور مثالی نمونہ پیش کیا۔ پہلی بار فوج نے ایک خاتون کو ترجمان عہدے کا سربراہ مقرر کیا(۸)۔ مجھے یہ سوچنا یاد ہے کہ اسرائیل نے تمام تر اخلاقی آثار جوئی (اور شاید اسی کی وجہ سے)کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ معاشرہ آگے بڑھتا نظر آ رہا ہے اس کے باوجود

کہ یہ اپنے اندرمذہب کی لفظی تعبیر کیلئے بھی بنردآزما رہتا ہے۔
اپنے دورہ کے دوسرے حصہ کے دوران میں نے کار کی کھڑکی سے ایک منظر دیکھا۔ ایک جوان عورت مکمل یونیفارم میں ملبوس درجنوں مرد سپاہیوں کے آگے مارچ کر رہی تھی(۹)۔ یہ اپنے دستے کو کہاں لے جا رہی ہے؟ میں اپنے گائیڈ کی جانب مڑی۔ اُس نے بتایا کہ وہ پرانے شہر کو جا رہے ہیں(۱۰)۔ یروشلم کے عین مذہبی مرکزمیں۔ 'وہاں یہ تین دن کے قریب اس علاقے کے نمائندہ مختلف مذاہب کے بارے پڑھیں گے۔'
'تمہارا مطلب ہے، مذہبی جانکاری فوجی ڈیوٹی کا حصہ ہے؟'
'یقیناً۔ فوج ہر چند مہینوں بعدیروشلم میں نامزد سپاہیوں کیلئے وقت مقرر کرتی ہے کہ وہ اپنی روزمرہ مشغولات کے علاوہ وہاں کی روایات کو بھی جانیں۔ مجھے اگلی دوپہر کو ذاتی طور پر اس پروگرام کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔
میر'ا ڈوم آف دی راک' کا دورہ طے تھا(۱۱)، یہ اسلام کی تیسری مقدس جگہ ہے جو اپنی سنہری چھت کی

بناء پر فوری پہچانی جاتی ہے۔ اس کا جاذبیت کے ساتھ دمکتا سورج کو بھی یقینی طور پر روزانہ طلوع اور غروب ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ ایک اسلامی روایت کے مطابق اس مسجد کی بنیاد میں ایک خاص پتھر ہے جس پر پیغمبر محمد 'شب معراج' کو چڑھے تھے۔ اس پتھر پر پیغمبر محمد کو گھومتی ہوئی سیڑھی ملی جو اُن کو جنت تک لے گئی جہاں وہ پہلے پیغمبروں سے گھل مل گئے اور انہوں نے اُن کے ساتھ مل کر عبادت کی اور پہلے پیغمبروں سے فیض حاصل کیا۔ یہ وہ کہانی ہے جو مجھے اسلام سے محبت کرنے پر مائل کرتی ہے اور میرے مذہب کے بارے کثیر الثقافت امکانات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس جگہ کی فقط تاریخ کا حصہ ہوتا تو میں بغیر کسی پریشانی کے اس جگہ پر چل پھر سکتی تھی اور ممکن ہے کہ سر پر کچھ اوڑھے بغیر۔ خدارا یہ اس قدر آسان نہیں تھا۔

ڈوم آف دی راک 'ٹمپل ماؤنٹ' کے چبوترے پر ایستادہ ہے۔ ٹمپل ماؤنٹ کے بارے یہودیوں کی روایت ہے اور بہت سارے ماہر آثار قدیمہ کا بھی کہنا ہے کہ یہ پرانی سلطنتِ ڈیوڈ کے زمانہ کی مرکزی عبادت گاہ ہے۔ یہ وہ

مقام بھی ہے جہاں ستمبر ۲۰۰۰ء میں فسادات بھی پھوٹے تھے جس سے حالیہ انتفادہ کا آغاز ہوا۔ اِن فسادات سے چند روز قبل ایرئیل شیرون نے ٹمپل ماؤنٹ کی جانب پیدل سفر کرنے کا اعلان بھی کیا تھا۔ امن کے عمل کے ناکام ہو جانے کے حالات میں اسرائیل نے یروشلم تقسیم کرنے کی پیشکش کر دی۔ شیرون نے کہا کہ وہ صرف یہ دکھانا چا رہے تھے کہ ماؤنٹ ٹمپل کا کھلا میدان یہودی عبادت گزاروں کیلئے کھول دیا گیا ہے۔ وہ کس کو بیوقوف بنانا چاہ رہے تھے؟ قدامت پسند یہودیوں کے دوست کی حیثیت سے شیرون نے حساب لگایا کہ اُن کا ایسا دورہ اب تک کی معلومات کے مطابق اُن کی وزیر اعظم بننے کی جدوجہد کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ سیاست کا شکی و سنکی خاموش ناٹک۔ اسی سنکی سیاست کا اظہار کرتے ہوئے ویسٹ بینک میں عرفات کے چیف اسیکیورٹی نے شیرون کے دورہ کی منظوری دے دی تھی(۱۲)۔ بعد میں فلسطین کابینہ کے ایک وزیر کو معلوم ہوا کہ عرفات تو انتفادہ کیلئے کئی مہینوں سے منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اُن کو اس بنیاد پر اس منظوری سے انحراف کی ضرورت ہے اور صرف اس بناء پر شیرون کا

ٹمپل ماؤنٹ کے سیر سپاٹے کا نہ ہو سکنے والادورہ فلسطینیوں کے خلاف چلا گیا۔۔ فقط انحراف کی وجہ سے۔ انتفادہ کا آغاز ہو گیا۔ دی ڈوم آف دی راک اور ملحقہ مسجد الاقصیٰ کے آہنی دروازے ہر کسی کیلئے بند ہو گئے بجزمقامی مسلمانوں کے۔ تب سے پرانے یروشلم کا یہ حصہ ۔ ۔ جو کبھی یہودیوں، عیسائیوں ،مسلمانوں اور کسی بھی منظم عقیدے سے تعلق نہ رکھنے والے لوگوں کے لئے باعثِ کشش ہوا کرتا تھا۔۔ اپنی عالمگیر اتحاد کی قوت سے خالی ہو گیا۔

میں ایک سادہ سے لباس میں ملبوس دروازے پر پہنچی، یہ لباس میرے ٹخنوں تک پھیلا ہوا تھا جس کے ساتھ میں نے لمبی آستینوں والا سویٹر پہنا ہوا تھا جس کے بٹن آگے سے بند تھے۔ میں اپنی نوکیلی چست ٹوپی پہننے پر متامل تھی۔ جو کسی نہ کسی طور میرے سر پر پتلی پٹی کی طرح لپٹے حجاب سے ملتی جلتی تھی۔ اسرائیل کی وزارتِ خارجہ نے اس جگہ کی نگھبانی کرنے والوں کو پہلے ہی اطلاع دے دی ہوئی تھی، ایک مذہبی ادارہ وقف کو کہ میں پہنچ رہی ہوں۔ پیغام یہ تھا: ’اس کو مشکل وقت نہ دیجئے حضرات، یہ آپ میں سے ہی ہے۔‘

وقف کے ایک ہٹے کٹے رکن نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اُس نے وزارت سے کسی قسم کے پیغام ملنے کی نفی کی۔ میرے گائیڈ نے اُسے یقین دہانی کرائی کہ پیغام بھیجا گیا ہے۔ وقف کا آدمی اپنے 'واکی ٹاکی' میں بڑبڑایااور چند منٹ بعد ایک دوسرا ریچھ نما بھائی مٹرگشت کرتا آ پہنچا۔ میں اُس وقت اس بات کا اندازہ نہ کر پائی کہ تاخیر کا باضابطہ نوٹس ملنے یا نہ ملنے سے کیا تعلق ہے۔ میرا نام ارشاد دونوں جنسوں کیلئے ہے اور مردوں میں عورتوں سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جب اسرائیلی وزارتِ خارجہ نے میرے بارے وقف کو اطلاع دی ہو گی، میں شرط لگاتی ہوں کہ یہ لڑکے (وقف کے) سمجھے ہونگے کہ انہیں کسی مرد کاسامنا کرنا ہے۔ جیسا کہ میرے جلو میں کوئی مرد مسلمان نہیں تھا، اَب کیا کروں؟ یہ حجت تب تمام ہوئی جب یروشلم پولیس کے ایک افسر نے اس بات پر اتفاق کیا کہ میں مجھے اندر ایک نگہبان کے ساتھ چلنا ہو گا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس مقدس زمین میں داخل ہوں مجھ پر ایک اور بات لاگو ہوئی۔ وقف کا ایک رکن ہاتھ میں پٹی پکڑے بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے بولا کہ میں اس کو اپنے اوپر باندھ

لوں۔ ابھی میں نے برہمی کا آغاز نہیں کیا تھا اور اُسے لرزتے ہاتھ کے ساتھ اپنے ملبوسات کے ساتھ باندھنا شور کر دیا۔ ’نہ، نہ، نہ!‘ میں نے اپنی طرف اٹھتی ہوئی ایک سخت گیر انگلی پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ پٹی کو میرے کپڑوں کے اوپر چاہتا تھا، نیچے نہیں(۱۳)۔ مقدس لغویات ۔۔ مجھے معاہدہ عمر یاد آیا! کپڑوں کے اوپر پٹیاں باندھنا ایک شرط تھی جس کو ’حفاظت‘ میں لئے گئے تمام لوگوں کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ میں ایک مغربی مسلمان عورت کی حیثیت سے وقف کی نظروں میں مذہبی اقلیت کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ جہنم میں جاؤ، میں ایک جاسوس یہودی بھی ہو سکتی ہوں۔ اس سے زیادہ اگرچہ یہ ہے کہ میں ایک کمتر شے ہوں۔

میں نے اپنی زبان بند رکھی، اپنے حجاب کوسامنے سے باندھا، ایک لمبی سانس لی اور اپنے جسم کو ادھر ادھر ہلایا اس امید میں کہ پٹی میرے کولھوں کے اوپر بیٹھ جائے۔ یہ امید کرتے ہوئے کہ یہ سپرنگ (پٹی) ہمیشہ قائم رہے گی لیکن ’اتنی بھی‘ ابدی نہ ہو۔ میں نے اپنے نگہبان کے ذریعے اپنے فسطائی زدہ فیشن بھائی کو بتایا کہ یہ پٹی میرے لباس پر ٹھیک فٹ نہیں ہو رہی۔ اُس

نے تیوری چڑھائی۔ میں نے جواباً غرانا چاہا مگر 'نباہ کرنا پڑا'۔
وقف کے آدمی نے پٹی کو میرے لباس کے اندر جاتے دیکھا۔ اُن نیک مسلمان لڑکوں نے ڈھٹائی کے ساتھ مجھے گھورا جب میں بالا لہریا چال کے ساتھ اس شے کے بارے محتاط ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے اپنے لباس کے نیچے صبح سائیکل سواری کی نیکر پہن لی تھی۔
اس ساری حزیمت کو پیچھے چھوڑتے ہوئے میں اور میرا نگہبان دروازے سے اندر چلے گئے۔ ہم اٹک اٹک کر جا رہے تھے کیونکہ پٹی میری رفتار کا تعین کر رہی تھی۔ اس دوران پولیس افسر ٹمپل ماؤنٹ کے کھلے میدان میں مجھے ملنے پہنچ گیا ۔ اُس نے ہمارے معلوماتی دورہ کو تھوڑی اسلامی تاریخ بیان کر کے آگے بڑھایا۔ وہ ایک فوجی ہوا کرتا تھا اور اُس کو بہت کچھ یاد تھا جو اُس نے پرانے شہر میں اپنی فوجی تعلیمات کے ہلے میں پڑھا تھا۔ میرے مخصوص سوالات جو میں وقف سے کرنا چاہتی تھی، اُن میں سے ایک یہ تھا کہ عربی میں 'بھول جائیے' کیسے کہتے ہیں؟ وقف نے مجھے واپس یادگار

تصویر لیجانے کیلئے اتارنے نہ دی، انہوں نے (وقف کے لوگ) کسی قسم کی بات چیت میں حصہ نہ لیا۔ اس کے برعکس ایک یہودی نے وہاں میرا استقبال کیا۔ یا پھر ہمارے مشترکہ مذہب اور ٹمپل ماؤنٹ کے بارے مشترکہ صدیوں پرانی تاریخ کی وجہ سے یہ انتہائی مناسب تھا۔

مجھے پولیس اپنے جلو میں مسجد اقصیٰ کے دروازوں تک لے گئی۔ میں نے جیسے ہی اپنے سینڈل اتارے، پھر اندر داخل ہونے کیلئے اپنے حجاب کو درست کیا تو ایک بوڑھا شخص دیوار سے کھسکتا ہوا بڑھا اور میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میرے راستے کو روکنے لگا۔ میرے نگھبان اور میں، ہم دونوں نے اُسے یقین دہانی کرائی کہ میں منظور شدہ ہوں لیکن یا تو وہ ہمیں سمجھ نہیں پا رہا تھا یا ہم پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ ہم نے وقف کو بلایا۔ ممکن ہے کہ میرے اندر بدھ مت ہے جس کی بناء پر مجھے اُن سے کوئی توقع نہ تھی اور جس کے نتیجہ میں میری حوصلہ شکنی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک طول پانے والے خالی وقفے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم تمام کھڑے یہ دیکھتے رہے کہ ہم کتنے حصے بخروں میں ہو جانے

والی مسلمان قوم ہیں۔
تب کہیں جا کر بوڑھے نے ٹیڑھی آنکھ کو سیدھا میری طرف کرتے ہوئے قرآن کی پہلی آیت کی پہلی سطر اُگلی، ’ بسم اللہ الرحمن الرحیم!‘اُس کے عمل تصریف میں کوئی خاص بات تھی۔ کیا وہ اگلی سطر میرے منہ سے سننے کا امتحان لینا چاہتا ہے؟
میں نے تڑختے ہوئے جواب دیا۔ ’الحمد وللہ رب العالمین‘۔
’الرحمن الرحیم‘ اُس نے جواب داغا۔
مدرسہ کی سالوں کی تربیت کام آئی، ایک بدمزاج بوڑھے شخص کے ساتھ یروشلم کے ٹمپل ماؤنٹ میں نماز کا مکالمہ۔ ’مالک یوم الدین‘ میں نے پلٹا دیا۔ مزید چند راؤنڈز کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ میں نے خود کو اس بات کا اہل ثابت کر دیا ہے کہ بوڑھا ایک مسلمان کو عبادت کرنے کے حق سے روکنے کا خدا کو جوابدہ ہو گا۔
اُس نے مردہ دلی کے ساتھ مجھے دروازے سے گزرنے دیا۔۔ اس آخری شرط کے ساتھ۔ اُس نے کہا، مسجد کے اندر مجھے کیمرہ سے دستبردار ہونا ہو گا کیونکہ کسی جاندار کی تصویر اتارنا جس کے اندر روح ہو، بت پرستی کو ہوا دینا ہے۔ ذرا رکئے۔ کیا وہ مسلمان نہیں تھے

جنھوں نے اسلام کے سنہری دور میں بصری نقش گری ایجاد کی تھی؟ کیا اُن کی ایجاد نے انیسویں صدی میں فوٹو گرافی کی بنیاد نہ رکھی؟میں نے اس خیال کو ذہن بدر کیا۔ عقلمندی کا یہی تقاضہ تھا کہ میں اپنی چونچ بند رکھوں اور اپنا کیمرہ نگہبان کو تھما دوں۔
الاقصیٰ مسجدکے اندر دنیا بوڑھے کی منجمد کائنات سے بالکل مختلف تھی۔ یہ گوشہ عافیت مخلوط نوعیت کا تھا۔ مردوں اور عورتوں کو کوئی دیوار الگ الگ نہ کرتی تھی۔ میں نے غور کیا کہ صرف ایک عورت شاندار اونی قالین پر بیٹھی تھی، اُس نے خود کو بڑھتے ہوئے مرد نمازیوں سے ایک فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ مگر کم از کم وہ وہاں پر تھی، مرد نمازیوں کے درمیان۔ کچھ مرد سوئے سوئے نظر آ رہے تھے ، دیگر نہائت خوبصورتی کے ساتھ ڈیزائن کی گئی راہداریوں پر گرے پڑے تھے یا فرش پر بکھرے ہوئے تھے ، دوپہر کی گرمی سے نڈھال۔ ایک طرح سے اسی لئے میں نے محسوس نہ کیا کہ میرا جائزہ لیا گیا جب میں اندر ٹہل رہی تھی۔
تردید: میں مسح کرنے والوں کی نگاہ میں تو نہ آئی۔ تاہم میرا بغور جائزہ لیا گیا۔ دور ایک نکر میں لڑکوں کا ایک

ٹولہ اُس عورت پر کھی کھی کر رہا تھا جو شاندار ایوانوں کو ہلکے سے چھو رہی تھی اور اپنے سر کو اٹھائے مختلف سمتوں میں اوپر اور آس پاس دیکھ رہی تھی۔ لڑکوں کے استاد نے انہیں آرام سے خاموش رہنے کو کہا۔ میں محتاط ہو کر اُستاد کی طرف بڑھی کہ کہیں میں موجب زحمت تو نہیں۔ وہ احمقانہ سی ہنسی ہنسا اور عربی میں میرا استقبال کیا لیکن جب اُسے اندازہ ہوا کہ میں انگریزی جانتی ہوں تو اُس نے انگریزی بولنا شروع کی۔ 'آپ کہاں سے آئی ہیں؟'

'ٹورونٹو'

' آہا، اچھا آپ ہیں، ہمیں آپ کی آمد متوقع تھی'۔ (لہذا اسرائیلی وزارت خارجہ نے وقف کو مطلع کیا ہوا تھا، تب یہ سرا کھلا کہ یہ ایک سیاسی منصوبہ تھا جو مختلف حربوں کو استعمال کرتے ہوئے بروئے کار لایا گیا جس کا سامنا مجھے دروازوں پر کرنا پڑا)۔

' اچھا ہے، میں خوش ہوں کہ میں نے کسی کو ایک دم اپنی آمد سے حیران نہیں کیا'۔ میں نے ہم دونوں کے درمیان ظاہری گرمجوشی کے مطلب کو پا لیا۔'جناب کیا آپ مجھے اپنی اور اپنے شاگردوں کی تصویر بنانے دیں

گئے؟' میرے اس استفسار کا مطلب بہت گہرا تھا۔
'کوئی مسئلہ نہیں'، اُس نے جواب دیا۔
آہا۔ ہر کوئی بوڑھوں کی اس بات سے متفق نہیں ہوتاکہ کیمرے کے اندر جانداروں کو عکس بند کرنااُن کو مقدس ٹھہرانے کے مترادف ہے۔ اگر قرآن کو پڑھانے والا، خاص طور پرمذہب کی ایسی شل کر دینے والی باتوں سے خود کو روک سکے تب ممکن ہے کہ بہت ساری توضیحات فلسطینی تحریک کے اِس مفسدانہ ماحول میں پیدا ہو سکیں۔ اصل چیلنج یہ ہے کہ اِن توضیحات کو کسی قسم کے ردعمل کے خوف کے بغیر بیان کر دیا جائے۔
اب مجھے کھینچنے کی غرض سے ایک یادگار تصویر مل گئی تھی(۱۴)۔ تاحال پٹی میں لپٹی میں مسجد سے بطخ کی چال کی مانند نکل آئی۔ خاص طور پر اپنے نگہبان کی توجہ حاصل کی، کیمرے کو سیدھا کیا اور گھٹیا کام (تصویر اتارنے والا) کو ادا کیا۔ جب میں نے استاد اور اُس کے شاگردوں کا شکریہ ادا کیا، میری آنکھوں نے کچھ دیکھا۔ قرآن کا ایک طالبعلم ہیبرو زبان کی لکھائی والی ایک ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ کسی دوسرے مقام پر میں اس بات کو دوسری نگاہ کے لائق نہ سمجھتی۔

جاری و ساری انتفادہ کے گراؤنڈ زیرو پر آپ یقین کر سکتے ہیں کہ میں نے دوبارہ اُس ٹی شرٹ پر نظر ڈالی تھی۔
میرا اگلا پڑاؤ ڈوم آف دی راک تھاجہاں میں نے عورتوں اور مردوں کی اکثریت کو نماز پڑھتے پایا۔ میں نے ایک ایسا اندرونی حصہ بھی دیکھا جس پر مسجد اقصیٰ کا نمایاں اٹھتا ہوا پینٹ نہیں تھا۔ ممکن ہے اندر طاری اندھیرامسجد کے وسط میں ’راک‘ پر سپاٹ لائٹس سے پڑنے والی روشنی کی وجہ سے ہو جس کے نتیجے میں ہر دوسری شے اندھیری نظر آ رہی تھی۔ میں مرکزی حصے میں پہنچ گئی۔ لکڑی کی اونچی باڑھ کی رکاوٹوں کے سبب ’راک‘ کی سطح بمشکل نظر آ رہی تھی خاص طور پر اگر کسی کا قد چھوٹا ہو۔ جیسا کہ میرا تھا۔ سو میں نے اپنا دھیان کسی اور بات کی جانب مبذول کیا جو میری توجہ کھینچ رہی تھی اور وہ اس مسجد میں ایک صاف گوخاتون کی صورت میں تھی۔
وہ نیو جرسی میں ایک اسکول کی پرنسپل تھی جو یروشلم میں پیدا ہوئی اور اکثر اپنی بہن سے ملنے یروشلم آتی رہتی تھی۔ ہماری بات چیت کے دوران

پرنسپل کو معلوم ہوا کہ میں ٹی وی کیلئے کام کرتی ہوں اور میں ایک 'سیریز' بنانے کیلئے آنا چاہونگی۔ 'براہِ مہربانی' اُس نے زور دیا، 'ہمارے ریفیوجی کیمپ سے اپنے لئے کام کرنے والے لوگوں کو چنو، اگر وہ وڈیو کیمرہ اور مائیکروفون کے بارے کچھ نہ جانتے ہوں تو تم اُنہیں سکھا سکتی ہو۔'

میں نے ایک طنزیہ جملہ کسا کہ ٹی وی پروڈکشن بھی اسرائیل فلسطین سیاست کی طرح ہوتی ہے۔۔ایک سادہ سے نتیجے کی خاطر مضحکہ خیز عمل۔ اُس نے میرے چٹککلے کو نہ سمجھا، وہ وہاں کی بحرانی کیفیت میں اُلجھی ہوئی تھی۔ 'ہمارے لوگ کچھ کرنا چاہتے ہیں، یہاں کام نہیں ہیں، یہاں ایک طویل عرصہ سے کچھ نہیں ہوا۔'

'مگر اُس تمام غیر ملکی امداد کا کیا ہوا جو فلسطینی حکام کو مغرب سے ملتی ہے؟' میں نے پوچھا۔ میں نے اُس اضافی رقم کو سامنے لانے کی کوشش نہیں کی جو اقوام متحدہ کی ایجنسی برائے بحالیات نے تین نسلوں سے فلسطینی مہاجروں کیلئے وقف کی ہوئی ہے (۱۵)۔ 'ہم اُن کروڑوں ڈالر کی بات کر رہے ہیں جو لیبارٹریوں،

ہسپتالوں، اسکولوں اور مرکزی کاروباری علاقوں کیلئے تصرف میں لائی جا سکتی تھی۔ کیوں ابھی تک آپ کے یہ ریفیوجی کیمپس ہیں؟ وہ ساری امداد کہاں جاتی ہے؟'

' مجھے اس سارے معاملے کا علم نہیں لیکن کچھ جانتی ہوں۔۔۔' اُس نے یوں تاثر دیا کہ جیسے کچھ نقدی جیب میں ڈال رہی ہو۔

'بدعنوانی؟'

'اُدھر دیکھو' وہ مسجد کے بری طرح کھرونچ زدہ ستون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑ بڑائی۔ ''مسلمانوں کے پاس تو حتکہ اس خوبصورت جگہ کی مرمت کیلئے پیسے نہیں ہیں''۔

'ایک منٹ ٹھہرو'میں نے یوں جواب دیا جیسے تھوڑی ہرجائی ہوں۔ ''کیا یہ ہے کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں یا پھر ہمارے پاس لیڈر شپ نہیں جو پیسے کا صحیح استعمال کر سکے؟ ''

''خدا بہتر جانتا ہے۔'' اُس نے اگلی سانس کے ساتھ درحقیقت جواب دیا۔ 'کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فکر نہ کرو جب تک مسجد باہر سے ٹھوس اور مضبوط ہے''۔

’یہ (مسلمان) فقط علامت نگاری کی پرواہ کرتے ہیں لوگوں کی نہیں‘۔
دوپہر گزر چکی تھی اور مجھے ڈنر سے پہلے ایک اور مقام پر رکنا تھا۔میں نے جلدی چند تصویریں اتاریں(۱۶)، عورتوں کی، ستون کی، بچوں کی، راک کی اور اُس کے بعد نکل پڑی اس احساس کی تنگدامنی کے ساتھ کہ ہمارے اندر کس قدر بے انصافی پائی جاتی ہے جیسے خدا کے نام پر یہ پٹیاں ہیں۔ میرے نگہبان نے مجھے دروازے تک پہنچایا جہاں سے یہ سارا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس بارمیں ایک چھوٹی دوزانو عمارت کے پیچھے کھسک گئی تاکہ اپنے اس پریشان کن لباس (پٹی) سے جان چھڑا سکوں۔ میں اسے بخوشی وقف کے حوالے کرنا چاہ رہی تھی۔ میں انہیں کینہ پرور نگاہ ڈالنے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔
کسی نے مجھے مغربی دیوار پر ہراساں نہ کیا۔ مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ یہودی عورتوں نے مردوں کے ساتھ برابر کی شرائط پر عبادت کرنے کے ضمن میں اپنی جنگ آپ لڑی ہے۔ وہ تو اپنی جنگ کو عدالت تک لے کر گئیں۔ کچھ عورتوں کے ساتھ جھگڑے ہوئے، حتکہ اُن

کو دیوار کے مقام پر جسمانی چوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ عدالتی فیصلوں پر ہنوز پورا عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ وقف کے ساتھ میرے تازہ تازہ تجربے کی بنیاد پر میں بہر حال شکرگزار تھی کہ یہاں پر کوئی شخص مجھ پر نظر نہیں ڈال رہا تھا، کوئی مجھے ڈکٹ ٹیپ کے برابر بھی کپڑا لینے کا نہیں کہہ رہا تھااور کوئی مجھے پارہ یا آیت دکھانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ ایک خون کے غالب تعلق کا سارا مقصد تو ڈرانا دھمکانا ہے۔

مغربی دیوار پتھر کی عمارت کا سامنے کا حصہ ہے جسے بے شمار زائرین پوری دنیا سے یہودیوں کی مناجات کو کاغذوں کے ٹکڑوں پر لکھے تھامے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ ایک ریوڑ کی طرح دیوار کی طرف منہ کرتے ہیں کیونکہ یہودی عقیدے کے مطابق یہ کمیونٹی ٹمپل کا واحد حصہ ہے جو ایک بار وہاں پر کھڑا کیا گیا تھا جہاں 'ڈوم آف دی راک' ٹمپل ماؤنٹ پرآج ہے۔ ہیبرو بادشاہ ڈیوڈ کے بیٹے سلیمان نے 'ٹمپل' کو پرانے اسرائیلیوں کی خدا کے حضور قربانیوں کے مرکز کیلئے قائم کیا تھا۔ اہلِ بابل نے پہلے 'ٹمپل' کو تباہ و برباد کر دیا تھااور یہودیوں نے دوسرا 'ٹمپل' ۵۱۵ قبل مسیح میں تعمیر کیا۔ سن ستر

عیسوی میں رومنوں نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، دوسرے ٹمپل کو زمین سے مٹا دیا اور یہودیوں کو اُن کی سلطنت سے نکال باہر کیا۔ صدیوں تک عیسائیوں نے ٹمپل ماؤنٹ کی زبوں حالی یہودیت کے زوال کی مذہبی علامت کے طور پر ہونے دی۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آخرِکار مسلمانوں نے مقدس شہر کو لے لیا۔ انہوں نے ٹمپل ماؤنٹ کی آب و تاب کو اسلامی نقش ونگاری سے بحال کرنا شروع کر دیا، پہلے مسجد الاقصیٰ پھر 'ڈوم آف دی راک'۔۔ اگرچہ مسلمانوں نے یروشلم کو مسلمانوں کیلئے کھول دیا، دوسرا ٹمپل لولا لنگڑا ہی رہا۔ مسلمانوں نے کبھی اس کی مرمت نہیں کی۔ جبکہ قدامت پسند یہودیوں کیلئے یہ جیسا ہے ویسا ہی رہنا چاہئے۔ ٹمپل کی ازسرِ نو تعمیر مسیحا کا کام ہے جس کا وہ ابھی بھی انتظار کر رہے ہیں۔ تب تک مغربی دیوار یہودیوں کیلئے مرکزی نیوکلیس کا فریضہ سرانجام دیتی رہے گی۔۔ ماضی کی بغیر چھت والی، مستقبل، طاقت اور پستی کی یاد۔۔

میں وہاں تک تیزی سے پہنچ گئی کیونکہ مغربی دیوار یروشلم کے مسلمان حصہ سے ملحق ہے۔ پہلے تو میں

حیران رہ گئی کہ یہودی مسلم اشتراک تو ٹمپل ماؤنٹ کے ساختیاتی ڈیزائن میں بھی موجود ہے۔ بعد میں مجھے ایک اخباری مضمون بھی دیکھنے کو ملا(۱۷) جو یہ پرانی شکایت کر رہا تھا کہ یہ اشتراک یہودیوں کیلئے کسقدر وبال ہے کہ انہیں مغربی دیوار میں پانی رسنے کی مرمت کیلئے بھی وقف سے استدعا کرنا پڑتی ہے۔ امن کی خاطر، آپ نے دیکھا کہ اسرائیل نے ٹمپل ماؤنٹ کی بحالی کے اختیار کا بڑا حصہ مسلمانوں کو دے رکھا ہے۔ ہم خود مختاریت کی بات نہیں کر رہے صرف انتظامی کنٹرول کی بات کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کا کنٹرول دیوار کے تمام تر حصے تک پہنچ جاتا ہے اور دیوار کے پیچھے ہر شے کا احاطہ کئے ہوتا ہے جیسا کہ 'ڈوم آف دی راک' کا ٹوٹا ہوا ستون۔ آپ اسرائیلی قبضے کو بہت ساری توڑ پھوڑ کا الزام دے سکتے ہیں، مگر اُس توڑ پھوڑکا نہیں۔

میں نے ایک پنسل کسی سے پکڑی اور خدا کے حضور ایک گذارش گھسیٹی، پھر ہجوم میں سے جگہ بناتی ہوئی دیوار تک پہنچ گئی ۔ جیسا کہ میں نے ایک خالی درز ڈھونڈنے میں وقت صرف کیا اُس نے میری دعا کو

گرفت میں لے لیا۔ مجھے احساس ہوا کہ کسی یہودی نے مجھے پیچھے سے پکڑا ہوا ہے۔ اس کے باوجود مجھے یہ دخل درمعقولات نہیں لگا۔ مجھے لگا کہ میں اپنی ہی جگہ پر ہوں۔ پہلے سے کہیں زیادہ وجدانی طور پر میں جانتی ہوں کہ میرا خاندان کونسا ہے۔

مجھے بتائیے کہ کیا میں حد سے زیادہ پُرتپاک ہوں لیکن میں اتنا سمجھتی ہوں کہ جب میں ’خاندان‘ کہتی ہوں تو میرے ذہن میں پیغمبر محمد یا ابراہیم کی تصویر نہیں ہے بلکہ وہ چھوٹا بچہ ہے جس کی جانب میں بھاگتی ہوں درحقیقت وہ میرے اندر گھسا چلا آتا ہے۔ ۔۔صبح سویرے۔ ’ڈوم آف دی راک‘ کی جانب جاتے ہوئے میرا گائیڈ مجھے پرانے شہر کے یہودی رہائشی علاقے سے لے گیا۔ ہم اجتماع کے ایک سیلن زدہ مقام میں داخل ہوئے جو پتھروں سے سنوارا گیا تھااور جہاں بچوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بچے ادھر اُدھر چڑھ اُتر رہے تھے۔ میرے گائیڈ نے مجھے بتایا کہ یہ وہ میدان ہے جس کے بارے قدامت پسند مائیں سمجھتی ہیں کہ یہاں اپنے بچوں کو لیجانا پُرتحفظ ہے ، خاص طور پر یشیوا (مذہبی اسکول) کے بعد۔ چند سیکنڈ بعد(۱۸) ایک لڑکا کِپا پہنے ، (کِپا

کی) عبادت گاہوں پر پیچدار تالے مقفل نظر آ رہے تھے اور اُس کی عبادت کی شال کی دھاریاں اُس کی کھلی کالی پینٹ پر جھلکی جا رہی تھیں ، ایک نکر پر مڑا اور میرے اندر ہل سا پھیر دیا۔ وہ ایک پتلے سلور رنگ کے اسکوٹر کو چلا رہا تھا، جو ایک آگے بڑھتے ہوئے معاشرے کی علامت ہے اور اس علامت کو قدامت پسندی بڑھاوا دے رہی ہے۔ حتکہ لفظ پرست یہودیوں کو جدیدیت سے الگ تھلگ رہنے کی ضرورت نہیں ہے، اس سے زیادہ مواقع اور جذبے کیا ہونگے جو مرکزی یہودیوں کو میسر ہیں؟

جب میں نے اس کا ذکر ولولے کے ساتھ اپنی سیکولر یہودی دوست کے ساتھ کیا تو اُس نے اپنا قصہ مجھے سنایا۔ برطانیہ میں پلنے بڑھنے اور اپنے یہودی ورثے سے دوری کے باوجود ازابیل کرشنرنے نوخیزی کی عمر میں اسرائیل پہنچنے پر خود کو ہر قسم کی مہم جوئی کیلئے تیار رکھا۔ یوں مغربی دیوار کے مقام پر ایک قدامت پسند یہودی نے اُس کا انتخاب کیا اور یشیوا میں مفت تعلیم کی پیشکش کی۔ محتاط لوگوں کیلئے یہ پیشکش سنسی خیز ہوتی ہے لیکن ازابیل بھی ایک پستول نکلی۔ وہ وہاں

پہنچ گئی۔ ’وہاں کا ماحول شاندار تھا(۱۹)‘ اُس نے مجھے یروشلم کے ایک ریسٹورانٹ میں بتایا۔ ’لوگ مخلص اور دھنی تھے اور انہوں نے میرے سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کی، ”پوچھتی رہو“ وہ مجھے شہ دیتے تھے۔ آخرِ کار وہ میرے سوالات کا جواب نہ دے سکے، لہذا انہوں نے مجھے ربی کے پاس بھیجا۔ کچھ ہفتوں بعد میں نے فیصلہ کیا مجھے یشیوا کا تو پتہ چل گیا ہے اور کچھ اور جاننے کیلئے یشیوا کو چھوڑ دیا۔ یہ ایک عمدہ تجربہ تھا، کسی نے مجھے مفسد قرار نہیں دیا۔‘ آج وہ یروشلم رپورٹ میگزین کی سینئرنامہ نگار ہے، ازابیل عوام میں ایک ابھرتی ہوئی روشن صحافی کے طور پر جانی جاتی ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ یشیوا کا ہر طالبعلم ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسرائیل کے ایک طویل عرصہ سے غیر ملک میں مقیم نامہ نگار جم لیڈرمین ایک اہم پس منظر پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ’کٹر ربیوں نے اپنے مقلدین پر انٹرنیٹ استعمال کرنے کی بندش لگا رکھی تھی(۲۰) اس بناء پر کہ جو کچھ وہ انٹرنیٹ سے حاصل کرتے تھے۔ اور حال ہی میں وہ اِس کو قائم کرنے میں متفق ہوئے ہیں

جس کو وہ یونیورسٹی کہتے ہیں۔ مگر۔۔۔ انہوں نے خاص طور پر تاریخ، ادبیات، نظریہ ارتقاء کو زیربحث لانے والے سائنسی علوم جیسے بیالوجی اور آسٹروفزکس، اور فلسفہ پڑھانے پر بندش لگا دی ہے۔' میں اس محاذ کے منظرنامہ کو تھوڑا اور بیان کرونگی۔رواج کی پیروی کرنے کا دباؤ ہر جگہ اپنے عقیدے پر اصرار کا موجب بنتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ انسان کی سرشت کا حصہ ہے۔ اسرائیل بطورمعاشرہ جو مختلف کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کو میں احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ اسرائیلی معاشرہ اپنے شہریوں کو پوچھنے اوراپنے تجربات مجتمع کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں حقوق نسواں کی کوئی حامی دیوار گریہ تک رسائی کے برابر حق کے مسئلہ پر حکومت پر دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔یہاں ایک نوعمر لڑکی بدنامی کا داغ لئے بغیر یشیوا کو چھوڑنے کا سوچ سکتی ہے۔ یہاں ایک یہودی مدرسے کا لڑکا آج کی تجارتی مقبول چیز کے استعمال کا علمبردار ہو سکتا ہے۔یہاں لوگ اپنی صلاحیتوں کا بہت ساری چیزوں کے لئے استعمال کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں جیسا کہ وہ خود خدا کی بہت ساری صفات

کی عکاسی کر رہے ہوں۔

فلسطینی علاقوں کا سفر جاری و ساری ہے۔ خیر ایک علاقہ تو بہرحال ہے، ویسٹ بینک۔ ناشتے پر ہمیں ایک سفارتکار نے ' بریفنگ' دی جو براہ راست فلسطینیوں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ اُن پر اعتماد رکھتا تھا۔ '' یہ وہ لوگ ہیں اگر انہیں اُن تک چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی سمت کا تعین کرنا جانتے ہیں(۲۱)''، اُس نے بتایا۔ تاہم 'اُن تک چھوڑ دیا جائے' کا صاف مطلب ہے کہ اسرائیل کا فوجی قبضہ ختم ہو جانا چاہئے۔ اُس نے اشارہ دیا کہ اس کایہ بھی مطلب ہے کہ فلسطینی قیادت کی آمریت کو ایسی حکومت سے بدل دیا جائے جو اس بات کی قطعی پرواہ نہ کرے کہ اِن کا آئین کیا کہتا ہے اور کوئی پرواہ نہیں کہ یہ حکومت قومی مقصد (عرفات کے)سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ 'فلسطینی بہت اعتبار سے اسرائیل سے بہت کچھ سیکھ چکے ہیں ۔ وہ اسرائیلیوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں'، سفارتکار نے ہمیں ہمراز بنایا جب ہم اُس کی بلٹ پروف گاڑی میں ڈھیر ہوئے۔ 'میرے ڈرائیور نے مجھے ایکبار کہا'، ''ہمیں یہاں (فلسطین میں) کیا چاہئے، وہی قانون کی بالا دستی جو

اسرائیل میں ہے۔'' عوام کی تمنا اُسی (ڈرائیور) کی بازگشت ہے۔فلسطینیوں کی رائے کا تجزیہ کرنے والے خلیل شیکاکی کے مطابق، 'جب فلسطینیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کس قسم کی جمہوریت کے مداح ہیں اور چاہتے ہیں تو آج کے روز تک اسرائیلی جمہوریت سرفہرست آتی ہے۔'

ہمارے سفارتکار نے محسوس کیا کہ وہ اَب تک بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ مزاج میں سراسیمگی، تربیت میں محتاط پن کے ساتھ وہ رمالا کے آدھ گھنٹے کے سفر کے دوران خاموش رہے۔ ایسا نہیں تھا کہ کوئی بات قابلِ بحث نہیں تھی۔ ہم نے اپنی پہلی سرحدی چوکی سے باہر ایک ٹریفک سگنل پر بریک لگائی۔ سڑک کے کنارے ایک بڑا سا بورڈکھڑا تھا جس پر بچوں کی تصویریں لپی تھیں۔ عربی زبان کی ایک سطر نعرے کے طور پر نمایاں تھی۔ میں نے سفارتکار سے اِس سطر کے ترجمہ کے بارے پوچھا جو صبح سے ہمارے لئے ڈرائیوری کر رہا تھا۔ پہلے تو اُس نے نہ سننے کا تاثر دیا، پھر نہ دیکھنے کا اور آخر کار 'قریب سے دیکھنے کیلئے' اپنی گردن آگے نکالی، اس موقع پر ٹریفک سگنل بدل گیا اور ہم نے گاڑی

تیزی سے آگے بڑھا دی۔ یہ اُس روز کا واحد غچہ نہیں تھا۔

ہم رمالا اُس روز پہنچے تھے جب اسرائیلی فوج نے کرفیو اُٹھایا تھا تاکہ اسیکنڈری اسکولوں کے طلباء امتحان دے سکیں۔ گلیاں خریداری کرنے والوں سے بھر گئیں جو اگلے ہفتے بھر کا راشن خریدنے کیلئے وقت ختم ہونے سے پہلے بھاگم دوڑ کر رہے تھے۔ گھوڑوں سے جتی ایک گاڑی ایک پرانی جیگوار کار اور نئی اوڈی کار کے درمیان کھڑی تھی۔ ”یورپین کمیشن کے مالی تعاون سے“ بہت ساری حجرہ نما عمارتوں کے باہر یہ لکھا تھا۔ یہ خستہ حال تھیں اور کچھ کے تو تختے بھی اٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے گاڑی سڑک کنارے کیچڑ میں کھڑی کی، اس سڑک کے آخر پر ہماری منزلِ مقصود ایک سفارتی ادارہ تھا۔ باہر سے یہ عمارت کسی بات کا پتہ نہ دیتی تھی، اندر سے اس کی بنت انتہائی بھس بھری تھی۔

میں توقع کے عین مطابق اپنے احساس کی چبھن کو روک نہ سکی۔ ہم وہاں پر سرگرم فلسطینیوں سے ملنے آئے تھے جن میں راجہ شہادے ایک مصنف، وکیل اور غیرجانبدار انسانی حقوق کی تنظیم ’الحق‘ (انصاف)

کے بانی ہیں۔ میں نے اُن کی موجودگی کیلئے کہا تھا، کم از کم وہ پرنٹ میڈیا سے تو تعلق رکھتے تھے، وہ ایک ایسی نرت اٹھتی انگلی ہیں جو' دوسروں' کو قصوروار ٹھہرانے کیلئے بیٹری سے چلتی ہے۔ کسی صفحہ پر (اپنی کتاب کے) شہادے نے ایک نازک سے فرق کو دکھانا چاہا۔ میں اُس سے اُس کی تازہ کتاب 'گھر میں اجنبی: مقبوضہ فلسطین کا ایسا دور' کے بارے بات چیت کرنا چاہتی تھی۔ یہ کتاب اُس کے باپ کا خاکہ بھی پیش کرتی ہے ۔ اُس کا باپ عزیز پہلا نمایاں فلسطینی تھا جس نے اسرائیل کو تسلیم کیا تھا اور دو ریاستوں کی بنیاد پر حل بھی پیش کیا تھا۔ شہادے کے بقول عرفات کے ایک مصاحب نے عزیز کو ایک عربی ریڈیو میں 'قبیح ترین غدار' کے نام سے پیش کیا تھا۔ 'تمہیں اپنی غداری کی قیمت چکانا ہو گی(۲۲)' ایک بھاری بھرکم آواز نے فرمان جاری کیا تھا۔ 'ہم تمہیں ختم کر دیں گے، ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیں گے، دوسروں کیلئے عبرت کی مثال بنا دیں گے۔' فلسطین کی انجمن وکلاء نے عزیز کا وکالت نامہ واپس لے لیا۔ کچھ سالوں بعد وہ مشکوک طور پر قتل ہو گیا۔ میں نے اندازہ

لگایاکہ شہادے کی بیباک کتاب شہادے کی اس خواہش کا پتہ دیتی ہے کہ وہ امن کی راہ میں حائل آبائی رکاوٹوں پر مزید بات کرنا چاہتا ہے۔
جب ہم عمارت کے اندر پہنچے تھے تب وہ نہیں تھا بلکہ دو دیگر سرگرم سیاسی لوگ تھے۔ پہلے ڈاکٹر علی جرباوی ،ایک سیاسی تجزیہ نگار، نے تاریخ کا ایک طویل لیکچر دیا، پھر انہوں نے دل کو' چھو' لینے والے دلائل سے ہمیں پرچایا۔ 'ہمیں اپنے ساتھ مذاق نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں پر کوئی نرم قبضہ نام کی شے نہیں ہے۔ قبضے کا مطلب ہے کہ اپنی شناخت کھو دینا۔ آپ نے سرحدی چوکیوں پر دیکھا جہاں سے آپ گزر کر آئے ہیں، ہم تو حرکت تک کر نہیں سکتے۔'
'خود کش بم دھماکے بند کروائیے، تب ہر کوئی نقل و حرکت میں ہو گا'۔ کمرے میں موجود ایک صحافی بولا۔
ڈاکٹر جرباوی نے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا کہ دھماکوں کے وبا بننے سے پہلے فلسطینیوں کی نقل و حرکت کہیں زیادہ تھی۔ انہوں نے اپنی چھاتی کی جیب سے ایک سبز رنگ کا پاس باہر نکالا۔ 'میں اس کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں جہاں بھی جاتا ہوں۔ کسی دوسرے شہر میں

لوگ کسی دوسرے رنگ کا پاس ساتھ رکھتے ہیں۔ ہماری گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں دوسرے رنگوں کی ہیں۔ یہ نسلی عصبیت ہے (۲۳)۔' پھر کیوں، کسی نے جملہ معترضہ کے طور پر کہا، عرفات ۲۰۰۰ء کے موسم گرما میں ایک آزاد ریاست کے سب سے سنہری موقع سے بھاگ گیا تھا۔۔

ایک ایسا منصوبہ جسے امریکی صدر بل کلنٹن نے فلسطینیوں کی اکثریت کی خواہش کے مطابق پیش کیا تھا؟ ڈاکٹر جرباوی نے اس پیشکش کو ایک دھوکے کا نام دیا اور کہا کہ یہ بنتوستان بنانے کی کوشش تھی یا نیم خود مختار کالونیاں بنانے کی سعی تھی جیسا کہ جنوبی افریقہ کے نسلی عصبیت والے عہد میں موجود تھیں۔ اگر یہ سب صحیح ہے تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کیوں عرفات نے متبادل پیشکش میز پر نہ رکھی؟ کیوں اُس نے اِس عمل کو صریحاً رد کر دیا اور اپنے لوگوں کو مزید معاملہ کرنے کے امکان سے نکال باہر کیا؟

ایک تنازعہ والے مباحثہ کے دوران راجہ شہادے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوئے۔ اُس نے نیچی آواز میں ایک افسردہ و بے کیف سا انداز اپنائے رکھا۔ عبدالمالک الجابر، ایک دوسرے سرگرم سیاسی کارکن جو سارا وقت

ڈاکٹر جرباوی کے ہی ہمنوا رہے ، یہ یقین دلانے کیلئے بولے کہ نسلی عصبیت کا معاملہ ہماری مشکلات کی وادی تک ہی نہیں ہے۔ 'میری بیوی کے پاس یروشلم کی آئی ڈی ہے اور جب اُس نے اسرائیل خاص میں ہماری بیٹی کو جنم دیا(۲۴)...' اُس نے اپنے نومولود بچے کی ہیلتھ انشورنس کے فارم پُر کرنے کے ضمن میں بیوروکریسی کے چکروں کی تفصیلات فراہم کیں۔ اُن کی کہانی کا سبق یہ تھا کہ نسلی عصبیت کے حالات نے عربوں کیلئے اسرائیل میں بھی آزار پیدا کئے ہیں فقط ویسٹ بینک یا غزہ کی پٹی کی بات نہیں ہے۔ 'ہم یروشلم کے باسی ہیں اور ہم تمام ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن نسلی منافرت کی بناء پر ہمارے حقوق سے انحراف کے راستے موجود ہیں'۔ اُس نے بتایا۔ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ جمہوریت کسی ملک میں اقلیتوں کو ضرر پہنچانے کے حق میں نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے ، کتنے زیادہ فوجی رنگروٹ امریکہ کے ہائی اسکولوں کے اسکاؤٹوں میں سے ہیں جو زیادہ تر ہسپانوی النسل ہیں۔ اسرائیل بھی نسل پرستی کا ارتکاب کرنے سے ماورا نہیں جیسا کہ 'ہارٹز' اِس بارے چھاپنے والوں میں سرفہرست ہے۔ تاہم تین ماہ کے طویل اور

پیچیدہ طریقہ کار کے بعد الجابر اور اُس کی بیوی کو اپنی بیٹی کی ہیلتھ انشورنس کا اندراج کرانے میں کامیابی ہو گئی۔ لہذا کیا اِن کے حقوق آخرکار نہ ملے؟ یہ کوئی بال کی کھال اتارنے والی بات نہیں ہے اور نہ گورنمنٹ کو نسلی عصبیت کا ذمہ دار ٹھہرانے والی ہے لبتہ میرے پاس فوری نوعیت کے سوالات ہیں۔ اِن تین فلسطینیوں میں سے دو نے فریضے کے طور پر رٹی رٹائی باتیں بیان کیں، کیا تیسرے نے بھی ایسا کیا؟ یاپھر کیا ہم کچھ نہ کچھ سنیں گے۔۔ اِس بارے میں کہ کیسے ہمارا اُن کے خلاف کرخت دو لخت ہو جانا، یہودی بمقابلہ عرب، دونوں لوگوں کی مضحکہ خیز ی؟ تمام آنکھیں شہادے پر تھیں۔ جھجھکو سا، وہ اپنی کتاب کھولنے لگا۔ 'اتاترک کے پٹھے! میں نے خاموشی سے داد دی۔'

'صفحہ ۱۷۳'، شہادے نے اعلان کیا(۲۵)۔ اُس نے پڑھنا شروع کیا۔ 'نظریہ اور بلڈوز اس دھرتی کی نحوستیں ہیں۔ پہلی شے تحریک دیتی ہے اور دوسری ایک دن میں وہ کچھ ممکن بناتی ہے جوکئی آدمی مہینوں میں بھی نہیں کر سکتے'۔ شہادے نے اگلے چند منٹ

اُس ٹیکنالوجی اور ایجنڈا کے بارے باب پڑھتے ہوئے لگائے جو فلسطینیوں کو بے دخل کرتے وقت اسرائیلیوں کے پاس تھے۔ اُس کی کتاب کو دو بار پڑھنے کے بعد اور کئی اہم پیراگراف کو عملی طور پر ذہن نشین کر لینے کے بعد میں نے غور کیا کہ اِن حالات میں شہادے اہم حصہ تک پہنچنے سے پہلے رک جاتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جہاں اُس کا باپ کہتا ہے کہ فلسطین کا پائیدار حل بات چیت کے ذریعے ہی ممکن ہے، کسی پر بمباری کے نتیجہ میں نہیں۔ اُس کا ٹھیک ٹھیک یہ کہنا تھا، 'فقط سیاسی حل ہی کام آ ئے گا(۲۶)'۔ 'اور جلدی قبل اس کے کہ کچھ بولنے کو باقی نہ رہے'۔ سیاسی حل اور جلدی، بعینہ یہی موقع عرفات کے پاس تھا لیکن اُس نے اُس سے فائدہ نہ اٹھایا۔

میں ششدر تھی کہ شہادے نے بات کو کہاں سمیٹا ہے۔ میں اس بات کو بھی سمجھتی ہوں کہ یہ باب خاص طور یہ جانتے ہوئے ختم ہوتا ہے کہ کیوں ایک بے لاگ دانشوردو ہم وطنوں کے سامنے خود کو سنسر کرتا ہے۔ فلسطین میں رہتے ہوئے، وہ اپنی کتاب میں جگہ جگہ لکھتا ہے، 'یہ سماج تباہی، حوصلہ شکنی کو ہوا دیتا ہے

اوراُن کو کھا جانے والے متشدد حسد سے نیچے لاتا ہے جو آگے بڑھتے ہیں۔ یہ وہ سماج ہے جو تمہاری چاپلوسی کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ تمہاری بیشتر توانائیاں ایسے کام کرنے میں خرچ ہونگی جو تمہارے اعمال کو عوامی پذیرائی بخشیں کیونکہ تمہاری بقاء سماج کے ساتھ اچھے تعلقات استوار رکھنے پر مشروط ہے (۲۷)‘۔ مجھے تل ابیب میں میوزیم کی نگران کی بات یاد آئی کہ ’’ یہ اُس کی احتیاط پسندی ہے کہ میرے ہم منصب نے میرے فون کا کبھی جواب نہیں دیا‘‘۔ کل شکار کنندگان کے ساتھ مل کر چلنے سے انکار کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے جسے شہادے کے باپ نے ادا کیا۔وہ ایک متحرک اور عوامی جذبے کے انسان تھے جنہیں کبھی آگے بڑھنے نہیں دیا گیا۔وہ ایک مثالی انسان بن چکے تھے (۲۸)۔‘میں اُن کے بیٹے سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ اپنے بارے میں بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ مگر مجھے اپنا سوال سفاک سا محسوس ہوا۔ یہی کافی اہم تھا کہ اُس صبح جب رمالا کے لوگ گھوم پھر سکتے تھے، راجہ شہادے نے آدھے سچ کے راستے سے ماورا ہو کر جرات کا اظہار کیا۔

ہماری ملاقات ایک دم اُس وقت ختم ہو گئی جب فلسطینیوں کو یاد آیا کہ اُنہیں اپنا پیام پہنچانے کیلئے اتنا ہی وقت ملا تھا اس سے پہلے کے کرفیو دوبارہ لگ جائے۔ ہم نے کمرے کو خالی کیا، بھوک لگی ہوئی تھی اور تھوڑے مضطرب بھی تھے کیونکہ منتظمین نے لنچ پر ہیم اور چیز کے سینڈوچز تیار کئے ہوئے تھے۔ ہیم اور چیز(۲۹)! صحافیوں کے ایک ایسے گروہ کیلئے جس میں ایک مسلمان اور چند یہودی شامل تھے۔ یہ لنچ سفارتکاری کے ایک گوشے میں دیا گیا تھا۔ اندازہ کیجئے۔

ہماری آپس میں اِس مڈبھیڑ کے دوران کہ اِس کھانے کے ساتھ کیا کیا جائے، میں ایک طرف ہٹ کر میگزین ریک پر رکھے مجلوں کی طرف بڑھ گئی۔

وہاں پر ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط کے زمانہ کی رپورٹیں، مطالعے اور نصابی مجلے پڑھے تھے۔ میں نے چند ایک سے اپنا بیگ بھرا تاکہ میں وہاں کا نقطہ نظر بھی جان سکوں اور ہاں میں ٹوہ میں بھی تو لگی رہتی ہوں۔ یہ میرا متجسس پن ہی ہے کہ میں ائرپورٹ کے گرداگرد کتب خانوں کو چھان رہی تھی۔ یہ کتب خانے

اِس بات کا عکس ہوتے ہیں کہ کوئی معاشرہ اپنے لوگوں کے لئے کس طرح کے خیالات رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ اُس رات واپس ٹورونٹو کی فلائٹ سے قبل میں بن گوریون ائرپورٹ میں داخل ہوئی، رمالا میرے سر پر سوار تھا ۔۔ اور کوشش تھی کہ ایسی کتب ڈھونڈ لوں جن میں اسرائیل فلسطین تنازعہ کے حوالے سے مواد ہو۔ میں نے ایسی فقط دو کتب دیکھیں، ایک جو نسبتاً غیر جانبدار تھی اور دوسری عربوں کیلئے بالعموم ہمدردانہ تھی۔ اسرائیل اپنی حدود میں تاریخ دانوں کو سولات کرنے کی اجازت دیتا ہے ، اس لئے اُس کے قومی ائرپورٹ پر ایسی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ جائیے اور خود جائزہ لیجئے۔ جبکہ میں ابھی تک ویسٹ بینک میں سرگرم فلسطینی کارکنوں کے شدت کیساتھ عائد کئے گئے نسلی عصبیت کے الزامات کو سر سے جھٹک نہ سکی تھی۔ دن چڑھتا تھا اور گزر جاتا تھا ، اِن گزرتے دنوں کو معلوم ہے کہ میں نے کیا دیکھا: جوان اسرائیلی عورتیں اور مرد اپنی چھاتیوں پر گنوں کو باندھے ہوئے ہیں۔ سرحدی چوکیوں کے درمیان دھول اڑاتی میلوں لمبی سڑکیں پیدل چلنے والوں کیلئے ہیں۔ روکھے فوجی جو عربی کا ایک لفظ بھی

نہیں بولیں گے چاہے انہیں آتا بھی ہو۔ شناختی کارڈ، کاٹ دار تاریں، مسلح ٹینک، پھیلتی ہوئی یہودی آبادیاں جو مضافاتی لگتی ہیں اور جنہیں ختم ہوتے سالہا سال لگیں گے اور تب تک فلسطینیوں کیلئے انصاف میں بھی اتنی ہی تاخیر ہوتی جائے گی۔ میں انسانی اخلاقیات میں ڈوبی ہوئی تھی مگر صورتحال مجھ پر آشکار ہوتی جا رہی تھی۔

جہاز میں میں نے رمالا سے اٹھائی ہوئی مطبوعات میں سے ایک کو کھولا جو 'فلسطینی مطالعہ کا مجلہ' کا ایک شمارہ تھا۔ اس پر ۱۹۹۷ء کی تاریخ تھی، وہ برس جب امن کی راہ کے وعدے میں ہنوز ایک برس تھا۔ پہلے مضمون میں لکھا تھا کہ جنہوں نے اسرائیل کی بنیاد رکھی انہوں نے جمہوریت کو دبا کر ایسا کیا۔ مصنف نے ایک یہودی رہنماچیم ویزمان کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے اعتراف کا حوالہ دیا، ''ہم اپنے مقدمہ کا دارومدار عربوں کی اجازت پر نہیں رکھ سکتے، اگر اُن سے اُن کی اجازت کا پوچھا گیا تو وہ قدرتی طور پر ناں کر دیں گے (۳۰)۔''میں اِس مضمون کو جتنا پڑھتی گئی مجھے مصنف کی تلخی کا اندازہ ہوتا چلا گیا۔

میں نے اِسی مجلہ میں ایک ایسے شخص کا ’اعتراف‘ بھی پڑھا جو غزہ سے کئی برس بعد واپس لوٹا تھا۔ ۱۹۹۷ء میں ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ اگر خود مختار فلسطین معرضِ وجود میں آ بھی چکا ہوتا اور وہ شخص آزادی کے بعد واپس اپنے وطن لوٹتا۔ وہ کیا دیکھتا، ایک ایسا معاشرہ جہاں ایمانداری کی قلعی کی گئی ہوتی(۳۱)، پرانی رنجشوں کوباہر نکالنے کیلئے مواقع ڈھونڈے جاتے۔ ’یہاں نئی نئی سفیدی کی ہوئی دیواریں ہیں۔۔ دیواریں جو ایک فلسطینی کے سیدھا اسرائیلی گولی لگنے سے مارے جانے کے بعد، فقط چند دنوں بعد تمام معلوم اور نامعلوم تنظیموں تعزیتی پیغامات سے پلاسٹر کر دی گئی ہیں جو اُس کو ہیرو اور شہید قرار دے رہی ہیں اور اُس کے قاتلوں کو ہولناک انجام کی دھمکی دے رہی ہیں۔ سچائی اور چمکتی ہوئی سفید دیواروں کو قربان کر دیا گیا ہے، جبکہ یہ طے ہے کہ مرنے والے کا کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شہیدوں کی پیاس نہ بجھنے والی ہے، یہ ایک مستقل جذبہ ہے۔‘
حتکہ نسبتاً پُرامیدی کے دور میں مرنے کی خواہش نے فلسطینی مسلمانوں کو مرنے کی خواہش نے اپنے قبضہ

میں لیا ہوا تھا، ایسا کیوں؟ ہمارے اعتراف کرنے والے کے بقول، ’یہ خواہش قبضے کی سختیوں کی وجہ سے ہی نہیں تھی‘، پھر ممکن ہے کہ اپنی ذات کے دروں بین مشاہدے کو رد کرنے کی وجہ سے ہو۔ اس بات نے ’قدروں کو ڈھا دیا جن کے ساتھ سماجی عہدوپیمان وابستہ ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کوہر قسم کی تنقید سے ماورا کر لیناکیا خود اعتمادی کی انتہا نہیں ہے کہ خود کو خول میں بند کر لیا جائے اور باقی دنیا سے اپنا رابطہ منقطع کر لیا جائے۔ اِس کی قیمت بہت گراں ہوتی ہے‘۔

مجھے یہ جاننے میں اَب دقت نہ رہی کہ کیسے مسلمانوں نے قرآن کی تنبیہ سے اپنا عہد توڑا، ’خدا اُن لوگوں کی حالت نہیں بدلتا جو اپنی حالت آپ نہیں بدلتے (۳۲)‘۔ اسرائیلی ذرائع ابلاغ نے مجھے یقین دلایا کہ کمیونٹی کے عیوب کو نشر کرنے میں کوئی پریشانی نہیں۔ وقف نے مجھے دکھایا کہ منہ بند رکھنے میں بہت ہزیمت ہے۔ چاہے وہ پٹیوں کی صورت میں ہو اور چاہے کسی اور شکل میں۔ جہنم میں جائیں یہ منہ بند رکھنے والے۔ ہم مسلمان اپنے آپ کو اور کیا کچھ نہیں بتا رہے تاکہ ہم ظلم کی حمایت کرتے رہیں اور زندگی گزارتے

رہیں؟

حوالہ جات:

۱ ۔ ویب سائٹ پر تصویر دیکھئے۔

۲ ۔ اخبار Ha'aretz newspaperکے مدیر Micahel Handelsalz کے ساتھ تل ابیب میں مورخہ ۵ جولائی ۲۰۰۲ء کو ملاقات

۳ ۔ Conversation with Nehama Guralnij, curator of the Tel Aviv art museum, Tel Aviv, July 5, .2002

۴۔ Tovah Lazaroff, Alisa Rose and Melissa Radler, Lapid remark against religious US immigrants sparks anger," Jerusalem Post, July 9, 2002. The parliamentarian in question is Yosef "Tommy" Lapid, leader of the avowedly secular Change Party. لیپڈ ایرئیل شیرون کی حکومت میں تب سے وزیرانصاف چلے آ رہے ہیں۔

۵۔ A racist bill," Ha'aretz editorial, July 9," .2002

۶ ۔ Be quiet, bye-bye," Ha'aretz editorial, June"

24, 2002

Andree Aelion Brooks, "Renaissance ۔ ۷
.woman," Ha'aretz, June 24, 2002

Note: See, for example, Arieh O'Sullivan,۔ ۸
"IDF 'Spokesman' is a woman," Jerusalem Post,
.July 9, 2002

۹ ۔ ویب سائٹ پر تصویر دیکھئے۔

۱۰ ۔ Ron Edelheitسے مورخہ July 6, 2002کویروشلم
میں بات چیت

۱۱۔ میرا دورہ سات جولائی ۲۰۰۲ء کو ہوا۔

Khaled Abu Toameh, "How the war began," ۔ ۱۲
.Jerusalem Post, September 19, 2002

یہ سارا مضمون پڑھنے کے لائق ہے لیکن مجھے ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ ''فلسطینی اتھارٹی کے وزیر مواصلات اماد فالوجی نے گیارہ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو اعتراف کیا کہ تشدد کا منصوبہ شیرون کی 'اشتعال انگیزی' سے کہیں قبل جولائی میں بنا لیا گیا تھا۔ وزیر موصوف کا کہنا تھاکہ جو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ انتفادہ شیرون کے مسجدِ اقتصیٰ کے ناقابلِ قبول

دورہ کی وجہ سے شروع ہوا، غلط ہے۔ چاہے یہ دورہ ایک ایسی لاٹھی کی صورت ہوتا جو فلسطینیوں کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ کر رکھ دیتا۔ اِس انتفادہ کا منصوبہ پیشگی اُس وقت ہی بنا لیا گیا تھاجب صدر عرفات کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات سے لوٹے تھے جہاں اُنہوں نے مذاکرات کی میز کو صدر کلنٹن کے سامنے اُلٹا کر رکھ دیا تھا۔ عرفات کلنٹن کے سامنے ہٹ دھرم اور ایک چیلنج کے طور پر رہے۔ انہوں نے امریکی شرائط کو امریکہ کے دل میں بیٹھ کر رد کر دیا تھا۔ ‘‘

عرب صحافی تومہے نے مجھے بتایا تھا کہ’’ مجھے فلسطینیوں کے گندے رویوں کو بیان کرنے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا مگر میرے حقائق کا کبھی بھی جواب نہیں دیا گیا، ایک بار بھی نہیں‘‘۔ یکم جولائی ۲۰۰۳ء کو یروشلم میں بات چیت۔ ۳ ۔ویب سائٹ پر تصویر دیکھئے۔

۱۴۔ ویب سائٹ پر تصویر دیکھئے۔

۱۵۔ میں جس ایجنسی کا حوالہ دے رہی ہوں وہ ’’United Nations Relief and Works Agency for Palestine Refugees in the Near East‘‘ ہے ، اسے UNWRA بھی کہتے ہیں۔

۱۶۔ ویب سائٹ پر تصویر دیکھئے۔

۱۷۔ Etgar Lefkovits, "Wakf to investigate Western Wall leak," Jerusalem Post, July 8, 2002.

۱۸۔ ویب سائٹ پر تصویر دیکھئے۔

۱۹۔ Isabel Kershner, conversation in Jerusalem, July 8, 2002.

۲۰۔ Interview with Jim Lederman, Jerusalem, July 9, 2002.

۲۱۔ میں اُس سفارتکار کو جانتی نہیں، جس کی ہمارے ساتھ گفتگو اُس کے فرض کا حصہ تھی، کسی سے تعلق کی نسبت کی وجہ سے نہیں تھی۔ یہ گفتگو ۸جولائی ۲۰۰۲ء کو ہوئی۔

۲۲۔ Raja Shehadeh quoting Arabic radio in Strangers in the House: Coming of Age in Occupied Palestine (South Royalton, Vermont: Steerforth Press, 2002), p. 68.

۲۳۔ ڈاکٹر علی جرباوی سے رملہ میں ۸جولائی ۲۰۰۲ء کو بات چیت

۲۴۔ عبدل مالک الجابر سے رملہ میں ۸جولائی ۲۰۰۲ء کو بات چیت

۲۵ ۔ Raja Shehadeh reading from Strangers in the House, p. 173.

۲۶۔ کتاب Strangers in the House میں عزیز شہادے کا تذکرہ

۲۷۔ Raja Shehadeh, Ibid., p. 176

۲۸۔Raja Shehadeh, Ibid., p. 176

۲۹۔جب میں نے مشعل کو یہ داستان سنائی تو اُس نے فوری طور پر میرے اوپر قہقہہ لگایا۔" اگر تم اتنی ہی غیر راسخ العقیدہ ہوتو۔۔" اُس نے میرے اوپر پھبتی کسی، "پھر کیوں تم سور کا گوشت نہیں کھاتی؟"میں یقین سے کہہ نہیں سکتی کہ میرے پاس کوئی مناسب جواب ہے۔

۳۰۔ ولید خالیدی نے چیم ویزمان کا حوالہ یہاں دیا ہے:

Revisiting the UNGA Partition Resolution," Journal" of Palestine Studies, Issue 105, Autumn 1997, p. 15

۳۱۔ Hassan Khader, "Confessions of a Palestinian Returnee," Ibid., pp. 89-90

۳۲۔ قرآن ، ۳۱:۱۱

کون کس کو گمراہ کر رہا ہے؟

فلسطینیوں میں ایک لطیفہ مشہور ہے جو اِس طرح ہے۔ عرفات شہید کے طور پر مرتا ہے اور جنت میں پہنچتا ہے۔ وہاں وہ اپنے عزیز شہداء کا ہجوم دیکھتا ہے جو باکرہ حوروں اور انگوروں کی شراب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ فرشتوں نے اُن کا داخلہ روکا ہوا ہے۔ جب بیزارکُن ہجوم عرفات کو دیکھتا ہے، اُنہیں اطمینان کا سانس آتا ہے۔ 'ہمارے صدر آگئے ہیں، وہ مداخلت کریں گے'۔ وہ ایک دوسرے کو دلاسا دیتے ہیں۔

عرفات چکرایا ہوا ہے۔ 'تم لوگ اندر کیوں نہیں ہو؟' وہ پوچھتا ہے۔

'ہمارے نام فہرست میں نہیں ہیں'، اُس کے لڑکے جواب دیتے ہیں۔ 'اُن کے پاس (فہرست میں) فلسطینیوں کا کوئی نام ہی نہیں ہے۔' سو عرفات جھجکتے قدموں سے کھڑکی کی جانب بڑھتا ہے اور کلرک فرشتے سے اپنا تعارف فلسطینی لوگوں کے رہنما کے طور پر کراتا ہے۔

'کون؟' منتظم فرشتہ استفسار کرتا ہے۔

’فلسطینی عوام‘ عرفات غراتا ہے۔
کلرک فرشتہ داخلے کے اہل لوگوں کی تمام فہرستیں چھانتا ہے اور اپنی معذرت کا اظہار کندھے اُچکا کر کرتا ہے۔ عرفات خدا کو ملنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ فرشتہ اندر خدا کو بتانے جاتا ہے کہ کوئی دروازے پر ہے اور چلا رہا ہے کہ وہ اور اُس کے لوگ شہداء ہیں اور جنت میں اپنا صحیح مقام لینا چاہتے ہیں۔ لیکن فرشتہ نشاندہی کرتا ہے کہ ’یہ لوگ فہرست میں نہیں ہیں‘۔
’تمہیں یقین ہے؟‘ خدا پوچھتا ہے۔
’مجھے سمجھ نہیں آرہا، میں نے فہرست کو متعدد بار دیکھا ہے‘۔ مقدس بیوروکریٹ جواب دیتا ہے۔
خدا کچھ دیر تک سوچتا ہے پھر فیصلہ کرتا ہے۔ ’’تم جبرئیل فرشتہ کو کیوں نہیں کہتے ہیں کہ وہ تب تک اِن کیلئے کیمپ لگا دے جب تک ہم اِن کیلئے کوئی حل نہ ڈھونڈ لیں(۱)۔‘‘
یہاں پر قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ جنت میں بھی زمین کی طرح فلسطینی سدا مہاجر ہیں۔ یہ لطیفہ فلسطینی عوام کے احساسِ محرومی کے بارے ہے کہ اُنہیں کوئی قبول نہیں کرتا حتکہ اُن کی حمایت میں شیخیاں بگھارنے والی عرب

اقوام بھی نہیں۔ آپ فلسطینیوں کو عرب دنیا کے یہودی کہہ سکتے ہیں۔

اسرائیلی ریاست قائم کرنے کی تحریک، جسے 'زایونزم' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، انیسویں صدی کے آخر میں یورپ سے نکلی۔ صیہونیوں نے محسوس کیا کہ یہود مخالف جذبات جانے والے نہیں اور ممکن ہے کہ مزید بڑھتے جائیں۔ یہودیوں نے متنبہ کرتے ہوئے قومی سلطنت کی ضرورت پر زور دیا۔ اور یہودیوں کو یہ سلطنت دائرہ قطب جنوبی کے مقام پر نہیں چاہئے تھی اور نہ یوگنڈا میں بلکہ مشرقی پٹی کی ریت اور زمین کے قریب جہاں انہوں نے اپنی ابتدائی، گہری اور نہ ختم ہونے والی جڑیں ڈھونڈیں تھیں۔۔ وہ زمین جہاں عربوں نے بعد میں فلسطین کا ٹھپہ لگایا تھا۔

یہ بہت متنازعہ بحث ہے کہ کیا یہودیوں کا فلسطین کے ساتھ تاریخی تعلق ہے اور لہذا یہ اِس جگہ کو اپنا گھر کہہ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ پہلے محققین کی ایک بین الاقوامی ٹیم کی ڈی این اے کے مطالعہ پر مبنی ایک رپورٹ، جو نیشنل اکیڈمی آف سائنسز میں شائع ہوئی، پر نظر ڈالتے ہوئے دیکھتے ہیں

کہ یہودی اور عرب ایک موروثی بات ضرور مشترک رکھتے ہیں کہ اِن کا 'مشترکہ مشرقِ وسطیٰ کا جنم' ہے (۲)۔

اسلامی تعلیمات اِس بات سے اتفاق کرتی ہیں۔ اِن کا کہنا ہے کہ اسمٰعیل جنہوں نے عرب قوم کی بنیاد رکھی اور اسحاق جنہوں نے یہودی قوم کی بنیاد رکھی، ابراہیم کے پیدا کردہ دو سوتیلے بھائی ہیں۔ پیغمبر محمد کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ اسمٰعیل کی نسل سے ہیں جبکہ موسیٰ اور عیسیٰ اسحاق کے خاندان کی طرف سے آئے۔ اِن سب کا ابراہیم سے خونی رشتہ تھا۔ اور اگر آپ کیلئے اتنا کافی نہ ہو تو قرآن کو سنئے۔ 'ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ زمین پر نکل کھڑے ہو جاؤ اور جب خدا کا وعدہ پورا ہونے کو آئے گا، ہم تمہیں ایک ساتھ اکٹھا کر دیں گے (۳)۔' مجھے کسی بات کو خاص طور پر الگ کر کے پیش کرنے سے چڑ ہے مگر اِس آیت کو خصوصا بیان نہ کرنے کے انتخاب سے بھی چِڑ ہونی چاہئے۔

آخر میں، پھر دوبارہ صیہونی ریاست کے قیام کی تحریک کی جانب چلتے ہیں۔ جب یورپ کے یہودی فلسطین پہنچے، انہوں نے وہاں پہلے سے مقیم اپنے ہم

مذہبوں کے بارے سرسری معلومات اکٹھی کیں ، جو اُس جگہ رہ رہے تھے جسے آج ویسٹ بینک کہا جاتا ہے۔
یہودی یہاں کب آئے ؟ ممکن ہے یہودی یہاں پر ہمیشہ سے ہی ہوں؟ ویسٹ بینک میں نئے آنے والوں کو اکثر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جو اُن کی غیر قانونی طور پر پھیلی دور دراز کی آبادیوں کی وجہ سے تھا۔ لیکن اِس کے آس پاس ہی کہیں اُن کا آبائی وطن تھا۔ یہ چیخنا چلانا کہ یہودی فلسطین پر باہر کے غاصب ہیں، اتنا ہی جاہلانہ ہے جتنا گلا پھاڑ کر یہ کہنا کہ عربوں کی اسرائیل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔
پھر کیسے فلسطینی باہر کے مہاجر ہو گئے حتکہ عرب دنیا کے اندر؟ جنگ کی توڑ پھوڑ کے دوران عرب ممالک میں ایک تنازعہ ابھرا کہ وہ اپنے عین درمیان میں اسرائیلی ریاست کا وجود برداشت نہ کریں گے۔ ۱۹۴۸ء میں یہودی ریاست کے قیام کے ایک روز بعد پانچ عرب ممالک کی فوج اسرائیل کے اندر گھس آئی اور فلسطینی مہاجر مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا۔ کچھ شہروں سے اسرائیلی فوجوں نے عربوں کو نکال باہر کیا اِس متنازعہ حکمتِ عملی پر بنیاد کرتے ہوئے جسے ڈیلٹ پلان

کا نام دیا گیاتھا۔ اِس پلان نے فلسطینیوں پر جو ظلم ڈھائے ، اِس سے اَب اسرائیل کو بھی انکار نہیں رہا۔ دوسرے لفظوں میں، اگرچہ بہت سارے عرب اسرائیل میں بسے رہنے کے خواہشمند تھے ۔۔ اور بہت سارے اسرائیلی شہریت قبول کرنے میں گومگو کی حالت میں رہے۔ مزید بہت سارے فلسطینیوں نے چلے جانے کا راستہ چنا اِس پوری اُمید کے ساتھ کہ جب یہودیوں کو سمندر میں ڈبو دیا جائیگا وہ واپس آ جائیں گے۔

اِن فلسطینی مہاجروں نے ہجرت کر جانے کا حکم اسرائیلیوں سے نہیں لیا بلکہ عربوں سے لیا۔ شام کے وزیرِاعظم خالد الاعظم نے جنگ کے دوران یہی کہا تھا۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء کی اپنی یادداشتوں میں لکھا، ’’عرب حکومتوں کی جانب سے فلسطین کے باسیوں سے اُنہیں اپنا علاقہ خالی کرنے کا کہا گیااور عرب حکومتوں کی سرحدوں پر رہنے کا کہا گیا جب ہم نے اُن کے درمیان دہشت کا ڈول ڈال دیا تھا۔۔ ۱۹۴۸ء سے اَب تک ہم اِن مہاجروں سے واپس گھروں کو جانے کا کہہ رہے ہیں(۴)۔ لیکن ہم ہی ہیں جنہوں نے اُن کی ہجرت کو پروان چڑھایا تھا‘‘ الاعظم نے رنجیدہ خاطر ہو کر لکھا، ’ہجرت کی اس

مشترکہ فلائٹ نے یہودیوں کی مدد کی جن کی پوزیشن اپنی طرف سے کچھ کئے بغیر اورمستحکم ہو گئی ۔ ‘
فلسطینی مہاجر بحران کو ٹانگنے کے ضمن میں اسرائیل کو اِس سے زیادہ کیا کرنا تھا۔
اقوامِ متحدہ نے بھی اِس بحران کو بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ آج یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ پینتیس لاکھ فلسطینی مہاجر ہیں، اگرچہ یہ اُس تعریف کے مطابق ہے جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے لوگوں کے بارے نہیں کی جاتی۔ اِس تعریف کے مطابق صرف اُن بنیادی مہاجرین کو ہی شمار نہیں کیا جاتاجن کی تعداد سات لاکھ ہے بلکہ اُن کے بچوں اور اُن کے بچوں کی اولادوں کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک تہائی شہری ’کیمپوں‘ میں رہتے ہیں جو نئی بلندوبالا عمارتوں، کھلے میدانوں اور پرائیویٹ فلسطینی بنگلوں کے درمیان میں ہیں۔
افسوس اور غیر متعلقیت کا مقام ہے۔ آخر لاکھوں یہودیوں کو بھی تو ۱۹۵۰ء کی دہائی میں عرب ممالک سے نکال باہر کیا گیا تھا، اُن کو پھر بھی مہاجر کیمپوں میں گھلنا نہیں پڑا تھا کیونکہ اسرائیل نے اُن کی اکثریت

کو اپنے اندر سما لیا تھا اور اپنا حصہ بنا لیا تھا۔ اِسی ضمن میں اسرائیل نے ایک لاکھ فلسطینیوں کو خاندان یکجا کرنے کے ایکٹ کے تحت شہریت دی۔ عرب حکومتوں نے اس معاملہ میں فلسطینیوں کے لئے کیا کیا؟ اُن کی حالتِ زار کو گرنے دیا یا اِس سے بھی بدتر کیا۔
۱۹۹۱ء کی گلف جنگ کے بعدکویت نے کم ازکم تین لاکھ فلسطینیوں کو اپنی سرحدوں سے باہر نکال دیا اِس بات کے جواب میں کہ یاسر عرفات نے صدام حسین کے حملے کی حمایت کی تھی۔ ملک بدر کئے جانے والوں کی اکثریت کو ’فلسطین کا کبھی علم بھی نہیں تھا یا کویت کے علاوہ کسی دوسرے ملک کا‘۔ عرب دنیا کے ظلم اور خاموشی کے بارے ایک کتاب کے مصنف کنان ماکیا نے یہ کہا تھا۔ ہمارے معصوم لوگوں کو مٹانے کے ساتھ ساتھ، اُس نے لکھا۔کویت میں چوکیوں پر نافذ نگران نیم سرکاری احکام نے دیگر فلسطینیوں کو جبراً گرفتار کیا۔ اگر وہ ’’غائب‘‘ نہ ہوگئے تو اس کا مطلب تھا کہ سرعام گولی مار دی گئی ہے یا پھر ایذارسانی کے بعد مار دیا گیا ہے (۵)۔‘
یہاں پر عرب منافقت کا ایک اور پیمانہ ہے۔ سالہا سال

تک کویت نے فلسطینی مہاجروں کی بحالی کیلئے اقوامِ متحدہ کی قائم کردہ ایجنسی کو اسرائیل سے بھی کم امداد دی۔ سعودی عرب نے بھی تب تک اسرائیل سے زیادہ خرچ نہ کیاجب تک تیل کی دولت نے مالا مال نہ کیا تھا۔ اور آج؟بٹووں میں بیہودگی کی حد تک بھرے نوٹوں اور بے پناہ زمین مل بانٹنے کی موجودگی کے باوجودسعودی فلسطینیوں کو بطور شہری لینے کو تیار نہیں۔ تاہم وہ خودکش بمباروں کی مالی اعانت کی غرض سے کروڑوں ڈالر کا چندہ اکٹھا کرنے کیلئے طویل ٹیلیویژن پروگرام نشر کریں گے۔ وہ کامیاب خودکش بم دھماکے کرنے والوں کے خاندانوں کے دورہ مکہ کا اعزازی اہتمام کریں گے، جس کے تمام اخراجات خود ادا کریں گے۔

آس پاس کے ممالک لبنان، شام اور عراق کی حکومتییوں ظاہر کرتی ہیں کہ جیسے فلسطینیوں کو بسانے سے اُن کے ہاں شیعہ اور سنی کو ایک ساتھ بسانے کی نازک صورتحال بگڑ نہ جائے۔ عراق کو دیکھ لیجئے، 'ایک ساتھ' بسنے کا مطلب تھا کہ سنی اقلیت شیعہ اکثریت پر حکومت کر رہی تھی۔ کیوں غیر ملکیوں کو شہریت

عطا کرنے میں خدشہ لاحق ہے ، چاہے آپ کیسے عرب ہی کیوں نہ ہوں؟ ہاؤس آف سعودکے اراکین کی طرح صدام نے خود کش بمباروں کی بہبود کیلئے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ (گریٹ انکل، صدام اپنے بارے یہ کہلوانا پسند کرتا تھا ، نے خزاں ۲۰۰۳ء کی جنگ کے آغاز سے ایک ہفتہ قبل پیسے خودکش بمباروں کے خاندانوں تک پہنچائے تھے)۔ لبنان نے (فلسطینیوں کا) بہت کم خیال رکھا۔ اِس کے قوانین درحقیقت اکثر فلسطینی مہاجروں کو کل وقتی کام کرنے ، زمین خریدنے اور پروفیشنل بننے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ اپنی مہارت سے غیر متعلقہ کام کاج کرتے ہیں(۶)۔

صرف واحد عرب مسلمان ملک جس نے فلسطینی مہاجروں کو شہریت دی ہوئی ہے ، اُردن ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُردنیوں کی اکثریت نسلی طور پر کسی نہ کسی طرح سے فلسطینی ہے۔

ہم فلسطینیوں کی حالتِ زار کیلئے ’اسرائیلی سامراج‘ کو کوسنے دے سکتے ہیں۔ البتہ سچ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے پاس ہمارے اپنے ’سامراج‘ الزام دینے کیلئے کافی ہیں۔ مگر اُتنے (اسرائیل جتنے) نہیں، آپ کہہ سکتے ہیں۔

ممکن ہے ، زیادہ۔۔ میں کہوں گی۔ اگر ہم اس بات کا بغور جائزہ لیں کہ کیسے مشرقِ وسطیٰ کا یہ ناٹک بہت سارے لحاظ سے ایک سبق کے طور پر شروع ہواکہ مسلمانوں نے دہائیوں تک ایک دوسرے کو خنجر گھونپا۔ میں جو کہنا چاہوں گی کہ یہ کوئی مربوط تاریخ نہیں ہے بلکہ حقائق کو وہ نمونے ہیں جو موجود گروہ بندیوں میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے شروعات میں ہم نے بڑی سہولت کے ساتھ یہ یقین کرنا شروع کر دیاکہ یہودی روندتے ہوئے آئے اور انہوں نے فلسطینیوں کو اسلحے کے زور پر در بدر کر دیا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ عربوں کی اکثریت نے تو اِس موقع پر ہیاہیا کیا تھا۔ مگر خالی کر دینے کے احکامات ہمیشہ یہودیوں نے تو نہیں دئیے۔ سلطنتِ عثمانیہ۔۔ترکی کے مسلمانوں۔۔۔ نے بادشاہت مامور کی تھی جس نے اُس وقت فلسطینیوں کو اپنا ماتحت بنایا تھا۔ عرب مزارعوں کے مفاد کے خلاف سلطنتِ عثمانیہ نے شروع میں آنے والے یہودیوں کو زمینیں نیتاً فروخت کیں۔ ہاں جی، مسلمانوں نے یہ کیا۔ اور انہوں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے کیا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک سو پچاس نامور عربوں نے ترک پارلیمنٹ کو مستقل

زمینیں فروخت کرنے پر ایک احتجاجی تار بھیجا۔ اُن کی اِس تار کو نظرانداز کر دیا گیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران عربوں نے برطانیہ کی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف لڑائی کا اس شرط پر ساتھ دیاکہ سارے فلسطین کو بعد میں عربوں کے حوالے کر دیا جائیگا۔ سر ہنری میکماہن کو، مصر اور سوڈان میں برطانیہ کے ہائی کمشنر نے ۱۹۱۵ء کے نجی خطوط میں اِسے ایک اہم معاملہ قرار دیا۔ اگرچہ ۱۹۱۷ء کے بیلفور ڈیکلریشن میں برطانیہ نے عربوں کے ساتھ اپنے پہلے سے طے معاہدہ کو توڑ دیا۔ لندن نے سرعام فلسطین کے کچھ حصہ کویہودیوں کے حوالے کر دیاجو یورپ میں بڑھتے ہوئے نفرت انگیز حملوں کا شکار ہو رہے تھے۔سو وعدہ شدہ زمین دوبارہ وعدہ شدہ زمین ہو گئی۔ مسلمان تب سے اب تک مغربی سامراجوں کو دھوکا دہی کے کوسنے دیتے آ رہے ہیں۔

بہرحال ۱۹۱۵ء میں ایک بار پھرہم اپنی شدید غلط بیانیوں کی تلافی کرنے میں ناکام رہے ۔ وہ سال مسلمان سلطنتِ عثمانیہ کا آرمینیا کے عیسائیوں کے قتلِ عام کے عروج کا سال تھا(۸) ۔ اللہ کے سفیروں نے دس لاکھ سے

زائد عیسائیوں سے ملک بدری، بھوک اور قتلِ عام کے نتیجہ میں جان چھڑائی۔ میں کیوں آپ میں سے بہت سوں کو ترکوں سے معافی مانگنے کی اپیل کو نہیں سنتی؟ ہمیں مشتعل ہی ہونا چاہئے جب آرمینین ہم سے اپنی جائیدادیں واپس نہیں مانگتے، صرف معافی مانگنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیا مسلمان بناوٹی تقدس پر مبنی ریاکاری میں اتنے ہی مگن ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم دوسروں کے اعتماد کو کس طرح ٹھیس پہنچا رہے ہیں؟

صرف ہم مسلمان ہی نہیں ہیں جنہیں نو آبادیاتی طاقتوں کے بعد آباد ہونا ہے، یہودیوں کو بھی گمراہی کے تجربے سے گزرنا پڑا۔ وہ ۱۹۲۱ء کا سال تھا۔ وہ زمین جو برطانیہ نے یہودیوں کی قومی ریاست کیلئے مختص کی تھی اُس کا قریب چار بٹہ پانچ حصہ عربوں کو چلا گیا جو بعد میں اُردن بن گیا۔ اس واقعہ کے صرف دو برس بعد برطانیہ یہودیوں کے نقشے کے علاقوں سے بھی دستبردار ہو گیا، اس بار اُس نے یہ علاقے شام کو دے دئیے۔ مگر تب سے اب تک یہودیوں کے سر منڈھنے والی رعائتیں مسلمان حکمرانوں کیلئے بے معنی ہیں۔

کیا آپ حج امین الحسینی کے نام سے واقف ہیں؟ آپ کو واقف ہونا چاہئے۔ وہ ۱۹۲۱ء میں یروشلم کے مفتی بنے، ۱۹۲۲ء میں سپریم مسلم کونسل کے صدر بنے ۔ اگرچہ حج امین درست جمہوری طریقہ کار سے صدر منتخب ہوئے تھے لیکن اُن کی صدارت کے پندرہ برس کے دوران کبھی الیکشن کا انعقاد نہ ہوا۔ اُن کی فلسطین سے یہودیوں کے نجات کی یکطرفہ ذہنی کوششوں کے دوران مفتی کو یہ منکشف بھی ہوا کہ اخلاقی طور پر وہ عربوں کے سلسلہ وار قتل کے مجاز ہیں۔ جو کوئی اُن کی راہ میں آیا وہ گویا اللہ کی راہ میں آیا۔ جس طرح نازیوں کی آفت یورپ میں پھیلی اُسی طرح یہودیوں کی ہجرت بھی بڑھی اور حج امین کا ظلم وستم بھی۔ 'کسی عرب پر اس شک کا اظہار کرنا کہ وہ کیڑے کی طرح اپنے قومی مفاد سے جڑا ہوا ہو، تو پستولوں سے لیس آدمیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ 'فلسطین میں خانہ جنگی کے بارے برطانوی حکومت کی ۱۹۳۷ء کی ایک رپورٹ میں یہ بات کہی گئی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے، 'بہت سے فلسطینی برطانوی حکومت سے اپنے تخفظ کا کہتے ہیں(۹)'۔ وہ یہودیوں کو عربوں کیلئے ' اندرونی

دہشت ‘قرار دیتے ہیں، جو ایک دوسرا جھوٹ ہے۔
اَب تاریخ کا وہ حصہ آتا ہے جس کا تذکرہ آپ اِن دنوں بمشکل ہی سنیں گے۔ ۱۹۳۹ء ، مشرق وسطیٰ میں بڑھتی ہوئی گڑبڑ اور بنیادی طور پر ہٹلر کو شکست دینے کے زور کے دوران، برطانیہ نے فلسطینیوں کو ایک ملک دینے کے پلان کی پیشکش کی(۱۰)۔ شرائط یہ تھیں: عرب اور یہودی ایک ہی ریاست میں سکونت اختیار رکھیں گے اور دس برس تک یہ ریاست فلسطینیوں کے کنٹرول میں ہو گی۔ اِس اثناء میں یہودیوں کی زمینیں خریدنے اور تارکِ وطن بن کر آباد ہونے کی شرح میں ڈرامائی کمی واقع ہوئی۔ آزادی کے موقع پر، فلسطینی اپنی امیگریشن پالیسی وضع کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے۔ کسی بھی لحاظ سے یہ خودمختاری تھی۔ یہ کافی نہیں، عرب رہنماؤں نے کہا۔یروشلم کے مفتی کے تسلط میں، جس سے برطانیہ نے براہِ راست بات نہ کی تھی، عرب مذاکرہ کاروں نے آدھا وقت آزادی کی بات کی۔ بصورتِ دیگربرطانیہ اِس پلان کو ٹھونس سکتا تھا۔
مگر یہ وہ معمول کی تلواریں ہیں جنہیں شاہی دستے دستیاب ہوتے ہیں۔ برطانیہ کی کاوش کو مسترد کرتے وقت

مفتی کے آدمیوں نے کبھی بھی فلسطین کے کسانوں یا آڑھتیوں سے مشورہ نہیں لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں نے اس معاملہ کو اٹھایا۔ ۱۹۳۸ کے ایک برطانوی اخبارکی تفصیل کے مطابق اکثر دیہاتیوں کو 'عرب جنگجوؤں کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی نہ تھی جو یہودیوں کی امیگریشن کو ختم کرنے کے درپے تھے اور فلسطین کیلئے عرب حکومت چاہ رہے تھے۔ وہ اُس مشکل دور میں بیج بونے ، ہل چلانے ، اپنے خاندانوں کی کفالت اور شادیاں رچانے کیلئے اکیلے ہونے کو تیار نہیں(۱۱)'۔ اپنے سربراہوں کی طرف سے سیاسی طور پر مفلس بنا دینے سے وہ خود کو اقتصادی طور پر بھی مفلس پا رہے تھے۔ آٹھ سابق فلسطینی کمانڈروں نے مفتی یروشلم پر غیر ملکی طاقتوں سے بے حساب ملنے والی رقم کے ناجائز استعمال کا الزام لگاتے ہوئے ایک ضمیمہ شائع کیا۔یہ کروڑوں پاؤنڈ ہیں لیکن کیا حج امین کسی واحد مسجد، اسکول یا ہسپتال کا بتا سکتے ہیں جسے انہوں نے اپنے دور کے دوران تعمیر کیا ہو؟ کیا اُس نے کوئی پناہ گاہ، سیاسی پناہ گاہ، خیراتی ادارہ اور یا پانی کا حوض تک بنایا ہو جہاں سے غریب پاپیادہ پانی ہی پی

سکیں(۱۲)؟
آئیے ہم صاف دیکھیں کہ نازی سالوں کے دوران اور کیا کیا ہوا۔ہولوکاسٹ میں مسلمانوں کی منافقت۔ وہی حج امین، خدا کا بندہ جس نے عربوں پر اپنے قتل و غارت کے حربے اپنائے ، نے برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ فلسطین کی طرف رواں یہودی مہاجروں کی بھری کشتیوں کو کسی اور طرف موڑ دے۔ کچھ بحیرہ عرب میں ڈوب گئے ، کچھ کو یورپ کے گیس چیمبروں اور جلائی جانے والی بھٹیوں کی جانب واپس بھیج دیا گیا۔ مفتی نے کروشیا سے یتیم بچوں کی مقدس زمین پر آمد کو روکنے کیلئے اپنا دباؤ جاری رکھا۔ اُس نے جنگ کے فوراً بعد کم وبیش یہ حساب بھی لگایا کہ یہودیوں کی آبادی کم رکھنے سے بھی عرب فلسطین کی ضمانت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اِس کیلئے مفتی کو ضرورت تھی کہ جیتنے والے حلقے بھی اُس پر اعتماد کریں، اپنا جانیں اور وہ وہاں جانا جائے۔ ا،س بات کیلئے فرض اور دعا کرتے ہوئے کہ جیتنے والا ہٹلر ہو گا، حج امین نے ذاتی طور پر جابر قائد سے ملنے کا دورہ کیا۔ مفتی کے بھورے بالوں اور نیلی آنکھیوں نے اُس کی حیثیت کا تعین کیا، جس نے ہٹلر کو

اطمینان بخشا ،اُس کے الفاظ تھے۔ ’ممکن ہے حج امین اعلیٰ رومنوں کی نسل سے ہو(۱۳)‘۔ مفتی کا دورہ برلن میں ہٹلر کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے اختتام پذیر ہوا ، جہاں اس نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں اسلامک سنٹرل انسٹیٹیوٹ کی نقاب کشائی کی تقریب کی صدارت کی۔

وہ بالقان میں عالمی اتحاد کی جنگ میں رضاکار مسلمانوں کی داستانوں کا موجب بنا۔ بوسنیا کے کچھ مسلمانوں نے مفتی کی اِن خواہشات کو نہ صرف رد کردیا بلکہ اپنے گھروں میں فعال طریقے سے یہودیوں کو چھپایا۔ (جب ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اسرائیل نے ایک ایسے بوسنین خاندان کو یروشلم کی ایک تقریب میں اعزازی طور پر مدعو کیا(۱۴) تو اس خاندان نے وہاں سکونت اختیار کرنے اور اسرائیلی شہریت کو لینے کا فیصلہ کیا)۔ہندوستان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں اور ہاں،فلسطینیوں نے بھی اتحادیوں کیلئے اپنی زندگیاں دیں۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم بجا طور پر دعویٰ کریں کہ یہودیوں کا قتلِ عام عیسائی یورپ میں ہوا تھا ، آئیے آئینہ میں اپنے آپ کو تکلیف کے ساتھ دیکھیں۔ بہت سارے

مسلمانوں نے اپنا مستقبل ہٹلر کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں حج امین نے بوسنیا کے مسلمانوں سے خطاب کیا اور انہیں یقین دلایا کہ اسلام اور نازی ازم سماجی تبدیلی، خاندان کے ڈھانچے، محنتِ شاقہ اور مسلسل جدوجہد جیسے معاملات میں ایک جیسا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ۔ اور خاص طور پر امریکہ ، انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف ۔ ریخ کے دارالخلافہ سے حج امین نے عرب دنیا کیلئے نازی پروپیگنڈا نشر کیا۔ 'یہودیوں کو قتل کر دو جہاں بھی تم انہیں پاؤ' وہ یکم مارچ ۱۹۴۴ء کو ریڈیو برلن کے مائیکروفون میں پھنکارا۔ 'یہ عمل خدا ، تاریخ اور مذہب کو راضی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ عمل تمہارے مقام کو قائم رکھے گا۔ خدا تمہارے ساتھ ہے (۱۵)'۔ بغداد اور بیروت میں جرمن سفارتکاروں کو عرب سامعین کے خطوط ملے جن میں بتایا گیا تھا کہ مفتی کے پیغام کا اثر ہے۔

اگرچہ وہ ہٹلر پر اپنا جوا ہار گیا، مفتی جنگی مجرم کی حیثیت سے بھاگ کھڑا ہوا۔ جنگ کے بعد فرانس میں گرفتار ہوا، اُس نے خود کواتحادی قید سے فرار کروایا اورآخرکار مصر پہنچ گیا۔ نئی تشکیل شدہ عرب لیگ نے

حج امین کو گھر واپس آنے پر خوش آمدید کہا۔ کیا یہ پُرتپاک استقبال مفتی کی فلسطین کے بارے لا محدود اختیار کو ثابت نہیں کرتا؟ اس پر غوروفکر کرنا معنی رکھتا ہے۔ ایک انجینئر جس کو عرفات کہتے تھے (جس کا اصل نام الحسینی ہے، خود کو حج امین قبیلے کا رکن بناتا ہے)جلد ہی ’لیڈرشپ‘ کے طور طریقوں کو سمجھتا ہے۔ وہ کہاں سے یہودیوں کے ساتھ امن کو رد کرنے کے طریقہ کار کو سیکھتا ہے، دہشت کو اپنے لوگوں پر مسلط کرتا ہے اور اُس رقم کو ضائع کرتا ہے جو اُن کی بہبود کیلئے وقف تھی؟

ہمیں ہولوکاسٹ کے بعد ایک دوسرے محاذ پر دیانتدارانہ چھان بین کی ضرورت ہے۔ کیوں اسرائیل آخِرکار ولادت پا جانے والی جگہ تھی جبکہ فلسطین پیدا نہ ہو سکنے والی؟ ۱۹۴۷ء میں، اقوام متحدہ نے فلسطین کو یہ تصور پیش کرتے ہوئے تقسیم کرنے کی تجویزدی کہ پینتالیس فیصد زمین عرب حکومت بن جائے اور پچپن فیصد پر یہودی حکومت قائم ہو جائے اور مشترکہ یروشلم کو بین الاقوامی نگرانی کے حوالے کر دیا جائے۔ مسلمان معمول کی طرح روئے دھوئے کہ یہودیوں کو عربوں سے زیادہ

مربع میل مل رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اِس کھوکھلی شکایت کے نتیجہ میں کہیں زیادہ زمین مل رہی تھی۔ ہم اِس حقیقت کو شاید ہی کبھی تسلیم کریں کہ مجوزہ یہودی ریاست میں صحرائے نجف بھی شامل تھا جو فلسطین کا سب سے کم تر زرخیز علاقہ ہے۔ اِس کے علاوہ مجوزہ فلسطینی ریاست عربوں کی غالب آبادی والے علاقوں پر مشتمل تھی جبکہ مجوزہ یہودی ریاست میں ایسا نہیں تھا، اُس میں یہودیوں کی معمولی اکثریت تھی(۱۶)۔ تاہم بددل ہونے کے باوجود یہودی 'دوسروں' کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اقوامِ متحدہ کے پلان کو تسلیم کر لیا اور چھ ماہ بعد آزادریاست کا اعلان کر دیا۔

عربوں نے ایسا نہ کیا۔ انہوں نے اسرائیل کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا اور مزید علاقوں سے بھی ہاتھ دھو لئے۔ ممکن ہے عام فلسطینیوں کیلئے بُرا ہوا ہو، بہت ساری عرب حکومتیں جنہوں نے جنگ کے بعد اُن کے علاقوں کوہتھیا لیا تھا، نے جنگ سے قبل زمانہ کی کم مایہ جمہوریت کو نافذ کیا۔ معروف دانشور برنارڈ لیوس کی رائے دیکھئے۔ '۱۹۴۹ سے ۱۹۶۷ء کے دوران' وہ لکھتے

ہیں، ’عرب لیگ اور خاص طور پر عرب حکومتیں جنہوں نے فلسطین کے علاقوں پر قبضہ کیا، فلسطینیوں کے حق میں بولنے کا دعویٰ تو کرتی ہیں مگر اپنے ہاں کے سیاسی عمل میں اِن کے عمل دخل کی نہ صرف حوصلہ شکنی کرتی ہیں بلکہ اِن کو دور رکھتی ہیں(۱۷)‘۔ پھر کون کس کو بہکاوے میں رکھ رہا ہے؟

نہیں، میں سرد جنگ کے بارے نہیں بھولی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۰ء کے دوران، بڑی طاقتوں کے منصوبہ سازوں نے مشرقِ وسطیٰ کو پتلی تماشہ بنائے رکھا۔ میرے ذہن میں استحصال کی نچلی صورت امریکہ کے حوالے سے نہیں آتی بلکہ سوویت یونین کے حوالے سے آتی ہے۔ جوزف سٹالن نے چیکوسلواکیہ سے ہتھیار اسرائیل منتقل کئے اور عربوں کے پہلے حملے کے دوران یہودیوں کے ساتھ کندھا ملا کر اُن کی مدد کی۔ لیکن اسرائیل کی ۱۹۴۸ء کی فتح کے کچھ عرصہ بعدسٹالن نے اسرائیل پر پنجے گاڑ دئیے، امریکہ کا اتحادی ہونے کی وجہ سے، اور عربوں کو مسلح کر دیا۔ مصر کے جمال عبدالناصر (سوویت یونین کا) انتخاب ٹھہر گئے۔

اگلی دو دہائیوں کے دوران عربوں نے خیال کیا کہ انہیں

صلاح الدین، ملٹری کمانڈر جس نے عیسائی فوج کو صلیبی جنگ میں تیزی کے ساتھ مقدس زمین سے پیچھے دھکیل دیا تھا، کا جانشین مل گیا ہے ۔ تیزی کے ساتھ مگر عارضی طور پر۔ ناصر نے دونوں طرح کی حکمت عملی اپنائی۔ مصر کا جنرل جو صدر بناتھا، نے ہر جگہ عربوں میں یہ اجتماعی شعور دیا کہ اسرائیل کے بڑے ساتھی امریکہ کے خلاف اٹھ کھڑیں ہوں۔

امریکہ مخالف کے معنی نو آبادیت مخالف کے برابر نہیں ہیں۔ ناصر نے یہی ثابت کر دکھایا۔ اُس کے ماتحت ، مصر نے سوویت یونین کی نظریاتی افیون کی حد کردی، اقتصادی اور تہذیبی احیاء کو سوشلزم کے نام داؤ پر لگا دیا۔ مثال کے طور پر، ناصر نے قاہرہ کی علامت الاظہر یونیورسٹی، جو سنی اسلام میں مذہبی اور قانونی تعلیم میں ہارورڈ کا درجہ رکھتی ہے ، کو قومیا لیا ۔ سیکولرزم کی تعلیم کو تیزی سے عام کرنے کی یہ کوشش مہنگی پڑی۔ ’اصلاحاتی الاظہر انسٹیٹیوٹ کو ریاست کے ساتھ منسلک کرنے سے ناصر کی حکومت اپنے اعتبار سے محروم ہو گئی‘، یہ بات جلز کیپل نے اپنی کتاب ’’جہاد: سیاسی اسلام کی لڑی‘‘ میں لکھی۔ ’ایک خلا پیدا ہو گیا

تھا، جو ہر اُس سے پورا ہو سکتا تھا جو حکومت سے سوال کر سکتا ہو اور اسلام کے نام پر حکومت پر تنقید کر سکتا ہو(۱۸)‘۔

خلا پُر ہونے والا تھا، اسلحے سے لبالب اور قومیت پرستی کے نام پر نفوذ کیا جانے والا۔ صیہونی قبضے کا انتقام لینے کے خواب میں خوابیدہ عرب اٹھ کھڑے ہوئے۔اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مصر اور اُس کے اتحادیوں کو سبق سکھایا تھا۔ یہ تذلیل ایک بار تو یروشلم کے ناقابلِ تصور نقصان کی صورت اختیار کر گئی، شناخت کے سلجھاؤ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور سیکولر سوشلزم کی ڈھال کو ختم کرنے کا طے ہو گیا۔

۱۹۲۰ء کے عشرے سے مذہبی بنیاد پرست اپنی تنظیم کی شروعات میں اس لشکارے دار یقین دہانی کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہوئے کود پڑے کہ ’اسلام حل ہے‘۔ اُن کو سننے والوں کی کمی نہیں تھی یا مزید چند برسوں کے اندر ڈالر کی کمی بھی نہ رہی۔ تیل کی دولت کے دھماکے سے سعودی عرب جیسے ملکوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ سعودی عرب، جہاں متشدد اور سخت گیر تعزیراتی اسلام کا دور دورہ ہے، نے شدت پسند

مسلمانوں کیلئے مالی وسائل کو ہر جگہ پھیلا دیا۔ 'اُن کی عظیم ترین توقع' مصر کے روشن خیال مصنف جابر اسفور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں، 'سخت گیر اسلام کی طرف لوٹنے سے اُن کو صیہونیت اور اسرائیل کے خلاف آخری فتح کی قوت نصیب ہو گی(۱۹)'۔

ہم فلسطین کے مسئلہ کی طرف پوری طرح لوٹتے ہیں۔ جوں جوں سخت گیر اسلام کا زور بڑھتا گیا، یاسر عرفات مذہبی اصطلاحات اور تصورات کواپنے سیاسی گول کیلئے اپناتے گئے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں انہوں نے لفظ 'شہید' سے کسی قرآنی منطبق کے بغیر کام چلانا شروع کر دیا۔ گزشتہ پچیس سالوں سے فلسطینی خدا کے نام پر خود کو اور معصوم شہریوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ وہ جنت میں شہیدوں کی لولی لنگڑی قسمت کے چکر میں ایک دوسرے کی پسلیاں بھی توڑ رہے ہیں۔ 'کچھ لطیفوں میں کالی آنکھوں والی باکرہ حوریں غیر جنسی نکلتی ہیں اور کچھ میں وائن شراب کے بغیر'۔ یہ عرب اسرائیلی پروفیسر محمد ابو سمرا کا کہنا ہے۔یہ لطیفے 'اُس بے اعتباری کا اظہار کرتے ہیں

جس کا عہد اسلامی عقیدہ اگلی زندگی کیلئے کرتا ہے‘۔ اُن لوگوں کے پاس جو مذہب کو ایک خنجر کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اسلام کے پاس کسی مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ فلسطینیوں کی نصابی کتب، نشریاتی ادارے اور احتجاجی جلسے اسلام کے مصالحے سے بھرے پڑے ہیں۔ اور ابھی فلسطین کے عام سطح پر جذبات کے حوالے سے ابو سمرا کا خلاصہ بیان کرنا باقی ہے۔ ’ہر شے ناکامی اور بدعنوانی کے انجام کو پہنچی ہوئی ہے(۲۰)‘۔ ڈوم آف دی راک کے مقام پر امریکی مسلمان خاتون سے ہونے والی میری گفتگو کے کچھ حصے ایسے ہی تھے۔

اِس گفتگو کے دومہینوں بعد، عرفات کی کابینہ کے ایک سابق وزیر نے اپنی عزت کی خاطر اپنے تحفظ کے خدشے کو بڑھا دیا۔ نبیل عامر نے فلسطینی حکام کے سرکاری اخبار میں دروں بینی کے واسطے ایک اپیل شائع کی (ایک خلف جسے چھاپتے ہوئے مدیر کی اپنی جان کوخطرہ لاحق تھا)۔ ’جناب صدر ہم سہولت کے ساتھ حیلے بہانے تراشتے ہیں(۲۱)‘، عامر نے عرفات سے کہا۔ سابق گوریلوں کی یاد دلانے والا جنہوں نے پچاس برس

قبل یروشلم کے مفتی کو ایک کھلا خط لکھا تھا ۔ عامر نے فلسطینی چئیرمین کو دنیا بھر سے ملنے والی امداد اور وسائل کے بیجا صرف کا الزام لگایا اور ساتھ ہی ساتھ اسرائیل کے ساتھ الحاق کی ضرورت کو پیش کیا۔ اندر کا آدمی ہونے کی بناء پر اُس نے فلسطینی سیاستدانوں کی ’قبائلی ذہنیت‘ کو آشکار کیا ، آدمی جمہوری اقدار کی رسی پر چلتے تو ہیں لیکن اِس کے نیچے ہنوز ننگی انانیت ہے۔ بات کا احاطہ کرتے ہوئے عامر نے لکھا ، ’ہم نے اپنے لوگوں کے ساتھ سنگین غلطیاں کی ہیں، ہمارے حکام نے اور اپنی ریاست ہونے کے خواب نے۔ اِن غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ، ہمیں پہلے اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا ہو گا اور اُس کے بعد فوری اقدام اٹھانا ہو گا۔ ہمارے لوگ اچھے ہیں اور ہم سے اپنے بارے اور اپنی بہتری کے بارے سوچنے کے مستحق ہیں۔ ہم اپنے لوگوں کی منزل کو کسی سنہری موقع کے سپرد نہیں کر سکتے ، ایسا سنہری موقع جو نئے ورلڈ آرڈر کے تحت کسی امید کا در وا کئے بغیر نہ ختم ہونے والی جدوجہد پر منتج ہو سکتا ہے‘۔

نبیل عامر اپنے گھر پرمقدس فلسطینی پستول بردار کی

گولیوں کی بوچھاڑمیں زندہ بچ گئے۔ اُن کے بیان کے بعد چند دوسرے فلسطینیوں نے سرِعام عامر جیسی باتیں کیں۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اُن کے لوگوں کی حالتِ زار کا اسرائیل بنیادی سبب نہیں ہے۔ پھر کیوں ہم مغرب میں رہنے والے اسرائیل کو موذی سمجھنے میں بڑھتے ہی جا رہے ہیں؟

فلسطین کے سرگرم مجاہداپنے دلائل کے جذبات کا پاٹ دار بیان ایک ہی رخ کی طرح چلنے والی گراری کی طرح گھمائے جا رہے ہیں۔ ذرا اسرائیل کی نسل پرست جنوبی افریقہ کے ساتھ موازنے کی مقبولیت کو ملاحظہ کیجئے۔ رما لا جانے سے پہلے میں فلم 'وعدے' کے بارے معلومات حاصل کر رہی تھی، یہ فلم آسکر ایوارڈ کے انتخاب میں آنے والی دستاویزی فلم ہے جو یروشلم میں رہنے والے عرب اور یہودی بچوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اگرچہ اِس میں حریفانہ تقریریں بھری پڑی ہیں، کچھ بچے اپنے لہجے کو بدلتے ہیں جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک فلسطینی طرفدار اپنے آپ کو طرفداری سے بچا نہیں پاتا۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تین میں سے دو فلمساز امریکی یہودی ہیں۔ 'دوسری نسل کا صیہونی

پروپیگنڈا(۲۲)‘، تیسرا اِس فلم کو عربیہ ڈاٹ کام پر اِس عنوان کے ساتھ دکھاتا ہے۔ ” کیا کوئی ایسی دستاویزی فلم جنوبی افریقہ میں فلمائی گئی تھی جو نسلی عصبیت کے دور میں کالوں اور گوروں کے باہم احساسات کی شدت کو بیان کر سکتی ہو، کچھ لوگ کالوں کے گوروں کے خلاف غصیلے اظہار کے لفظوں کو بیان کرتے تھے جو گوروں کے کالوں کی نسل پرستی کی نشانی تھے۔ اور آپ کو بتاؤں، رمالا میں میں نے دوبارہ جنوبی افریقہ کا ذکر سنا۔

ٹورونٹو واپسی کے بعد میں نے سنا کہ فلسطینی یکجہتی کا کوئی گروپ جنوبی افریقہ اکادمی کی اعانت کر رہا ہے کہ شمالی امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اسرائیل کا ذکر نسلی عصبیت کے ملک کے طور پر پھیلا دیں(۲۳)۔ یونیورسٹی آف ٹورونٹو کے ریچمان ہال میں خطاب کرتے ہوئے اکادمی کے کارپرداز نے جنوبی افریقہ کے نسلی عصبیت کے دور کو اسرائیل کی ’باہم شادیوں‘ پر پابندی کے متوازی قرار دیا۔ مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والے جوڑے اسرائیل میں شادی شدہ یا شادی کے بغیر اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مگر شادی کی مذہبی تقریب ملک میں

کہیں نہیں ہو سکتی۔ اکادمی نے جس بات کا ذکر نہیں کیا اور جس کو میں نے بعد میں دریافت کیاکہ سیکولر شادیوں کا بل یہودی پارلیمان نے ایوان میں پیش کیا ہوا ہے (۲۴) جبکہ مسلمان قانون دانوں نے کٹر یہودیوں کے ساتھ اس بل کی منسوخی کیلئے اتحاد کیا ہوا ہے۔

ایک ایسی ریاست جہاں نسلی عصبیت پر عمل درآمد ہوتا ہو ، وہاں عرب مسلمان قانون دانوں کے پاس کسی بات کو ویٹو کرنے کا اختیار حاصل ہو سکتا ہے ؟ آبادی کا فقط بیس فیصد حصہ ہوتے ہوئے ، کیا عرب الیکشن میں حصہ لینے کے اہل ہو سکتے ہیں، اگر وہ واقعی ہی نسلی عصبیت کے انگوٹھے نیچے تلملا رہے ہیں؟ کیا کوئی نسلی عصبیت والی ریاست عورتوں اور غریبوں کو مقامی سطح کے الیکشن میں ووٹ ڈالنے کا حق دے سکتی ہے ،جس کا حق اسرائیل نے فلسطینی عربوں کی تاریخ میں پہلی باردیا ؟ کیا عرب اسرائیلی شہریوں کی واضح اکثریت قومی انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیتی جیسا کہ وہ حصہ لیتی ہے ؟ کیا کوئی نسلی عصبیت والی ریاست متعدد عرب سیاسی پارٹیوں کو اجازت دے گی جیسا کہ اسرائیل دیتا ہے ؟ کیا عدلیہ سیاسی

مداخلت سے آزاد نہیں ہے؟ ۲۰۰۳ء کے اسرائیلی انتخابات میں دو عرب سیاسی پارٹیوں کویہودی ریاست میں دہشت گردی کرنے کی حمایت کے اظہار کے ضمن میں نااہل قرار دیا گیا۔ اسرائیلی سپریم کورٹ نے اپنی آزادی کو بروئے کار لاتے ہوئے دونوں کی نااہلیت کو ختم کر دیا۔

کیا کوئی نسلی عصبیت والی ریاست اپنا سب سے بڑا ادبی انعام کسی عرب کو دے گی؟ اسرائیل نے ۱۹۸۶ء میں ایمائل حبیبی کو اعزاز دیا، اس سے پہلے کہ کوئی انتقادہ اس انتخاب کو سیاسی چالاکی قرار دیتا۔ کیا کوئی نسلی عصبیت والی ریاست ہیبرو بولنے والے اسکول کے بچوں کو عربی سیکھنے کیلئے حوصلہ افزائی کرے گی؟ کیا پورے ملک میں سڑکوں کے بورڈ دوزبانوں میں ہونگے؟ (حتکہ دو زبانوں پر فخر کرنے والا ملک کینیڈااِس معیار پر پورا نہیں اترتا۔) کیا نسلی عصبیت والی ریاست ایسی یونیورسٹیوں کا گڑھ ہو گی جہاں عرب اور یہودی اپنی منشاء کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل سکتے ہوں اور جہاں اپارٹمنٹس پر مشتمل عمارتوں میں وہ ساتھ ساتھ رہ سکتے ہوں؟ کیا نسلی عصبیت والی

ریاست سہولتیں اور قانونی تحفظ اُن فلسطینیوں کو عطا کرے گی جو رہتے تو فلسطین سے باہر ہیں لیکن کام اسرائیل کی سرحدوں کے اندر کرتے ہیں؟ کیا انسانی حقوق کی تنظیمیں کسی نسلی عصبیت والی ریاست کے اندر سرعام کام کر سکتی ہیں؟ وہ اسرائیل میں کرتی ہیں۔ اس ضمن میں تو حتکہ فوجی حکام حکومتی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے عوام کے سامنے آتے ہیں۔ اکتوبر ۲۰۰۳ء میں ، اسرائیل ڈیفنس فورسز کے سربراہ نے میڈیا کو بتایا کہ ویسٹ بینک اور غزہ میں سڑکوں کو بند کرنے سے فلسطینیوں میں اشتعال بڑھا ہے۔ دوہفتوں بعد شِن بیٹ اسکیورٹی سروس کے چار سرکردہ سربراہوں نے اپنے عہدوں کی پرواہ کئے بغیر ایرئل شیرون کو فوجیں یکطرفہ طور پر واپس بلانے کا کہا۔ کیا کوئی نسلی عصبیت والی ریاست اُن لوگوں سے اس قدر اختلافِ رائے ہضم کر سکتی ہے جن کو ملک کی حفاظت کا اختیار دے رکھا ہو؟

اِن سب سے بالاتر، کیا ذرائع ابلاغ قوم کی عمارت کے بنیادی و اثاثی حصوں پر بحث کر سکتے ہیں؟ کیا ایک نسلی عصبیت والے ملک میں ہیبرو زبان کا اخبار(۲۵)

عرب اسرائیل تنازعہ کے حوالہ سے یہ مضمون شائع کر سکتا ہے کہ ’ کیوں صیہونیت پرستی کی مہم مکمل طور پر ناکام ہے‘؟ کیا وہ اخبار اس مضمون کو اسرائیل کی آزادی کے روز شائع کر سکتا ہے؟ کیا ایک نسلی عصبیت والی ریاست مشرقِ وسطیٰ میں آزاد ترین عرب پریس کی ضمانت دے سکتا ہے، ایسا پریس جو اپنے ملک (اسرائیل) کی آزادیوں کو برا بھلا کہ سکتا ہو اور اپنے موقف پر قائم رہ سکتا ہو؟ (اَب تک مشرقی یروشلم کا روزنامہ ’القدس‘ اسرائیل مخالف ایک خط کو چھاپنے سے باز نہیں آیا جو جعلی طور پر نیلسن منڈیلا کا لکھا بتایا جاتا ہے(۲۶) مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ خط ہالینڈ میں مقیم ایک فلسطینی کی تحریر ہے۔) حتکہ فلسطینی قومیت پرستی کے خفیہ کارپرداز، مرحوم ایڈورڈ سعید نے صاف صاف کہا تھا، ’اسرائیل جنوبی افریقہ نہیں ہے(۲۷)۔۔۔‘، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ ایک اسرائیلی ناشر نے سعید کے بنیادی حوالے کی کتاب ’’اورینٹلزم‘‘ کا ہیبرو میں ترجمہ شائع کیا تھا؟ میں اس نقطہ کو اس سوال کے ساتھ بند کروں گی کہ جو سوال خودسعید نے عربوں سے پوچھا تھا، ’’ہم کیوں اپنے

معاشروں میں اظہار رائے کی آزادی کیلئے لڑتے نہیں، ایک ایسی آزادی جس کے بارے کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے ، جو ہمارے ہاں نہ ہونے کے برابر پائی جاتی ہے (۲۸)‘‘۔

میں اتفاق نہیں کرتی۔ کچھ لوگوں کو ابھی بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ’عرب آزادی‘ کا اسرائیل سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگ جن کو یہ بتانے کی ضرورت ہے ، درحقیقت وہ لوگ ہیں جو جنوبی افریقہ کی مثال کو ایک قدم آگے لے گئے ہیں ، جو اسرائیل کو اَب نازی جرمنی سے ملا رہے ہیں۔ اُن کے مطابق صیہونی نفرت آمیز جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں، اُس حتمی ہراس کے تحت جسے وہ ’زایو۔نازازم ‘ کالقب دے رہے ہیں(نیو۔نازازم کے مترادف)۔

’زایونازازم ‘ کے حلفیہ دشمنوں نے اگست ۲۰۰۱ء میں بین الاقوامی اسٹیج پر اپنی تماشہ گری کا مظاہرہ کیا۔ عرب لائرز یونین نے مختلف فورم سے لے کر ڈربن جنوبی افریقہ میں منعقدہ یونائیٹڈ نیشنز ورلڈ کانفرنس تک میں کارٹون تقسیم کئے (۲۹) جن میں اسرائیلی فوجیوں کو اُن کی ہلمٹوں پر نازی جھنڈا لہراتے ہوئے خون چوسنے والے

دانتوں کے ساتھ ڈریکولا کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ ایک ایسا فوجی ایک فلسطینی دفتر کے تختوں کے بنے دروازے کے باہربطور چوکیدار کھڑا تھا اور اِن تختوں پر سواستیکا کا نشان بنا ہوا تھا۔ ایک دوسرے فلسطینی حمایتی کاغذ پر سواستیکا کا نشان ڈیوڈ کے ستارے سے ابھر رہا تھا۔ ڈربن میں جو سب سے کریہہ پوسٹر تقسیم کیا گیاوہ ہٹلر کے اس مفروضے پر مشتمل تھا، ''اگر میں جیت گیا تو کیا ہو گا؟'' پوسٹر کی اِس سرخی کے نیچے لکھا تھا،'اچھی چیزیں'، اِس پوسٹر میں جابر قائد کا یہ بیان تھا، ''کوئی اسرائیل نہیں ہو گا اور نہ فلسطینیوں کا خون بہے گا۔ باقی آپ خود حساب لگا لیں۔''

تاہم کیسے کوئی نازی ازم سے لڑنے کا دعویٰ کر سکتا ہے جب ہٹلر کے مقصد کو اپنا مقصد بھی بنایا جائے؟ اس بات کا جواب یہ ہے کہ حساب آپ خود ہی لگا لیں۔ مجھے تو اس بات سے ہی کراہت آتی ہے کہ یہ تدبیر ساز ہٹلر سے کس قدر متاثر ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ڈربن میں تقسیم کئے گئے کارٹونوں میں اسرائیلی فوجی ڈریکولا کے دانت نکالتے دکھائے ہیں۔ بہت سارے عرب مسلمان دانشور، صحافی اور سیاستدان اپنے پیچھے

چلنے والوں کو بتاتے ہیں(۳۰) کہ یہودی نازی ہیں کیونکہ وہ اپنی مذہبی عبادات کی خاطر غیر یہودی بچوں کا خون بہاتے ہیں۔ اس کو خونی تلافی کے نام سے جانا جاتا ہے ، یہ کہانی نازیوں کے مجلہ ’ در ستومر‘ میں کالموں کی محبوب داستان تھی۔ اِس اعتبار سے اسرائیل کے نام پر اچھلنے کودنے والے بہانے باز ہٹلر کے ساتھ بستر میں دراز ہوتے تھے۔ وہ نازیوں کے پیچھے چلتے تھے فقط اُس کی مخالفت کرنے کیلئے جسے وہ نازی ازم کہتے تھے۔ میں اس بات کو بالکل سمجھ نہیں سکی۔ اور اُن کا غیر عقلی پن ایک اعلیٰ سفارتی عالی مرتبت لوگوں کے سامنے آیا۔ شام کے وزیر دفاع سے کم درجے کا تو کوئی وہاں تھا ہی نہیں، جو یہودیوں کو خون چوسنے ولا ثابت کرنے کیلئے کتابیں شائع کر رہا ہے اورایک فلم بھی بنا رہا ہے(۳۱)۔ابھی یواین ورلڈ کانفرنس برائے انسداد نسلی منافرت کو یہ وضاحت کئے بغیر کہ ۲۰۰۱ سے ۲۰۰۳ تک تو شام اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن میں بیٹھا رہا ہے ۔ اس بات کے علاوہ کہ باوقار یو این اسکیورٹی کونسل کے گردشی رکن کی حیثیت سے بھی کام کرتا رہا ہے۔ آخری وار سہنے کیلئے

تیار ہیں؟ اسرائیل دنیا کا واحد ملک تھا جس پر تنقید کی خاطر باضابطہ یو این کانفرنس برائے انسداد نسلی منافرت میں دستاویزات پیش کی گئیں۔ کیوں یہ حیرت انگیز طور پر اچھے برے کی تمیز ختم کرنے والی بات ہے ؟ کس نے کی؟

آخر میں، میں سوچتی ہوں کہ اس بات کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ کس طرح زایونزم کی تعریف وضع کرتے ہیں۔اس تحریک کے حامیوں کیلئے ، زایونزم تاریخی لحاظ سے کچلے ہوئے اور معاشرتی طورپر بتدریج سکڑتے چلے جانے والے لوگوں کی وطن واپسی کا نام ہے (۳۲)۔ مگر اِس کے مخالفین کیلئے ، زایونزم نسل پرستی کا نام ہے (۳۳)۔۔ ایک ایسا نظریہ جو امیر یورپی یہودیوں نے پروان چڑھایا اور انہوں نے اِس مفروضے کو عملی جامہ پہنایا کہ خدا کے ’منتخب لوگ‘ زمینیں چھین سکتے ہیں اور واپسی کے نسل پرست قانون کے تحت آباد کر سکتے ہیں۔ یہ قانون اُن لوگوں پر عائد ہوتا ہے جو ایک مخصوص اور مستشنیٰ خصوصیت رکھتے ہیں، یہودی سلسلہ نسب۔فقط تیسری رائج کے طور پر جس کو آریاؤں کی خالص نسل کی توقیر دی جاتی ہے ، لہذا اسرائیل

یہودیوں کی حیاتیاتی برتری کی ترویج کیلئے قائم ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ ڈیوڈ مٹاس جو بین الاقوامی انسانی حقوق کے وکیل ہیں، کا کہنا ہے کہ نسل پرستی اور زایونزم کو ایک دوسرے میں ضم کرنا پست درجے کی بات ہے۔ 'یہودی تو ہر رنگ کے ہیں'، وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں۔'یہودی کالے بھی ہوتے ہیں۔۔جنہیں فلاشا کہتے ہیں(۳۴)۔۔انہیں واپسی کے قانون کے تحت ایتھوپیا سے اسرائیل لایا گیا تھا'۔ اِس بات نے مجھے سوچ کا یہ ہچکولا دیاکہ اگر فلسطین کے حمایتی سرگرم لوگ جوشیلے سلگتے ہوئے ہونے کی بجائے صحیح ٹھکانے والی باتوں کی طرف دھیان دیتے تو اُن کے کارٹونوں کے بھوت براؤن اسرائیلی فوجیوں سے بنائے جا سکتے تھے۔ اور کالوں سے بھی۔ ایسا کیوں ہے کہ سارے ولن سفید فام ہی ہیں؟ میرا سوال ایک بڑی بات کی طرف جاتا ہے جس کا نقشہ مٹاس کھینچتے ہیں۔ کیا واپسی کا قانون، جو ہر نسل کیلئے ہے، کو نسل پرستی کی مہر لگانا درست ہے؟درست نقطہ ہے۔ مگر میں اس بات کو بھی جانتی ہوں کہ اسرائیل میں ایک اٹھارہ سالہ ایتھوپین یہودی ایک ساٹھ سالہ عرب سے شناختی کارڈ دیکھنے

کی درخواست کر سکتا ہے۔ اُس عرب اور اُس کے خاندان نے نسلوں سے اس پاک زمین مین کھیتی باڑی کی ہے اور اب ایک بچے کے سامنے سر نیہوڑائیں جو اسرائیل آٹھ ماہ قبل آیا تھا۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ عرب کیوں تذلیل محسوس کرتے ہیں۔ اُن کا نقطہ بھی صحیح ہے۔ یہ معاملہ ہمیں کہاں لے جائے گا؟
جب ہم شہریت کی طرف آتے ہیں تو اسرائیل پھر نسلی منافرت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایک طرح سے جس طرح تائیدی عملی پالیسی نسلی منافرت کا موجب بنتی ہے، اسرائیل اُس مخصوص اقلیت کو اہمیت دیتا ہے جو تاریخی سطح پر ناانصافی کا شکار ہوئی۔ اِس اعتبار سے یہودی ریاست تو تائیدی عمل کی ریاست ہوئی۔ روشن خیال لوگوں کو تو اِس سے محبت کرنی چاہئے۔ کیا اسرائیل کی تائیدی عملی پالیسی نازی ازم کے برابر ہے؟ مجھے معاف کیجئے۔ بطور مسلمان میں اسرائیل کی شہری اُن کا مذہب اپنائے بغیر ہو سکتی تھی، ایسا واپسی کے قانون کی بجائے تارکِ وطن بننے کے طریقہ کار کے تحت ہو سکتا تھا، مگر ایسا ہو سکتا ہے۔ بہر حال اسرائیل دنیا کے اُن چند ممالک میں سے ہے جو پناہ

دیتے ہیں، پھر شہریت بھی دیتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے آخر میں ویتنام سے لوگوں کی بھری ہوئی کشتی اسرائیل پہنچی اور انہوں نے سیاسی پناہ حاصل کی۔ مجھے اس پر حیرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ شام اِس اسکور سے کس طرح موازنہ کر سکتا ہے۔ اَب اسرائیل بطور ہٹلری نفرت کے ڈھیر کی کچی دیوار کی بنیادوں کا بالآخر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ یہ مشرقِ وسطیٰ کا واحد ملک ہے جہاں عرب عیسائی بخوشی ہجرت کر رہے ہیں۔ وہ خوشحال بھی ہو رہے ہیں اور اُن کی یونیورسٹیوں میں حاضری کی شرح اسرائیل کے عرب مسلمان شہریوں سے کہیں آگے بڑھ گئی ہے (۳۵)، مجموعی طور پر اُن کی صحت خود یہودیوں سے کہیں بہتر ہے۔

دوبار وعدے کی شکارر یہ دھرتی پچیدہ اور شدید جذباتی دباؤ میں ہے۔ اسرائیلی یہودیوں کی ایک دوسرے کو یہ سمجھانے کی کوشش ہے کہ عربوں کو روزروز کے الجھاؤ میں کچھ نہ کہا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس نمونہ کمال میں کون کم ہے اور کون زیادہ۔ اصل سوال تو یہ ہو سکتا ہے، کون وہ کچھ سننا چاہتا ہے جو

وہ سننا نہیں چاہتے؟ اسرائیل، میں نے دیکھا، اپنے 'استعماری' ہونے کے الزام میں زیادہ تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اپنے مخالفین کی نسبت جب اُن کو 'آزادی' کی بحث کی طرف لایا جاتا ہے۔ یہودی ریاست تناؤ پر سرعام بات کرتی ہے۔ یہ اصل جمہوریت کا کمال ہے۔ کیا آج کسی بھی اسلامی ریاست میں بامعنی جمہوریت دیکھی جا سکتی ہے؟

اگر اسرائیل کی استعماریت بوتل کا وہ کاک نہیں ہے جو ہمارے جمہوری جن کو بند کئے ہوئے ہے تو پھر آپ مجھے یہ بتانا چاہتے ہوں گے کہ وہ امریکہ ہے۔ اون کے سروں والے اسلامی انتہا پسندوں کو بھول جائیے، بے شمار اصلاح پسند مسلمان امریکہ کو 'مسئلہ' قرار دیتے ہیں۔ یہ بہت اطمینان بخش نتیجہ ہے جس سے امریکی طاقت ہر طرف سے رسوا ہے۔ مگر تمام تنقید اور نعرے بازی کے نیچے مسلمانوں کا دل بھی دھڑکتا ہے... امریکہ کیلئے۔ مجھے آپ کو واپس اسرائیل کی طرف ایک منٹ کیلئے لیجانے دیجئے۔ یروشلم کے مسلمان حصہ کی مارکیٹ کی جانب جاتے ہوئے میں نے ایک ماورائے حقیقت منظر بھی دیکھا۔ میرے ذہن سے بالا، کالے اور نارنجی ہیلووین

رنگوں میں دو نیون سائن بورڈوں نے ہولی راک کیفے کو مشتہر کیا (۳۶)۔ اِس کا لَوگو اس طرح ذہن میں چپکا جس طرح ہولی راک کو اپنی ہئیت کے ساتھ ہونا چاہئے، جس طرح ہارڈ راک کیفے ہو۔ فرنچائز بھی نہیں اور گرا پڑا بھی نہیں۔ اِس خستہ حال بے آرائش کھانے پینے کی جگہ نے امریکہ سے اپنی حیثیت بنائی۔ کوئی بات مجھے بتاتی ہے کہ سی آئی اے نے یہ ریسٹورانٹ نہیں بنایا۔ نیویارک ٹائمز کے غیر ملکی معاملات کے کالم نگار تھامس فریڈمان کے ساتھ ایسا ہی واقعہ دوہا قطر میں ہوا تھا۔وہ ایسی جگہ سے گزرے جس کے بارے انہیں خیال تھا کہ یہ قطر کا اصلی تابو ہے، 'میں نے ایک طرف کا چکر کاٹا اور اچانک یہ میرے سامنے آ ظاہر ہوا جیسے افق پر ایک بڑا سا دھبہ ہو۔ ''تاکو بیل''۔ حتکہ زیادہ مبہم تھا، وہ زور دیتے ہیں۔ 'یہ تو بھرا پڑا تھا(۳۷)'۔ آپ نے غور کیا کہ میں کس طرف جا رہی ہوں؟ جب مسلمان امریکی استعماریت پر چیختے ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ ہم ہمیشہ ثقافتی استعماریت کی بات نہیں کر رہے ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مغرب کی مقبول ثقافت کو گلے لگانے یا مٹانے کا موقع دیا جائے ، بہت سارے مسلمان بخوشی

اِس کو گلے لگائیں گے۔ وہ جو متحمل ہو سکتے ہوں تو اپنے بچوں کو شمالی امریکہ اور یورپ کے اسکولوں میں داخل کروائیں۔ پاکستان کے اخبار 'ڈان' میں ایک کالم نگار نے اس سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کاٹا،

''مسلمان دانشور، ملا یا سیاستدان کو سنیے (۳۸)تو آپ مغرب کے ذمہ فروگزاشت گناہوں کی شکایتوں اور تنقید کی طولانی داستان سنیں گے۔۔ اُس سے پوچھیے کہاں وہ بچوں کو یونیورسٹی بھیجنا چاہے گا اور اگر وہ سچا ہے تو وہ امریکہ کی چوٹی کی یونیورسٹیوں کے نام گنوا دے گا۔ اور اگر وہ اپنے ملک میں اعلیٰ مقام پر فائز ہے وہ زمین آسمان ایک کر کے امریکی سفارتخانے کو اپنے بچے کیلئے کالج میں داخلہ لینے یا اسٹوڈنٹ ویزا لینے کی سفارش کرنے پر راستہ نکالے گا۔ یقیناًوہ اپنی اولاد کیلئے مالی اعانت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے دیوالیہ پن کا جھوٹا حلف بھی اٹھائے گا'۔ امریکہ کو گرا دو۔۔مگر تب تک نہیں جب تک میرا بچہ گریجوایٹ نہیں ہو جاتا۔

پھر تعلیم کے علاوہ بھی کچھ تجربات ہیں۔ بہت سارے مسلمان گھرانے مغرب میں اسلامی ممالک سے زیادہ

چھٹیاں گزارتے ہیں۔ الجزیرہ ٹی وی عطریات کے امریکی اشتہارات چلاتا ہے اور امریکی ذخائر سے پروگرام خریدتا ہے ۔ الجزیرہ کے حریف نشریاتی ادارے مڈل ایسٹ براڈ کاسٹنگ سنٹر پر ’’کون ملینر بننا چاہتا ہے‘‘ نے ریکارڈ توڑ پذیرائی حاصل کی۔ انٹرنیٹ سے قبل کے دور میں خطے کے صحافی آزاد رپورٹنگ میں اندر کی باتیں جاننے کیلئے مغربی اخبارات پڑھنے کی تجویز پر شور مچایا کرتے تھے۔ وہ ایسی نوکریوں کے طلبگار رہتے تھے جو انہیں اُن کے بیشے کے معیارات مہیا کریں۔ مزید بتاتی ہوں، پیپسی کے خالی ڈبے غارِ حرا کے راستے تک کوڑے میں بکھرے ہوئے ہیں(۳۹)، جس مقام کے بارے مشہور ہے کہ پیغمبر محمد کے سینے میں خدا کے لفظ اترے تھے۔

نورا کیورکیان، ایک دوست جس نے دستاویزی فلم ’نقاب اٹھ گئے‘ بنائی، جو وڈیو ٹیپ پر موجود ہے۔ دمشق کے ایک بازار میں سیاہ برقعے میں لپٹی ایک عورت انگیہ خریدتی ہے جو امریکی ناشائستگی کو ظاہر کرتی ہے۔ برقی انگیہ کا ایک جوڑا ابھرے ہوئے حروف کے ساتھ ٹویٹی برڈ‘ لکھا دکھاتا ہے جو ’ٹویٹی برڈ‘ کا مشہور

گیت گاتا ہے (۴۰)۔ دوسرے جوڑے پر ''بگس بنی'' کی تصویر ہے جو ہمیں 'مجھے چومو' کا اشارہ کرتا ہے۔ تیسرا جوڑا یہ ہم آہنگی کا پیغام دیتا ہے ، ''آپ کو میری کرسمس مبارک ہو''۔ اِن جوڑوں کے ساتھ سیل دستیاب نہیں تھے۔ ''ہر کوئی (سیل) خریدتا ہے''، دکاندار جوش و خروش کے ساتھ اِن اشیاء کے بارے بتاتا ہے۔کون ملینربننا چاہتا ہے؟ دکاندار۔ مغربی ثقافت کیلئے مسلمانوں کی چاہت کا یہ عالم ہے کہ اِس نے یہودی سازش کی گھنٹی کو تیار کر رکھا ہے۔ حال ہی میں مشرق وسطیٰ میں ملاؤں نے مختلف مقامات پر ہجوم سے خطابات کے دوران ''پوکی مان'' (بچوں کی وڈیو گیم) کو ایسا جاپانی لفظ بنا کر رد کیا جس کے معنی (اُن کے بقول) 'میں یہودی ہوں' ہیں(۴۱)۔ ایک سعودی عالم نے 'پوکی مان کی جنونیت' کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا کہ 'یہ یہودی منصوبہ ہمارے بچوں کو اپنا مذہب اور اقدار بھلانے کیلئے ہے اور اُن کی توجہ اہم باتوں سے ہٹانے کیلئے جیسے سائنس فہمی''(۴۲)۔ کچھ چھوٹے چھوٹے بٹن عیاشی کے حوالے سے ہیں۔۔ مگر میں انہیں ملاؤں کے حوالے کیلئے بیان نہیں کروں گی۔۔ وہ میرے منہ پر

فتوے کا طمانچہ ماریں گے۔
اَب وقت آ گیا ہے کہ معاملے کی تہہ تک پہنچا جائے۔ یہ حقیقت کہ بہت سارے مسلمان جو امریکی اثرات چاہتے ہیں ، ا،س بات کا ادراک بھی رکھتے ہوں گے کہ وہ واشنگٹن کے ساتھ اشتعال میں بھرے ہوئے کیوں رہتے ہیں؟ اتنا حسد نہیں ہے جتنا دوستانہ مراسم رکھنے میں بے دلی کی کیفیت۔ وہ تمام اشیاء اور سروسز جو امریکہ مسلمان ممالک کوبرآمد کرتاہے ، اُن میں بہترین شے بہترین سروس آزادی ہے جس کو وہاں فروغ ہی نہیں دیا جاتا۔ کچھ امریکی تو اس بات اپنے سر نوچ لیتے ہیں، چکرا جاتے ہیں کہ کیوں اُنہیں اِس بات پر داد نہیں ملتی کہ ۱۹۹۱ء میں امریکہ نے کویت کو آزاد کرایا تھا اور سعودی عرب کو صدام حسین کے کیمیائی پنجوں سے بچایا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سارے عربوں کو یقین ہے کہ امریکہ نے شاہی خاندانوں کو بچایا تھا ، لوگوں کو نہیں۔۔ ' اس بات میں بہت فرق ہے '۔ نیوز ویک انٹرنیشنل کے مدیر فرید زکریا لکھتے ہیں، 'حتکہ گلف کی امیر ریاستوں میں عوام کے غصے اور بے چینی کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ انہیں کچھ دولت تو دے دی

گئی مگر آواز نہیں۔۔ آواز کو سنہری پنجرے میں بند کر دیا گیا(۴۳)۔'
اور بعض اوقات تو سنہری پنجرہ بھی نہیں ہوتا۔ '
مجھے تو یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ دنیا آزادی میں رہ رہی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔' ''نقاب اٹھ گئے'' میں گھر میں قید عورت کہتی ہے۔ 'ہماری زندگیاں اُن سے مختلف کیوں ہیں؟'وہ اعصاب زدہ مگر عزمِ صمیم کے ساتھ اپنا جبہ کیمرے کے سامنے اتارتی ہے۔ 'یہ ضروری ہے کہ دنیا دیکھے کہ ہم اپنی زندگی کیسے گزارتے ہیں'۔
اُس کا ملک شام امریکہ کے ساتھ یہ کام کرتا ہے۔۔ وہ گھٹیا کام جو دوسری مسلمان ریاستیں کرتی ہیں۔
واشنگٹن انہیں اِس کام کے ٹھیکے دیتا ہے کہ وہ اُن سیاسی اسیروں کو ایذا پہنچائیں جن پر دہشت گرد ہونے کا شبہ ہو۔ اس طریقہ سے امریکہ انسانی حقوق کے حوالے سے نسبتاً بے داغ ریکارڈ کا دعویٰ کر سکتا ہے۔
مسئلہ یہ ہے، جو لوگ شام اور اِن جیسوں سے تشدد کا نشانہ بنتے ہیں وہ انسانی حقوق کے علمبردار ہوتے ہیں۔
اُن کے ساتھ اِس ظلم پر آواز نہیں اٹھتی۔وہ مطلق العنان

حکومتیں جن کے ساتھ امریکہ الحاق کرتا ہے ، کیلئے انسانی حقوق کے کارکن دشمن تصور کئے جاتے ہیں۔ کیوں امریکہ اُن تنہا آوازوں کے دفاع میں دہاڑتا نہیں، جو اکثر اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور اُن جمہوری خیالات کی ترویج کیلئے کسی نہ کسی طرح سے سعی کرتے ہیں جن کو واشنگٹن خود ناگزیر سمجھ رہا ہوتا ہے ؟ اصلاح پسند مسلمان یہ جاننا چاہتے ہیں کہ امریکہ اُن کے ساتھ ہے یا آمروں کے ساتھ؟

صدر جارج ڈبلیو بش نے جون ۲۰۰۱ء میں اس سوال کا یوں جواب دیا۔ 'ہماری ترقیاتی امداد کے دوران، ہماری سفارتی کوششوں کے مابین، ہماری بین الاقوامی نشریات کی سطح پر اور ہماری تعلیم امداد کے دوران، امریکہ روشن خیالی اور انسانی حقوق کو فروغ دے گا(۴۴)'۔ انہوں نے ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی کی گریجوایٹ کلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ اُس سے اگلے مہینے ، اُن کے خلوص کا امتحان واشنگٹن کے خطے میں سب سے بڑے اتحادی مصر سے وارد ہونے والے ایک واقعہ سے ہوا۔

جولائی ۲۰۰۲ء میں سعد عیدین ابراہیم بہت سالوں کی

سزا بھگتنے کیلئے دوسری بار جیل بھیج دئیے گئے۔ اُن کی سات برسوں کی سزاکا فیصلہ (مشقت کے امکان کے ساتھ) مصر میں انسانی حقوق کی آزادیوں کیلئے 'پروانہ موت کے مترادف' تھا(۴۵)، یہ بات کائیرو ٹائم کے ناشر نے کہی تھی۔ پینسٹھ سالہ سوشیالوجی کے پروفیسر کے ساتھ جیل میں کیا بیتی، ابھی تک نامعلوم ہے۔ وہ مصر کے صدر حسنی مبارک کے ایک عرصہ سے دوست تھے۔ انہوں نے حسنی مبارک کی بیوی کے ایم اے کے تھیسس کی نگرانی کی تھی اور اُن کیلئے تقاریر لکھی تھیں۔ ابراہیم ٹی وی پر سماجی ترقی کے حوالے سے ایک ہفتہ وار پروگرام کی میزبانی کرتے تھے، انہوں نے مسلمان جہادیوں کی نفسیات پر بنیادی تحقیق کا کام کیا تھااور انسانی حقوق کی بین الاقوامی کانفرنس میں مصر کی نمائندگی کی تھی۔ مگر یہ سب کچھ ۳۰ جون ۲۰۰۰ء سے قبل ہوا تھا۔۔ اپنی پہلی گرفتاری کی شب سے پہلے۔ اگلے چوبیس ماہ کی طویل اسیری کے دوران مقدمے کی سماعت چلتی رہی اور جیل تنگ ہوتی گئی، اُن پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ 'جنہیں میں نے ناراض کیا ہے انہوں نے سعد عیدین ابراہیم کو مصر کی عوامی زندگی

سے نکال باہر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے (۴۶)‘۔
اُن کے مخالفین کا بڑھکتا ہوا طیش ۱۹۹۰ء کے وسط میں اُبلناشروع ہو گیا تھا۔ قاہرہ میں ابن خلدون سنٹر برائے ترقیاتی مطالعہ کے سربراہ کی حیثیت سے ابراہیم نے سنٹر کے نام کی مناسبت سے اپنے کام میں سرایت کرنا اپنا فرض جانا۔ اسلام کے سنہری دور کی دانش کے آخری میناروں میں سے ایک، ابنِ خلدون نے تاریخ اور سماجیات کو قابلِ احترام اداروں کی حیثیت دے دی تھی۔ اِس بانی کے کندھوں پر کھڑے ہو کر ابراہیم نے ۱۹۹۴ میں کم ازکم عرب مسلمان دنیا کیلئے زمین ہموار کی۔ انہوں نے اقلیتوں کے حقوق کیلئے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مصر اِس قانون کے ساتھ چپکا ہوا تھا کہ مصری کلیسا کو اپنے گرجا گھروں کی مرمت سے پہلے مصر کے صدر سے اجازت لینا ہو گی۔ مصر کی اِس سرکاری عکاسی کے تاثر کہ مصر میں مسلمان اور عیسائی بغیر کسی خراش کے بھائی چارے کے ساتھ اکٹھے رہتے ہیں، ابراہیم نے یہ بتانا فرض جانا کہ مصری کلیسا سے تعلق رکھنے والے عیسائی ایک ایسی اقلیت ہیں جو حکومت کی ستم ظریفیوں کا شکار ہوتے

ہیں۔ پہلا وار: اس کانفرنس کے ایک سال بعد،ابراہیم اور جمہوریت کے دیگر حامیوں نے مصر کی پارلیمنٹ کے انتخابات کی نگرانی کی۔ انہوں نے تصور نہ کر سکنے والے فراڈ کی سطح کو عریاں کیا، ایک ایسے ملک کے بارے جس کاتاثر عرب آگہی کے تناظر میں نخلستان جیسا ہے۔ دوسرا وار: ابراہیم کی تحقیق نے پیشگی طور پر خبردار کیا کہ مصر کس سمت فقط سست رو رجحان کے ساتھ بڑ ھ نہیں رہا بلکہ ہچکولوں کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ بدعنوان آمریت پہلے سے موجود کمزور جمہوریت کی جگہ لے رہی ہے۔

میں جمہوریت کے بارے سادہ لوح واقع نہیں ہوناچاہتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ مصر کا ۱۹۸۱ء میں مسلمان انتہا پسندوں کی طرف سے صدر انور سادات کے قتل کے بعد سخت گیرہونا ضروری تھا۔ تب مصر نے ایک ہنگامی قانون لاگو کیا جس کے تحت ہزاروں اسلامی انتہا پسند دو دہائیوں سے جیل میں بند ہیں۔ اور بہت سارے مزید انتہا پسند خطرناک خطرے کی نشانی ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں جمعہ کی ایک دوپہر کو مصر کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار نجیب مفوظ کار میں بیٹھے تھے۔ نوجوان مذہبی

غنڈوں نے کار کی کھلی کھڑکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نجیب مفوظ کی گردن میں ایک چھوٹی چھری گھونپ دی۔ بیاسی سالہ شخص خوش قسمت تھا کہ فقط ایک بازو کے فالج ہو جانے کے بعد زندہ بچ گیا۔ (یہاں پرفقظ کس قدر بڑا المیہ ہے۔) بعد میں تحقیقات سامنے آئیں کہ نجیب کو قتل کرنے کی کوشش کرنے والوں نے اُن کی ایک کتاب کی بنیاد پر حملہ کیا تھا جو انہوں نے تین دہائیاں قبل لکھی تھی۔ حملہ آوروں نے اپنے علامتی حملے کو حقیقت میں بدل ڈھالا اور انہیں اپنے کام کی تفہیم پر سزا دی۔ معاف کیجئے گا، اگر اپاہج بنانے کی یہ دلیل ہے (اور ممکنہ حد تک قتل کرنے کی بھی) تو اِن غنڈوں کے خاتمے کیلئے اسکیورٹی فورسز کی دلیل بھی اُتنی ہی برابر ہے۔ اِس ہنگامی قانون کی طرف آتے ہیں۔

ابراہیم نے جو کیا وہ یہ تھاکہ اِس ہنگامی قانون کے اُس طریقہ کار پر روشنی ڈالی جس سے بدعنوان ہاتھوں میں اِس قانون کا غلط استعمال ہو رہا تھا۔ مصر کی حکومت علماء کے آہنی شکنجوں میں کھیل رہی تھی تاکہ قدامت پسند مسلمانوں کو خوش کیا جا سکے۔ اِس کے نتیجہ میں ریاست مذہبی اعتدال پسندوں کو جہادیوں کے ساتھ

ساتھ مار رہی ہے۔
یہاں پر قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر نصرحامد ابو زید کے ساتھ پیش آنے والا واہیات واقعہ بھی ہے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں یہ بحث کی گئی کہ قرآنی آیات میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر بھی اسلامی بنیادات کو ’انسانی سطح‘ پر لایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی ترقی کی درخواست پر غور کرنے کیلئے اپنی اِس کتاب کو اکیڈمک کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ اس بات کی توقع نہ کر سکنے والے پروفیسر کو کفر کے الزام کا جلد ہی سامنا کرنا پڑا۔ اسلامی انتہا پسند وکلاء اُن کو عدالت تک لے گئے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ کافر اپنی بیوی کو طلاق دے۔ ۱۹۹۵ء میں اسلامی انتہا پسند جیت گئے۔ مصر کے وزیرِ انصاف کے پاس اختیار ہے کہ وہ اِس فیصلے کو بدل دیں لیکن انہوں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا۔ ستم رسیدہ جوڑا اَب ہالینڈ میں تحفظ کے اِس احساس کے ساتھ رہتا ہے کہ ابو زیدنے مصر کے وزیر انصاف کے خلاف توہین کا مقدمہ کر رکھا ہے (۴۷)۔
اِس سارے عمل کے دوران سعد ابراہیم ایک نازک تعلق کو یوں اجاگر کرتے ہیں، ’’وہ معاشرے جہاں شہریوں کو

سرگرم ہونے اور اختلافِ رائے رکھنے کی گنجائش نہ ملے ، وہ معاشرے چالبازی، اشتعال اور مہلک ردعمل کو جنم دیتے ہیں(۴۸)‘‘۔ دوسرے لفظوں میں ، اسلامی انتہا پسندخون کے پیاسے تب بنتے ہیں جب باانصاف سیاسی عمل کا وجود نہیں ہوتا۔ اور اِس کا وجود نہیں ہے ، ابراہیم نے واضح کیا۔ روشن خیال مسلمانوں پر بندش لگانے سے قدامت پرستوں کو یہ واہمہ ہوتا ہے کہ اُن کی آواز سنی جاتی ہے ، اور یہ سب واہمہ ہی ہوتا ہے ، کیونکہ نمائندگی کی اصل راہیں، جیسے قانون سازی، حکومت کے کارپردازوں کی جاگیر میں سکڑتی جاتی ہیں۔ ابراہیم نے پانچ برسوں بعد گھٹتی جمہوریت کے سائرن کی آواز سنی۔ واشنگٹن کوارٹرلی نے مصر کے بارے یہ مشاہدہ شائع کیا، ’’ایک ایسا ملک جو جمہوریت کا حق برتتا ہو وہاں ٹھیک آدھے رکن پارلیمان کسان اور مزدور ہونے چاہئیں، موجودہ شرح کا رجحان یقینی طور پر چند افراد کی حاکمیت کی طرف ہے (۴۹)۔‘‘ یہ تجزیہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

سن ۲۰۰۰ء کا سال قطعی طور پر برا رہا ، ابراہیم کیلئے بھی اور مصر کی جمہوریت کیلئے بھی۔ ابراہیم واشنگٹن

سے ابھی لوٹا ہی تھا ، جہاں انسانی حقوق کی بڑی تنظیم نے اُس کی آزادی کیلئے جدوجہد کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا ، جب مصر کے بالائی علاقوں کے مسلمانوں اور اوپٹک عیسائیوں کے مابین فساد پھوٹ پڑا۔ دو درجن کے قریب لوگ مارے گئے ، بہت سارے زخمی ہو گئے ، سو کے قریب دکانوں اور گھروں کو لوٹ لیا گیا۔ تیس سالوں پر محیط عرصہ میں گزشتہ پچپن فرقہ پرست فسادات میں ، ابراہیم نے تازہ فساد کو 'بدترین اور وسیع تر' قرار دیا۔ لہذا اُس نے پانچ سو اہم ملکی شخصیات کو ایک یادداشت پر دستخط کیلئے آمادہ کیاجس میں اس فرقہ پرست تصادم کے خاتمے کیلئے چند ایک سفارشات بھی شامل تھیں ۔ ابراہیم کے بقول حسنی مبارک کی حکومت نے اِس کام کو 'ظاہراً ترین سرکشی'' جانا۔ فرقہ واریت کے مسئلہ کی گھمبیرتا کی تشہیر کو مصر کے کامل اور اعلیٰ ظرف دارپہلو کو ماند کرنے کے مترادف سمجھا گیا۔ اِسے قابلِ سزا جرم جس کی سزا سن ۱۹۲۰ء کی دہائی کے قانون کے تحت، جس کا اطلاق پہلے کسی مصری باشندے پر نہیں ہوا تھا ، فوری ڈھونڈی گئی(۵۰)۔
ابھی ابراہیم کو کچھ مہینوں تک گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔

اس اثناء میں وہ اور اُس کے ساتھی ابن خلدون سنٹر میں طالبعلوں کو انسانی حقوق کی بے اعتدالیوں کا ریکارڈ جمع کرنے اور انتخابات کی نگرانی کے طریقہ کار کے بارے تربیت دینے میں مشغول رہے۔ ملک بھر میں ووٹ ڈالنے کے طریقہ کار کی تیاری کے دوران، پروفیسر نے دوسرابارود کا گولہ پھینک دیا۔ ڈرامہ نویس علی سالم کے ڈرامہ کو وڈیو ٹیپ پر پیش کر دیا جو اس بارے تھا کہ مصریوں کو کیوں ووٹ ڈالنا چاہئے۔ (اگر کوئی شہری تعلیم کو آرٹ میں پیش کر سکتا ہے تو علی سالم کا نام بدنامی کی حد تک مشہور ہے۔ اُس کی ایک کتاب 'اسرائیل تک سفر' میں یہودی ریاست کی انسانی اقدار کا بھرپور تذکرہ ہے اور سالم کو عرب مصنفین کی انجمن سے نکال باہر کیا گیا۔ مصر میں یہ کتاب 'اسرائیل تک سفر' سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتب میں سے ہے۔ اس دوران کہیں ابراہیم ایک انٹرویو دے بیٹھے جس میں انہوں نے کہا کہ مصرکا بھی اپنے دیگر عرب شاہانہ خاندان کی حکومتوں کی طرح طرززیست ہے۔ یہ بات تو تیسرا، چوتھا اور پانچواں وار ثابت ہوئی۔ ۳۰ جون ۲۰۰۰ء کی شام کو حکام نے ابراہیم اور ابن

خلدون سنٹر کے دیگر ستائیس افراد کا محاصرہ کر لیا ، اِس کے ساتھ ساتھ ’لیگ آف ایجپشین وومین ووٹرز‘‘ کو بھی گھیراؤ میں لے لیا گیا۔ پینتالیس دن کی اسیری ریاست کی اسکیورٹی کورٹ میں سات ماہ کی سماعت پر منتج ہوئی، یہ عدالت فوجی طرز کی ٹربیونل ہے جو قانون کے موجودہ طریقہ کار سے بالاتر کام کرتی ہے۔ حکومت کے استغاثہ نے اِس مقدمے کو خوب کھینچا۔ پہلے اُنھوں نے ابراہیم کو یورپین یونین سے ملنے والی رقم میں خردبرد کا الزام لگایا اور کہا کہ ’ووٹ دینے کیلئے باہر نکلو‘ والی وڈیو ٹیپ پر یہ رقم خرچ ہوئی ہے۔ مگر یورپی یونین نے ابراہیم کوباآوازِ بلند بے قصور قرار دیا۔ اپس کے بعد استغاثے نے یہ بحث کی کہ اُسے باہر سے امداد قبول نہیں کرنا چاہئے تھی۔ یہ ایک ’’مزاحیہ‘‘ تجویز ہے (۵۱)، ایک عرب صحافی کڑکڑایا ، غور کیجئے کہ مصری حکومت کا گزارا غیر ملکی امداد پر ہے۔ عدالت نے اِن اٹھائیس مدافعین کو قصوروار قرار دیا ، ابراہیم کو سات برس کی سزا ہوئی۔

ابھی سزا کو دس ماہ ہوئے تھے ، جس دوران ابراہیم کو دل کے چھوٹے چھوٹے دورے پڑے ، ابراہیم نے سنا کہ

سماعت دوبارہ شروع ہونے کا اعلان ہوا ہے۔ ممکن ہے آخرکار انصاف کا بول بالا ہو؟ اس کا فیصلہ آپ خود کریں۔ جب دوسری سماعت ۲۰۰۲ کی گرمیوں میں جاری تھی، مصر کے اراکین پارلیمان غیر حکومتی تنظیموں کے کام پرایک قانون کے ذریعے چڑھ دوڑے۔ عدالت میں ایک موقع پر ابراہیم اور اُس کے ساتھیوں پر الزامات کی پٹاری نے اس طرح گھیراؤ کیا کہ خاص طور پر اُس نے بطور رہنما اور اُس کے ساتھیوں نے مصر کی عزت کو باہر کی دنیا میں 'خراب' کیا ہے۔ یہ سماعت جولائی ۲۰۰۲ء میں اختتام پذیر ہوئی جس میں اٹھائیس مدافعین کو پانچ پانچ برس کی سزا ہوئی۔ دوبارہ ابراہیم کو سات سال کا حکم ہوا۔ اس کی وجہ: اُس کے ایک دہائی کے قبل بیانات کہ حکومت مصر کے عیسائیوں کو کچلتی ہے۔ اگر یہ عقیدے کا مسئلہ ہوتا تو صدر بش کو چاہئے تھا کہ وہ سرعام اِس پر احتجاج کرتے اور حسنی مبارک کی گردن پکڑتے۔ مصر کی مذہبی اقلیتوں کو ابراہیم جیسے ان تھک رہنما کی ضرورت تھی۔ مگر اِس سے ماوراابراہیم نے بش کی بیان کردہ غیر ممالک کے بارے پالیسی ، روشن خیالی اور انسانی حقوق، کے مکمل

امتحان کا موقع فراہم کیا ۔ ایک چیز، اُس کی صحت جو پہلے ہی دل کے عارضہ کی وجہ سے ڈول رہی تھی اور یقینی تھا کہ جیل میں اور خراب ہوتی۔ علاوہ ازیں ابراہیم کی بیوی امریکی ہے اور یوں وہ بھی امیگریشن کے اعتبار سے امریکی شہری ہے۔ گویا اپنے شہریوں کو ضرررسانی سے بچانا بھی امریکی روایت کا حصہ ہے، یا پھر نہیں ہے؟ آخرکار، اسرائیل کے ساتھ امن سمجھوتہ کے مطابق مصر کو ہر سال امریکہ سے دو بلین ڈالر کی امداد ملتی ہے۔ یہ رقم امریکہ کی تمام غیر ملکی امداد کا دس فیصد ہے۔ اس اکیلی بنیاد کو 'مصر پر کافی کنٹرول' کے مترادف قرار دیتے ہوئے واشنگٹن کی سب سے قدامت پسند اشاعت نے صدر بش پر دخل اندازی کا زور دیا اور ابراہیم کیلئے رحم کی اپیل کا کہا(۵۲)۔ صدر بش اِس سے بھی زیادہ کرسکتے تھے جتنا انہوں نے کیا۔

اَب اِس کا تذکرہ کہ بش نے اِس ضمن میں کیا کیا۔

اگست ۲۰۰۲ میں، بش نے ۱۳۰ ملین ڈالر کی اُس اضافی امداد کو معطل کر دیا جس کو مصر کیلئے بڑھانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اپنے فیصلے کے ساتھ صدر بش نے

ایک خط کو نتھی کیا جس میں ابراہیم کی سزا کے حوالے سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مصر میں نوکر شاہی اور اہلِ دانش بش کی اِس مداخلت پر بہت طیش میں آئے۔ دنیا بھر سے کم وبیش سو کے قریب عربوں نے بش کے اقدام کی تائید کرتے ہوئے ابراہیم کی حمایت میں حسنی مبارک کو خط لکھا(۵۳)۔
چند ماہ بعد مصر کی حکومت نے ابراہیم کی تیسری سماعت کیلئے اہلیت کا اعلان کیا اور تب تک کیلئے اُنہیں رہا کر دیا۔ مارچ ۲۰۰۳ء میں ٹرائل نے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں کو ایک ساتھ رہا کر دیا۔ سیدھی طرح یا ٹیڑھے طریقے سے بش نے مبارک پر دباؤ ڈال کر مطلوبہ نتائج حاصل کر لئے۔ اور ہمیں امریکی صدر کو داد دینی چاہئے کہ انہوں نے اپنا مشہور مسلمہ اصول اپنایا، ’جب آپ کے پاس سیاسی طاقت ہو تو اُس کو استعمال کریں یا پھر گنوا دیں‘۔
کیوں، تب بش نے ابراہیم کی رہائی کیلئے سرعام زور نہ ڈالا، اپنے اتحادی اور پوری ملت اسلامیہ کو نوٹس جاری کر کے کہ جمہوریت کوئی جرم نہیں ہے؟ناقدین کے مطابق ایک لفظ ہے، عراق۔ عراق کے گرد جنگ کے بادل چھائے

ہوئے تھے اور امریکہ مصر کو اپنے ساتھ ملانے کیلئے لالچ دے رہا تھا۔ شاید ناانصافی، بہت سارے مسلمان مذاق اڑائیں گے کہ بش عراق میں جمہوریت لانے کیلئے فوجی حملہ کریں گے لیکن مصر میں جمہوریت کی غرض سے اپنی سفارتی طاقت کو بروئے کار نہیں لائیں گے۔

اس سے قطع نظر، جناب صدر ، ہمیں ویسٹ پوائنٹ کے گریجوایٹس کے ساتھ آپ کے خطاب کا لطف آیا۔

یہ خطاب مجھے دوبارہ میرے نقطہ نظر کی طرف واپس لاتا ہے کہ مسلمان امریکہ سے اتنی نفرت نہیں کرتے جتنی محبت کرتے ہیں۔۔ محبت اپنی ضرورتوں کے حوالوں سے کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بہار ۲۰۰۳ میں ایک اور ثبوت سامنے آیا۔

جب صدام کا بت زمین بوس ہوا ، فطری مسرت نے بغداد میں بھنگڑے ڈالے۔ کچھ روز بعد میں ٹورونٹو میں فتح کی ایک پارٹی میں گئی جس کا اہتمام نوجوان اور بیشتر سیکولر مسلمانوں نے کیا تھا۔ اُن میں سے ایک گروپ نے مجھے اِس بات پر رائے دینے کیلئے چھیڑا کہ انہیں اِس بات پر حیرت ہوئی کہ اکثر مسلمان اس دانائی کا اعتراف نہیں کرتے جو صدام پر حملے کی پیش بندی کے

طور پر سامنے آئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے، اُن کا کہنا تھاکہ پیش بندی کی حکمتِ عملی بالکل ویسی ہی ہے جیسی پیغمبر محمد دوسروں کو نکال باہر کرنے کیلئے بروئے کار لایاکرتے تھے جنہیں وہ اسلام کے خلاف سازش میں ملوث سمجھتے تھے۔ 'اگر پیش بندی پر مبنی جنگ مسلمانوں کیلئے اچھی تھی تب'، ایک جشن منانے والا چیخا، 'کیوں یہ اَب امریکیوں کیلئے اچھی نہیں؟'

'کیونکہ رویوں کے معیارات تو ساتویں صدی سے سامنے آنا شروع ہوئے ہیں'، میں نے دفاعی کھیل کھیلتے ہوئے کہا۔

'اِن اسلامی ممالک کو یہ بتائیے کہ وہ ابھی بھی عورت کو فضول شے سمجھتے ہیں'۔

'اور مذہبی اقلیتوں کیلئے زندگی جہنم بنائی ہوئی ہے'، میں نے مزید کہا۔

دیگر لوگ بھی ہماری گفتگو میں حصہ لینے کیلئے کود پڑے۔ ہم نے اِس بات پر بیزاری کا اظہار کیا کہ 'جنگ مخالف' فعال مسلمانوں کے ہونٹ اُن لوگوں کی نافذ کردہ جنگ کے خلاف کیوں بند رہتے ہیں جو اللہ کے نام پر لڑی جاتی ہیں۔ ہم نے جب اپنے مشاہدات پر تبادلہ خیال کیا

تو ہم پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مسلمانوں کو اِن میں سے کسی ایک بات کا انتخاب کرنا ہے: یاتو یہ مانیں کہ پیغمبر محمد نے یہودیوں پر پیش بندی کے طور پر جو حملے کئے وہ اخلاقی طور پر غلط تھے، تب تو مسلمانوں کو اِس بات کا حق ہے کہ وہ بش کی حق پرستانہ جنگ پر لعن طعن کریں۔ یا پھر ا ،س بات کو تسلیم کریں کہ پیغمبر نے جو کیا تھا درست کیا تھا اور الہامی رہنمائی کے نتیجہ میں کیا تھا، تب یہی بات بش پر صادق آتی ہے، جس کی حیثیت دوبارہ جنم والے عیسائی کی ہے جس کا خدا سے اپنا ربط ہے۔ مسلمان دونوں طرح سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ اِس کو دہرا معیار کہتے ہیں۔ صرف امریکی ہی نہیں ہیں جو اِس پر عمل کرتے ہیں؟

امریکہ محالفین اور الگ تھلگ زندگی گزارنے کے خواہشمندوں، جو مسلمانوں کے علاوہ کوئی نہیں، کا آپس میں ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا ہے، جو چاہتے ہیں کہ واشنگٹن کی پیٹھ پر لات ماریں تاہم بہت سارے نوجوان مسلمان، جن سے میری بات چیت اِس پارٹی سے پہلے بھی ہوئی تھی، چاہتے ہیں کہ امریکہ 'پشت پر لات

مارے ' ۔۔ اور یہ ساراکام انسانی حقوق کی بنیادوں پر کیا جائے۔ اگر وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوئے بغیر یہ سب کچھ کہہ سکتے تھے توانہوں نے امریکہ پر اپنا اثر ڈال کر درج ذیل صورتحال کی تبدیلی کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

* تیونس اور الجزائر میں مسلمان عورتیں قانونی طور پر اپنے مذہب سے باہر شادی نہیں کر سکتیں(۵۴)۔ جبکہ دوسری طرف مرد ایسا کر سکتے ہیں۔ بہت سارے مسلمان ممالک میں شادی کے تحت زنا ، اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے ، کو جرم نہیں سمجھا جاتا۔

* سعودی عرب نے حال ہی میں ایک چورانوے سالہ شخص کو گرفتار کیا ، جو دنیا کا سب سے بوڑھا سیاسی اسیر بتایا جاتا ہے ، جسے اگرچہ چند ہفتوں بعد رہا کر دیا گیا۔ شیخ محمد علی ال آمری مدینہ کے معروف شیعہ عالم ہیں، نے سعودی حکام کو اِس لئے پریشان کر دیا کہ اُن کے چند شیعہ ملاقاتیوں نے اُن کے فارم کا دورہ کیا تھا۔ وہ عبادت کرنے کیلئے اکٹھے ہوئے تھے۔ مصر کے کوپٹس عیسائیوں کی طرح سعودی عرب کے شیعہ مسلمان قانونی طور پر دبے ہوئے ہیں۔

* دنیا کے مہاجروں کی اکثریت مسلمان ممالک سے نکلتی ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جب سے دنیا کی شہری جنگیں مسلمانوں نے آپس میں لڑی ہیں تب سے۔۔۔، اس ضمن میں ایرانی صحافی امیر طاہری کا کہنا ہے، ’عرب ریاستوں نے ۱۹۳۰ء سے اَب تک آپس میں سرعام یا خفیہ پندرہ سے کم جنگیں نہیں لڑیں۔۔۔ (۵۵)‘گزشتہ دس برسوں میں اسلام پسندوں اور اُن کے مخالف سوشلسٹوں نے ایک لاکھ کے قریب الجزائریوں کو ذبح کر دیا ہے۔ فروری ۱۹۸۲ء میں شام کے حافظ الاسد کی وحشی فوجوں نے ایک شہر پر مسلمان انتہا پسندوں کو گھیرے میں لینے کے چکر میں بمباری کی۔ اُس کے غنڈوں نے پچیس ہزار لوگوں کو نیست و نابود کر دیا۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۰ء تک لبنان کی خانہ جنگی نے کم از کم ڈیڑھ لاکھ لوگوں کی جان گنوائی جن میں سے اکثریت فلسطینیوں کی تھی۔ فلسطینیوں کی یہ اموات گزشتہ پچاس برسوں کی لڑائی میں اسرائیلیوں کے ہاتھوں مرنے والوں کی نسبت دس گنا سے بھی زائد ہیں۔

میرے مسلمان ساتھیو، اگر اس میں سے کسی بات کو تسلیم کرنے میں شرم کا سامنا کرنا پڑتا ہو تو حالات پر

قابو پائیے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہم اپنی بنیادی کج کوتاہیوں کو امریکہ کے سر نہیں تھوپ سکتے۔ سرطان نے تو ہمارے اندر ہی جنم لیا ہے۔ مسلمانوں کی حالتِ زار کے بارے ایک ہلادینے والے کالم، جو پاکستان کے روزنامہ ’دی نیشن‘ میں گیارہ ستمبر کے تھوڑا بعدشائع ہوااور جس میں پاکستان کے ایک بزنس مین عزت مجید نے مسلمانوں کے اندر ایک ’حیران کن آگہی‘ کے حوالے سے اظہار خیال کیا ’کہ مسلمان اپنے اندرموجود تاریخی، سماجی اور سیاسی شیطانوں کے ساتھ صف آراء نہ ہونے کی وجہ سے مہذب معاشرے بنانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔۔۔(۵۶)‘ جیسے یہ حقیقت ہے کہ کالم نگار کے ملک کی ایک سو چالیس ملین آبادی میں فقط ایک ملین لوگ سالانہ ٹیکس کے گوشوارے بھرتے ہیں۔ کچھ واپس نہ لوٹانے (معاشرے کو) کی ذمہ داری سے کلی طور پر دستبردار ہونے کے سبب کیا ٹیکس کے مفروری ہی حکومتِ پاکستان کو دیوالیے کے قریب نہیں لے جا رہے ، تعلیم جیسے عوامی منصوبوں کو مفلسی سے دوچار نہیں کر رہے ، اور دہشت گردی کے اداروں کی معاونت نہیں کر رہے جو بہت سارے مدرسوں کی صورت میں

سامنے آئے ہیں؟
کیا ہم میں سے بہت سوں کو علم ہے کہ یہ کثیر الثقافتی قوم کس طرح معرض وجود میں آئی تھی؟ میں آپ کو بتاتی ہوں۔ ۱۹۴۷ء کا سن تھا۔ آزاد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے محمد علی جناح نے واشگاف لفظوں میں لوگوں کو نوید دی۔ ’’آپ آزاد ہیں(۵۷)‘‘ انہوں نے پُرجوش طریقے سے کہا۔ ’آپ کو اپنے مندروں کی طرف جانے کی آزادی ہے ، آپ کو اپنی مسجدوں کی طرف جانے کی آزادی ہے ، آپ سلطنتِ پاکستان میں کسی بھی عبادت کی جگہ پر آزادی کے ساتھ جا سکتے ہیں۔آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو سکتا ہے۔۔ اس بات کا کاروبارِ سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں، ہم اِس بنیادی اصول سے آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ملک کے شہری ہیں۔۔۔ آپ وقت کے ساتھ ساتھ دیکھیں گے کہ ہندو ہندو ہی رہیں گے اور مسلمان مسلمان، مذہبی لحاظ سے نہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے ایک ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے۔‘ جناح کی غیر مسلمان بیوی تھیں جسے انہوں نے بہت چاہا۔ اُن کی بہن ، فاطمہ پاکستان بنانے کی مہم میں اکثر اُن کے

ساتھ نظر آتی تھیں۔ اُن کی موجودگی نے مسلمانوں میں اِس تصور کے امکان کو اجاگر کیا کہ عورت باندی ہونے کی بجائے ہمسفر بھی ہو سکتی ہے ۔ میں اِس حقیقت کی حمایتی نہیں ہوں کہ مسلمانوں نے ہندوستان سے الگ ریاست کا مطالبہ کیا مگر جب انہوں نے پاکستان حاصل کر لیا تب کم از کم یہ شخصی آزادیوں کے وعدے اور رہنے کیلئے جگہ میسر آ گئی۔

بڑھتی ہوئی اسلامی انتہا پسندی کے جھنڈے تلے پاکستان کی تنزلی پر شرم نہیں آنا چاہئے ، آپ ایسا نہیں سوچتے ؟ ۱۹۷۷ء میں امریکہ کی پشت پناہی میں فوج کی ایک بغاوت نے جنرل ضیاء الحق کو مسلط کر دیا ، جسے گولف، ٹینس اور مطلق العنانیت سے محبت تھی۔ اپنی پتلی گرفت کو مضبوط کرنے کیلئے اُس مردِ آہن نے چاپلوسی ملاؤں کو اپنے گرداگرد اکٹھا کر لیا جو اُسے ''امیرالمومنین'' کا خطاب دیتے تھے ، یہ اصطلاح پیغمبر محمد کے خلیفوں کے لئے وقف تھی ۔ قصباتی رہنماؤں کو لذیذسالن کا ذائقہ دیتے ہوئے ، ضیاء نے تعزیری اسلام کے مطالعہ کو قبائلی اقدار کے ساتھ ملا دیا۔ اِس طرح سنگساری بدکاری کی قانونی سزا ٹھہر گئی اور اِس

کیلئے ضروری تھا کہ مجرم پر جرم عائد کرنے سے پہلے زناکو ہوتا دیکھنے والے چار مرد گواہ موجود ہوں۔ مگر فرض کیجئے کہ زنا کے کیس کے دیکھنے والی اتنی مرد نگاہیں موقع پر موجود نہ ہوں؟ تب یہ قدرتی طور پر بدکاری کا مقدمہ بنتا تھا جو عورت سے سرظن ہوتا ہے اور لہذا اِس کی سزا سنگساری ہے۔

۱۹۷۹ء ، اُنہیں دنوں کی بات ہے جب اِن قوانین نے عوام کا گلا دبانے کا آغاز کیا، پاکستان کے عبدلاسلام کو دو امریکیوں کے ساتھ طبیعات کا نوبل انعام ملا۔ آپ کا خیال ہے کہ اُن کے ملک نے اُن کی بہت تکریم کی ہو گی۔ اِس کی بجائے فسادیوں نے اُن کے پاکستان داخلہ کو روکنے کی کوشش کی۔سلام کا جرم؟ وہ ایک احمدی تھے۔۔ اسلام کی ایک اقلیت۔ جی ہاں۔ صرف اِس ایک بات نے بین الاقوامی سطح کے مانے ہوئے مسلمان سائنسدان کو اُن کے اپنے وطن میں ناقابلِ قبول بنا دیا۔ میں نے عبدالسلام کے بارے مزید تفصیلات ٹورونٹو کے ایک ٹیکسی ڈرائیور احمد سے حاصل کیں۔ اُس نے مجھے جانتے ہوئے کہ میں’ٹی وی پر آنے والی ایک مسلمان ہوں‘، سے شکوہ کے اندازکہ ’ہمارے لوگ کس

طرح ایک دوسرے کو مار رہے ہیں' کہتے ہوئے اپنی بات قبیلے پر مرکوز کرتے ہوئے محبت پر ختم کی۔ محبت! میں نے کسی مسلمان مرد کو لفظ محبت (کسی دوسرے عقیدے والے کیلئے) استعمال کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا۔ یہ شخص مختلف تھا، میں نے اِس کو کریدا۔ یہ کھلا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور خود بھی احمدی تھا۔ میں نے عبدالسلام کے بارے پوچھا کہ وہ اتفاق سے اُس کا نام جانتا ہے۔ پچھلے شیشے سے میں نے اُس کی آنکھوں کی ابروؤں کو تھوڑا اوپر اٹھتے دیکھا۔ 'بھائی عبدالسلام نے اپنے نوبل انعام کی رقم حکومت کو عطیہ میں دینے کی کوشش کی'، اُس نے مجھے بتایا۔ 'وہ پاکستان کی نئی نوجوان نسل کیلئے سائنسی لیبارٹریاں بنانا چاہتے تھے، مگر ضیاء نے ان کی پیشکش مسترد کر دی(۵۸)'۔ احمد نے عبدالسلام کو اپنا ہیرو بنانے کی دوسری وجہ مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بیان کی۔ 'ایک کسان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے سلام میں مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت کی کوئی کمی نہ تھی۔ انہوں نے علم حاصل کرنے کی خاطر بہت محنت کی ۔ اسکول کی لالٹینوں میں مٹی کے تیل کے نہ ہونے کے سبب انہوں نے گلیوں کے

لیمپوں کی روشنی تلے علم حاصل کیا۔ ' یہ درست ہے یا نہیں، یہ داستان قومی ورثے کے دوزخ کو اس طرح ایندھن سے بھر سکتی ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں کو منکسر پاکستانیوں سے عظیم تر بنا سکے۔۔ اور دانش کی دولت سے مالا مال کر سکے نہ کہ ایک تنگ نظر اسلام کے غضبناک رجحانات کی طرف لے جائے۔۔

ضیاء کے تعصبات اُس کی ۱۹۸۸ء میں موت کے باوجود زندہ رہے۔ تب سے اسلام پسندوں نے خطے کی گندی سیاست میں سہولت کے ساتھ اپنا کردار متعین کر لیا ہوا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں ہزاروں مجاہدین یا مقدس جنگجوؤں نے سوویت قبضے سے افغانستان واپس لے لیا۔ جیسے ہی عرب مسلمان مجاہدین خلیج فارس واپس پہنچے ، امریکی فوجیں سعودی عرب کو عراق کے ممکنہ قبضے سے بچانے کی خاطر سعودی عرب پہنچ گئیں۔ ۱۹۹۰ء میں، آپ کو یاد ہو گا کہ صدام حسین کویت پر حملہ آور ہوا اور پھر قابض ہو گیا۔ سعودیوں کو خوف تھا کہ وہ اُن کے ساتھ بھی ایسا ہی کرے گا۔ سعودی یہ چاہتے ہوئے کہ صدام کو کوئی موقع نہ دیں، امریکہ سے اپنی دھرتی اور تیل کے دفاع کیلئے طلبگار ہوئے ۔ امریکہ کی سعودی عرب

میں موجودگی 'کام سے بچھڑے ہوئے مجاہدین' کیلئے
سعودی بادشاہت کے اندر جہاد لاگو کرنے کا عذر بنی۔
مگر بادشاہ نے اِس اندرونی جہاد سے بچنے کیلئے تاوان
دیا۔ یہ پیٹرو ڈالر اسلامی خیراتی اداروں کی معرفت آگے
بڑھے اور انہوں نے خطے میں مدرسوں کی بے حساب
انداز میں نشوونماکی۔ پاکستان میں اِن چندوں کی بڑی
تعداد پہنچی اور وہاں کے مدرسے طالبان کی اشرافیہ
کلاس کے مدرسوں کی صورت ڈھل گئے۔ ایک متوسط
درجے کا مسلمان پاکستان میں کیا کر سکتا ہے؟ بہت
سارے خود کو وحشی بنیاد پرستی کے رنگ میں رنگ لیتے
ہیں۔
اختلافِ رائے کی ایک آواز پاکستانی سفارتکار اور
دانشور اکبر احمد کی تھی۔ ۱۹۹۷ء میں، انہوں نے جناح
کی رزمیہ سوانح پر فلم بنانا شروع کی۔ احمد کے بقول، '
پاکستان کے اعلیٰ حکام' اور 'حساس شہریوں' نے جناح
کے رواداری والے اسلام کو دکھانے سے متنبہ کیا(۵۹)۔
وہاں کے اخبارات اور سیاسی پارٹیوں نے سراسیمگی
پھیلائی کہ ''سلمان رشدی نے اسکرپٹ لکھا ہے''۔' اِس
کے علاوہ انہوں نے اُس کے کام کو 'ہندو یا صیہونی

سازش کا حصہ‘ قرار دیا۔ احمد نے بہرحال یہ فلم بنائی اور بے شمار ایوارڈز حاصل کئے۔ لیکن عبدالسلام کی طرح ، وطن سے تحسین بے قدری کے انداز میں ملی۔ گیارہ ستمبر سے پاکستان کے رہنما پرویز مشرف نے اپنی سمت کا تعین کیا ہے اور صاف صاف کہا ہے (۶۰) : ’آج کے مسلمان غریب ترین، سب سے کم خواندہ، سب سے پیچھے رہ جانے والے، سب سے کم غیر صحتمند، سب سے کم ادراک رکھنے والے، محروم ترین اور انسانی نسل کے کمزورترین لوگ ہیں۔‘ ایک ایسے شخص کے منہ سے اچھے لفظ نکلے جو توہینِ رسالت کے قانون پر پابندی اور مدرسوں کو قابو میں لانے کے وعدوں سے مکرا ہوا تھا۔ مشرف میں جو کہنے کی ہمت نہیں ہے وہ یہ کہ اُس کا ملک مُلا بنانے والے اسکولوں میں مزید گاؤدی پیدا کرنے کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ بات اکبر احمد آپ کو بتا سکتے ہیں۔ اپنے ایک حالیہ پاکستان کے دورہ پرانہوں نے مدرسہ کے اساتذہ سے سگمڈ فرائیڈ اور میکس ویبر کے بارے پڑھانے کی ضرورت پر استفسار کیا۔ ’مجھے ادراک سے بالاترنظروں سے گھورا گیا۔ میں معاملے کی تہہ تک پہنچاجب میں نے اپنی تجویز پر

منفی ردعمل دیکھا کہ مسلمان دانشور جیسا کہ تاریخ دان ابن خلدون اور صوفی شاعر رومی کو پڑھایا جائے (۶۱)'۔ یہ مغرب نہیں ہے جو مسلمانوں کو اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے اندھیرے میں رکھے ہوئے ہے ۔ اس بات کے خطاکار خود مسلمان ہیں۔
اِس کی روشنی میں، کچھ امریکیوں کو یہ جاننا چاہئے کہ جمہوریت پر مائل مسلمانوں کی خا طر 'وہاں موجودہونے کیلئے ' روشن خیال ذاتی مفاد کی ضرورت ہے اس سے پہلے کہ اگلا بحران ختم ہو۔ غور کیجئے کہ امریکی توجہ کس طرح کروڑوں افغانوں کو طالبان کے قہر سے بچا سکتی تھی، القاعدہ کو تو ابھی بھول جائیے۔ ہم نے یہ سب کچھ سنا کہ صدر رونالڈ ریگن نے مجاہدین کیلئے دعاؤں اور اسلحے کی فراوانی کر دی جو کمیونزم سے لڑنے کیلئے اُس کی حکمتِ عملی کا حصہ تھی۔ مگر اُس نے اُن کو اِس سے بھی زیادہ دیا۔ امریکی حکومت نے یونیورسٹی آف نیبروسکا کی اشاعت کردہ نصابی کتب بھی دیں جن کے صفحات پر تشدد پھیلانے کی ترغیب تھی۔ وہاں امریکہ میں تو بچے سیبوں سے کینوؤں کی تفریق پڑھ رہے ہونگے مگر افغان طلباء نے

حساب اور مذہبیات کی کتب کا انتخاب کیا جن کے صفحات پر سنگینیں گھونپنے کی تصویریں تھیں۔ کچھ طلباء تو ابھی بھی یہ کتب پڑھ رہے ہیں۔ افغان اسکولوں سے اِن کتب کو آہستہ آہستہ غائب کیا گیا۔

یہاں پر کسی چار ستارے فوجی کی ضرورت نہیں جو اِس سبق کو سمجھ سکے۔ جب ۱۹۸۹ء میں سوویت یونین نے خود کو افغانستان سے باہر نکالا، ریاست ہائے امریکہ بھی اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا دینے کے خیال سے باہر نکل آیا۔ جس چیز سے امریکہ باہر نکل آیا وہ اصل میں طاقت کی رسہ کشی تھی۔ منجھے ہوئے جنگجوؤں کی حیثیت سے مجاہدین نے آئندہ چند برسوں میں افغانستان کا گھیراؤ کیا۔ حتکہ چوٹی کے امریکیوں نے بھی اِس بات کی پرواہ نہ کی۔ ۱۹۹۸ء میں، پیرس کے ایک اخبار نے زگنیو برززینسکی کا انٹرویو کیا، جو صدر جمی کارٹر کی قومی سلامتی کے مشیر رہ چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا، 'اسلامی بنیاد پرستی پوری دنیا کیلئے وبائے جان ہے'۔ اخبار 'لی نوول آبزرویٹر' نے پوچھا، کیا امریکہ کی خارجہ پالیسی کو مزید قیمت چکانا ہو گی؟ برززینسکی جو ریگن یا کلنٹن انتظامیہ کی اطاعت

گزاری میں نہیں تھے، نے چبھنے والی کوتاہ بینی کے ساتھ جواب دیا، ’دنیا کی تاریخ کیلئے کیا اہم ہے؟ چند سرپھرے مسلمان یا سنٹرل یورپ کی آزادی اور سرد جنگ کا خاتمہ؟(۶۲)‘

وہ اتنا ہوشیار تھا کہ اُسے یہ بات یاد تھی جسے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں صدر آئزن هوور نے سونگھ لیا تھا۔ ایک سٹاف میٹنگ کے دوران ’آئزن هوور نے نفرت کی اُس لہر کا تذکرہ کیا جو عرب دنیا کی حکومتوں کی طرف سے نہیں تھی بلکہ لوگوں کی طرف سے تھی(۶۳)، اُس کی قومی سلامتی کی کونسل نے صورتحال کا تجزیہ کیا تھااور اِس نتیجے پر پہنچی تھی: عام عرب محسوس کرتے ہیں کہ تیل کی خاطر جابر حکومتوں کی حمایت سے امریکہ جمہوریت کی راہوں کو مسدود کرتا ہے۔ یہ اندر کی کہانی ریڈارپر تب سے چالیس سال پہلے ابھری جب طالبان افغانستان پر قابض ہوئے اور القاعدہ کو محفوظ جنت فراہم کی۔ چالیس برس اور یہ بات ابھی تک قابلِ توجہ نہیں ٹھہری۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہ کہہ سکتی کہ واشنگٹن کی کوتاہ بینی اتنی ہی قابو میں ہے جس قدر افغانستان اور

عراق کی سابق حکومتیں قابو میں ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتی۔ مجھے وہ گفتگو بیان کرنے کی اجازت دیجئے جو میں نے حال ہی میں ایک ٹاک شو کے میزبان فل ڈوناہو اور چارلس ڈولان کی ملاحظہ کی، چارلس ڈولان تب 'یو ایس ایڈوائزری کمیشن آن پبلک ڈپلومیسی ' کے وائس چئیرمین تھے۔ یہ ادارہ امریکہ کے دنیا میں منفی تاثر کاتوڑ نکالنے والا ادارہ ہے۔

ڈولان: میرا خیال ہے کہ جہاں تک بین الاقوامی تعلقات کا معاملہ ہے ، بش انتظامیہ جب سے اقتدار میں آئی ہے اُس نے چند بڑے کارنامے سرانجام دئیے ہیں۔ اِن میں سے کچھ سامنے بھی آ چکے ہیں اور وہ اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔۔'

ڈوناہو: کیوٹو معاہدہ پر بندش لگانے سے ، بین الاقوامی جرائم کی عدالت کو کچھ نہ جاننے سے ، اقوام متحدہ کو برا بھلا کہنے سے۔ ہم اس طرح دکھائی دیتے ہیں کہ جیسے شہر میں ہم اکیلے ہی گھومنا چاہتے ہیں، ہمیں کسی کے ساتھ کی ضرورت بھی نہیں۔

ڈولان: فل،اگر تم چاہتے ہو کہ میں اُن کی پالیسیوں پر بات کروں تو ہم مزید پانچ شو کر سکتے ہیں۔

ڈوناہو:لیکن ہم بات کر رہے ہیں کہ ہمیں کیوں اس طرح سمجھا جاتا ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہم کسی کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتے ، کسی بین الاقوامی ادارے کے ساتھ بھی نہیں۔ ہم اس حالت میں متکبر دکھائی دیتے ہیں۔

(خاموشی)

ڈولان: لیکن میں اُس انداز کی بات کر رہا ہوں جس انداز میں ہم دنیا کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں ۔ صرف یہ موضوع ہے جس پر ہم بات کر رہے ہیں(۶۴)۔ ہم امریکہ کے بارے باہر کی دنیا میں غلط تاثرات کو کس طرح جواب دیتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ صرف یہ موضوع ہے جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔

کیا ڈولان احمق تھا؟ میں مانتی ہوں کہ وہ کیمرے کے سامنے اپنے باس یا اُس کی پالیسیوں میں عیب نہیں نکالنا چاہتا تھا لیکن یہ معاملہ نہیں ہے۔ ڈولان تو اُن سوالوں کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہتا تھا کہ درحقیقت امریکہ کا تاثر خراب ہے۔ وہ تو فقط اِس مسئلہ پر بات کرنا چاہتا تھاکہ کیسے اِس طرح کے تاثرات کے ساتھ ذرائع ابلاغ کے ہتھیاروں اور پینتروں کی مدد سے لڑاجا

سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ ڈولان کیچوم کا سینئیر نائب صدر بھی ہے ، کیچوم تعلقات عامہ کا ادارہ ہے۔ حد ہو گئی امریکہ، یہ باتیں تعلقاتِ عامہ کی ضرورت نہیں۔ درست کام کرنے کی مخلص راہ ہونی چاہئے نہ کہ درست نظر آنے کی، وہ کچھ ہونا چاہئے جو آج کی ضرورت ہے۔ امریکہ، تمہارے طالبان کو ہرانے سے کروڑوں افغانی خوش ہوئے ہیں۔ اگرچہ تب سے اب تک کابل کی حدود سے باہر فوجی تعینات کرنے کے سلسلہ میں تمہاری ناکامی کے بعد جنگجو سردار اور طالبان کے حمایتی خوش ہوئے ہیں۔ یقینی طور پر نئے آئین میں خواتین کے حقوق اور آزاد عدلیہ کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ سب کاغذوں پر ہے۔ حقیقت میں ایک اور جنگجو سردارجسے امریکہ کے سیکرٹری دفاع نے 'ایک متاثر کن، مفکر اور نپی تلی شخصیت'' قرار دیا ہے، نے 'امر بالنہی ' کے محکمے کا ازسرِ نو اجراء کر دیا ہے۔ یہ محکمہ عورتوں اور مردوں کی علیحدگی پر سختی سے عمل درآمد کراتا ہے، میڈیا کی آزادی کو دباتا ہے، شاعری کی محفلیں بند کراتا ہے،اُن عورتوں کو مارتا ہے جو اپنی تنظیمیں بنانے کی دھن کی پکی ہوں اور طالبان کی واپسی کیلئے زمین

کو جوتتا ہے۔ مفکر؟ نپا تلا؟ امریکہ، کیا تم سنجیدہ ہو؟ اگر واقعی ہی ہو تو تم کابل سے باہر کہاں ہو؟ کیاتم اپنے سپاہیوں کو امن قائم کرنے والا بنانے کے خیال سے متفق نہیں، کیوں تم نے مقامی سپاہیوں کی تربیت کے کام کو آگے نہیں بڑھایا اور وہاں پہلے سے موجود بین الاقوامی فوجوں کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟تمہارے تحفظ کی پھڑکتی رگ کو کیا ہو گیا ہے اور آزادی کہاں گئی؟

میرے ساتھی مسلمانوں! میں آپ کی کبیدہ خاطری کو سن رہی ہوں۔ واشنگٹن کو یہ بات سمجھنی چاہئے کہ جب روشن خیال مسلمانوں نے امریکہ پر دانت نکوسے ، ’ہمیں تم سے نفرت ہے‘، یہ اِس وجہ سے کم تھا کہ امریکہ براہ راست اسلامی دنیا پر ظلم ڈھا رہا ہے بلکہ اس وجہ سے زیادہ تھا کہ امریکہ ناکام ہو رہا ہے ، اپنے تحفظ کے مفادات کے ضمن میں، ایک طویل عرصے پر محیط وحشت کے خاتمے میں مدد کے ضمن میں۔ ’اب تو سمجھ لو!‘ آپ واشنگٹن پر چلانا چاہتے ہیں۔ میں بھی ایسا کرنا چاہتی ہوں۔ مگر آپ کے اوپر بھی میں چلانا چاہتی ہوں، ’بالغ ہو جاؤ!‘روشن خیال مسلمانوں کو اس حقیقت کے حوالے سے بولنا ہو گا: واشنگٹن ایک غیر

متوقع امید ہے جو مجرموں کو نہیں پکڑتی۔ صدر بش سعد ابراہیم کی مدد کو لپکے تھے ، جس کے نتیجہ میں مصر کی جمہوریت کیلئے بھی، یہ بات ہمیں امریکہ پر اعتبار کرنے کی دلیل فراہم کرتی ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں، ابراہیم نے اپنی قوم کے ووٹروں سے کیا چاہا تھا: مردم بیزاری کو ایک طرف رکھیئے اور تعمیری ہو جائیے۔ یہ ممکن ہے کہ امریکیوں کو ہماری مدد کی ضرورت ہو تاکہ وہ انسانی بنیادوں پر روشن امکانات کو عملی حیثیت دے سکیں۔

وہاں تک جانے کیلئے ، مسلمانوں کو یہ بنیادی سوال اٹھانا ہو گا: ہمیں اصلاحات کرنے میں ٹھیک ٹھیک کیا کچھ درکار ہے؟ کیا اصل نجی مسئلہ ہے جو ہم سب کا گھیراؤ کئے ہوئے ہے؟ جیسا کہ نہ اسرائیل اور نہ امریکہ مسلمانوں کی دنیا بھر میں مصیبتوں کی جڑ ہیں، کیا پھر اسلام بذات خود ہے؟ اسلام شمالی افریقہ سے جنوبی ایشیا تک ثقافتوں کے منورنجن کو ایک ساتھ باندھ دیتا ہے ، اور اِن تمام معاشروں میں اقتصادیات اور انسانی حقوق کا ریکارڈباقی دنیا سے کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ کیا اسلام تخلیقی قابلیتوں، حرکت و برکت اور

جمہوریت کو سب سے زیادہ دبانے ولا ہے؟
فقط نہ کہنا تو بہت ہی آسان ہو گا۔ اس کے بارے اس طرح سوچئے۔ پاکستان خود کو علی الاعلان مسلم اکثریت کا ملک قرار دینے والا ۱۹۴۷ء میں معرضِ وجودمیں آیا، یہودی اکثریت والے ملک اسرائیل سے ایک برس قبل۔ کیا جناح کی بصیرت چل سکی، کیا پاکستان ماڈرن ملک بن سکا، اُسی طرح کثیرالثقافتی جس طرح مذہبی جیسا کہ اسرائیل ہے۔ معاملہ بالکل اِس کے برعکس ہوا، جدید سے زیادہ جاگیردارانہ، کثیر الثقافت سے زیادہ فرقہ واریت، مذہبی سے زیادہ جنونی۔ ۲۰۰۲ء میں ٹینس کا ایک جوڑاجو ایک پاکستانی اور ایک اسرائیلی پر مشتمل تھا، میڈیا میں شہ سرخیوں کا باعث بنا۔ وہ خبروں کا حصہ بن گیا، صرف اس لئے نہیں کہ اُس جوڑے نے مسلمانوں اور یہودیوں کے باہم تعاون کے امکان کو اجاگر کیابلکہ اس لئے بھی کہ دونوں ممالک سے ردعمل بھی سامنے آیا۔ اسرائیل ٹینس ایسوسی ایشن نے اپنے کھلاڑی کو منظوری دے دی۔ پاکستان ٹینس ایسوسی ایشن نے اپنے کھلاڑی کو پابندی لگانے کی دھمکی دی۔ جب اسرائیل سیاست سے ہٹ کر معاملات کو دیکھ سکتا ہے، اپنے

مسلمان ہمسایوں کے روز کے محاصرے کے باوجود، پھر کیوں پاکستان اِس چیلنج کو نہیں لے سکتا؟ یقینی طور پر اس دوغلے پن کا ہرقوم کے اخلاقی معیارات کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے اور اِس کا اظہار ہر قوم کی مذہبی اقدار سے ہوتا ہے۔ اور یقینی طور پر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسرائیل میں جمہوریت کے پنپنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ سب کچھ یہودیت کی وجہ سے ہے جو اسلامی ممالک کے بارے نہیں کہی جا سکتی۔۔ کم ازکم ابھی تک تو نہیں۔

لیکن اِن سب باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام بنیادی مسئلہ ہے۔ آخرکار مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمان انتخابی جمہوریت میں رہ رہے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ اگرچہ اِن کی حکومتیں چند آزادیوں اور تھوڑے احتساب کو عوام کے لئے پیش کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اسلام میں معنی خیز جمہوریت کا امکان اِس حقیقت کے ساتھ چمکتا ہو کہ قرآن کسی خاص طرز کی حکومت کے بارے کچھ نہیں بتاتا۔ یہ تصور کرتے ہوئے کہ قرآن خدا کا کلام ہے، سارا یا کچھ ۔۔ تب اِس معاملے میں خاموشی کیا جان بوجھ کر

نہیں رکھی گئی؟ کیا یہ بات یہ دلیل نہیں دیتی کہ ہم انسانوں کو اِس معاملے میںآزاد روی بخشی گئی ہے ، اور ہم اپنی مرضی سے اس کام میں حصہ لے سکتے ہیں؟ اِس بات کے تو کوئی معنی ہیں کہ مسلمان کوئی ایسی کمیونٹی ہوں جو خدا پر ایک ساتھ ایمان لائیں۔ ہر کوئی کہے کہ ہم ہیں۔ ہر کوئی ایمان لائے کہ ہم ہیں ۔ ہم ہیں۔ فرض کیجئے ہم نہیں ہیں۔ فرض کیجئے ہم خدا پر ایمان لانے کی بنیاد پر اکٹھے نہیں ہوئے بلکہ ایک خاص کلچر میں پیدا ہونے کی وجہ سے ایک ہوئے ہیں۔ کیا یہ اسلام ہو گا ، حتکہ اِس کا مجہول حصہ ، کیا ریگستانوں کے راستوں پرایمان لانا الہامیت کی دانش سے زیادہ ہو گا اور کیا مسلمانوں کو عرب قبیلے کی رسہ کشی کی تقلید کرنا سکھایا جائے گاجہاں شیوخ آشیانوں پر حکومت کریں اور باقی ہر کوئی اُن کے زیرِ سایہ تلملائے؟سعودی عرب کے بادشاہ فہد کی بات سنئے ۔ ’دنیا میں موجود جمہوری نظام اِس خطے کیلئے موزوں نہیں ہے ‘ ، اُن کا کہنا تھا ۔’الیکشن کے طریقہ کار کی اسلامی قوموں میں کوئی گنجائش نہیں ہے ‘(۶۵)۔ جب سے اسلام بادشاہ کو چرواہا سمجھتا ہے تب اُس کے ریوڑ کی کون ذمہ داری

لے گا؟ صرف بادشاہ ہی مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کے برابر نہیں سمجھتابلکہ وہ یہ بھی بین السطور مشورہ دیتا ہے کہ عرب کے صحرا ۔۔ 'خطہ' ۔۔ کے لئے جوبرا ہے وہ اسلام کے 'عقیدے' کیلئے بھی برا ہے۔ آپ کو اس پر احتجاج کرنا چاہئے، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں گی کہ بادشاہ کا یوں بازی لے جانا غلط ہے۔ اگرچہ مسلمان ایک ساتھ ہو کر احتجاج نہیں کر پا رہے۔ ہمیں کم پر نہیں اکتفا کرنا چاہئے کیونکہ سعودی آمر اسلام کے دو مقدس جگہوں، پیغمبر کی مدینہ اور مکہ کی مساجد، کے رکھوالے ہیں۔ اُن کو کس نے اسلام کا نگران منتخب کیا ہے؟ ہم نے تو نہیں۔ ہمارے ساتھ یہ کون تمسخر کرتا ہے؟ ہم خود۔ مگر ہم حتکہ اِس کے بارے نہ سوچنے کی بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔

کیا عرب صحرا کی نو آبادیت ایک مسئلہ ہے جس کی اصلاحات کے ضمن میں ہمیں مدد کی ضرورت ہے؟

حوالہ جات:

١ ۔ Joke courtesy of Muhammed Abu Samra, "Martyrdom in Modern Palestinian

Society" (speech given in Toronto), October 6, .2002
۲ ۔ "Jewish and Middle Eastern non-Jewish populations share a common pool of Y-chromosome biallelic haplotypes," Proceedings of the National Academy of Sciences of the United States of America, Volume 97, Issue 12, June 6, 2000, p. 10 of online version. Download .this report at www.pnas.org
۳۔ قرآن، ۱۷:۱۰۴۔ اِس کے علاوہ قرآن کا یہ حوالہ دیکھئے ، ۲۱۔۵:۲۰ ، جس میں ارشاد ہے ’اور یاد رکھو موسیٰ کو جس نے اپنے لوگوں سے کہا ، اے میرے لوگو یاد رکھو اُس رب کی اُس مہربانی کو جو اُس نے تمہیں بخشی۔ اُس نے تم میں سے پیغمبروں کو پیدا کیا ، تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو کسی قوم کو نہیں دیا۔ اے میرے لوگو ، اُس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤجو اللہ نے تمہیں عطا کی ہے۔ پیچھے نہ ہٹو کہ مبادا تم اسے گنوا ہی نہ دو‘‘۔ سو اللہ اِس مقام پر یہودیوں سے مقدس زمین میں داخل ہونے کو کہہ رہا ہے جو وہاں سے نکالے گئے تھے۔ اُن کا قصور پیچھے ہٹ جانا تھے ،

اسی بناء پر وہ خدا کی اطاعت میں ناکام ہوئے تھے۔
۴ ۔ Khaled Al-Azm, The Memoirs of Khaled al-Azm, Vol. 1 (Beirut: Al Dar Al Muttahida Lil-Nashir, 1973), p. 386.
اِس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ مہاجر مسئلہ کی بنیاد پر جنگ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فلسطین کے قیام کے ہی ہمدردی یا توازن برقرار رکھا نہیں جا سکتا۔ اِس ضمن میں یہ حوالہ دیکھیں۔ Benny Morris, The Birth of the Palestinian Refugee Problem, 1947-49 (New York: Cambridge University Press, 1989)
۵ ۔ Kanan Makiya, "Can Tolerance be Born of Cruelty in the Arab World?" New Perspectives Quarterly, Winter 2002, p. 3 of online version. Read it at www.digitalnpq.org
۶۔ Paul Adams, "Tourists, investors shun Beirut despite facelift," Globe and Mail, March 27, 2002
۷ ۔ Arieh L. Avneri, The Claim of Dispossession: Jewish Land Settlement and the Arabs 1878-1948 (New Brunswick, New Jersey:

Transaction Books, 1984), p. 114

ایونری خاص طور پر لکھتی ہیں، ''۳۱مارچ ۱۹۱۱ء کو یروشلم کے قریب ایک سو پچاس معروف عربوں نے راغب ناشاشیبی کی سربراہی میں ترک پارلیمان کو ایک تار روانہ کیا تھا جس میں یہودیوں کو زمینیں بیچنے پر احتجاج کیا گیا تھا۔ حتکہ یروشلم کے مئیر حسین الحسینی جیسے معتدل مزاج عرب رہنما ، جن کا خیال تھا کہ عربوں کے یہودیوں سے سیکھنے کو بہت کچھ پڑا ہے ، بھی یہودیوں کو زمین فروخت کرنے پر اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کیا تھا۔ 'اِس سب کے باوجود ہمیں صیہونیوں پر نگاہ رکھنا ہو گی۔ اگر اسی طرح ہوتا رہا جس طرح ہو رہا ہے تو ہماری ساری زمینیں اُن کے پاس چلی جائیں گی۔ ہمارا کسان غریب اور مجبور ہے اور غریب آدمی اپنے جسم اور روح کو ایک ساتھ رکھنے کیلئے اپنی زمین کے ٹکرے ٹکرے کر دینے کو تیار ہوتا ہے۔ اِس بناء پر حکومت کو زمینیں یہودیوں کو فروخت کرنے کے خلاف قانون بنا دینا چاہئے اور ملک کے حالات کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔'

۸ ۔ جبکہ ترک حکام اِ س بات پر تردید کرتے ہیں کہ

آرمینیوں کا قتلِ عام ہوا تھا، حتکہ مسلمانوں کے سب سے زیادہ حمایتی مغربی رپورٹر رابرٹ فسک بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کرتے۔ اِس ضمن میں ۱۵اگست ۲۰۰۰ء کی اخبار دی انڈیپینڈینٹ ملاحظہ فرمائیں۔
مضحکہ خیز طور پر ابھی تک اسرائیل کی نصابی کتب میں آرمینیوں کے قتل عام کا ذکر اِ س اندیشے کی بناء پر نہیں کیا گیا کہ وہ خطے میں اپنے مضبوط ساتھی ، ترکی ،کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ یہ اسرائیل کی ایسی پالیسی ہے جس پر تنقید کرنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں۔ یہ تاریخی اور اخلاقی لحاظ سے غلط ہے۔

۹۔ Palestine Royal Commission Report, Cmd 5479 (London, July 1937), p. 135

۱۰۔ Sandra Mackey, Passion & Politics: The Turbulent World of the Arabs (New York: Plume, 1994), pp. 121-22.

یہ بہت عمدہ کتاب ہو، اگر حد سے زیادہ ہمدردانہ ہوتی، عرب ثقافت کی ترجمان ہوتی نہ کہ تاریخ کی کتاب۔

۱۱۔ December 10, 1938 report in the News Chronicle, quoted by Maurice Pearlman, Mufti

of Jerusalem: The Story of Haj Amin el Husseini (London: V.Gollancz, 1947), p. 20
یہ جذبات اِس پراسرار خاموشی کی بازگشت ہیں کہ ایک معاصر عرب کسان عرب دہشت گردوں کے بارے کیا کہتا ہے: ''اِن کا کہنا ہے کہ وہ ہیرو ہیں، وہ ہمارے لئے صرف تباہی لائے ہیں اور ہمیں بے گھر کیا ہے۔ انہوں نے چھپنے کیلئے ہمارے کھیتوں، گھروں اور بچوں کو آڑ بنایا''۔
ملاحظہ فرمائیں۔ Paul Adams, "Protests a rare sign of support by Palestinians for a ceasefire," Globe and Mail, May 21, 2003

۱۲ ۔ Quoted by Maurice Pearlman, Mufti of Jerusalem, p. 29

۱۳ ۔ Hitler quoted by Robert Wistrich, Hitler's Apocalypse: Jews and the Nazi Legacy (London: Weidenfeld & Nicolson, 1985), p. 164
میں نے خاص طور پر اِن ابواب پر زور دیا۔ Swastika, Crescent and Star of David" and "Militant Islam ".and Arab Nationalism

۱۴ ۔ Sir Martin Gilbert (speech in Toronto), January 30, 2003

۱۵۔ Haj Amin quoted by Maurice Pearlman, Mufti of Jerusalem, p. 51

۱۶۔ یہ حوالہ صیہونی جانب سے نہیں آیا بلکہ صیہونی مخالف جانب سے آیا ہے۔ Walid Khalidi, "Revisiting the UNGA Partition Resolution," Journal of Palestine Studies, Issue 105, Autumn 1997, p. 11.

خالیدی لکھتے ہیں، ''آبادی کے لحاظ سے مجوزہ فلسطینی ریاست آٹھ لاکھ اٹھارہ ہزار فلسطینیوں پر مشتمل ہو سکتی تھی جبکہ یہودی تو دس ہزار سے بھی کم ہونا تھے مگر یہودی ریاست چار لاکھ ننانوے ہزار یہودیوں پر مشتمل ہونا تھی اور اِس میں قریب چار لاکھ اڑتیس ہزار فلسطینی ہوتے۔۔۔''

۱۷۔ Bernard Lewis, The Middle East: 2000 Years of History from the Rise of Christianity to the Present Day (Wiedenfeld & Nicolson, 1995), p. 365

۱۸۔ Gilles Kepel, Jihad: The Trail of Political Islam (Cambridge: Harvard University Press, 2002), p. 53

Gaber Asfour, "Osama bin Laden: Financier - ۱۹
of Intolerant 'Desert' Islam," New Perspectives
Quarterly, Winter 2002. Download at
www.digitalnpq.org

Muhammed Abu Samra, "Martyrdom in- ۲۰
Modern Palestinian Society" (speech given in
Toronto), October 6, 2002

Al-Hayat Al-Jadida, September 2, 2002. - ۱ - ۲۱
Translated by Independent Media Review
Analysis and checked against other translations

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نبیل عامر، جو ایک اخبار کے مدیر بھی رہ چکے ہیں، محمود عباس کی کابینہ میں وزیر اطلاعات کے طور پر مقرر ہوئے۔

Yousef Al-Yousef, "Israeli propaganda - ۲۲
nominated for Oscar," www.arabia.com, March
21, 2002

بہر کیف یوسف ال یوسف اِس تبصرہ میں بطور ''چئیرمین آف دی امریکن مسلمز فار گلوبل پیس اینڈ جسٹس'' بتائے جاتے ہیں۔ یہ تنظیم واشنگٹن ڈی سی میں قائم امریکن مسلم ہیومن رائٹس ایڈووکیسی گروپ

کھلائی جاتی ہے۔
۲۳ ۔ جس اُستاد کا تذکرہ ہوا اُن کا نام نائم جیناح ہے
جو Palestine Solidarity Committee of South
Africaکے ترجمان بتائے جاتے ہیں۔ انہوں نے تیس
ستمبر ۲۰۰۲ء کو "South Africa and Israel 150 The
Practice of Apartheid"کے موضوع پر لیکچر دیا تھا۔
۲۴ ۔ جس رکن پارلیمان کا ذکر ہوا، اُن کا نام Amnon
Rubinstein ہے۔
۲۵ ۔Anton Shamas, an Arab-Israeli writer,
quoted by Yosef Lapid, "To my candid, envious
friend," Jerusalem Post, June 13, 1995. The
Hebrew language newspaper in which Shamas
wrote is Ha'ir, a Tel Aviv local
۲۶ ۔میری ریسرچ کی معاون نے خط لکھنے والے سے
براہِ راست رابطہ کیا، اُس کا نام Arjan El Fassed ہے،
جس کا کہنا ہے کہ القدس اپنے کہے سے نہیں مکری۔
پوری کہانی پڑھنے کیلئے میری ویب سائٹ کے اِس حوالہ
کو کلک کریں۔
۲۷ ۔Edward Said, "Israel-Palestine: a third way,"

Le Monde Diplomatique (English translation), September 1998, p. 6

Edward Said, Ibid., p. 7۔ ۲۸

۲۹ ۔ میری ویب سائٹ پر اِس حوالہ میں اس طرح کے چند کارٹونوں کو دیکھئے۔ میں نے اپنے چند غیر یہودی دوستوں سے پوچھا جو اِس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے ، بیشتر نے یاد کر کے مجھے بتایا کہ ہاں اِس طرح کے کارٹون انہوں نے دیکھے تھے۔

For fully documented examples of this, visit ۔ ۳۰ www.memri.org and read Robert Wistrich, Muslim Anti-Semitism: A Clear and Present (Danger (American Jewish Committee, 2002

اِن تمام حوالوں کے ساتھ تمام مثالوں کے ثبوت ہیں، اِن حوالوں کو خالی پیش نہیں کیا جا رہا۔

۳۱ ۔ وزیر اطلاع کا نام مصطفی تلاس ہے۔

۳۲ ۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مارٹن لوتھر کنگ جونئیر نے زایونزم پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ اِس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں کہ انہوں نے ایسا کیا تھا۔ کنگ کا معروف ’صیہونی مخالف دوست کے نام خط‘

ایک جعلی داستان دکھائی دیتا ہے۔ اِس خط کو اکثر کنگ کی تحریروں کے مجموعہ This I Believe میں شامل کیا جاتا ہے۔ مگر اِس مجموعے کو صفحات کے نمبروں کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا، اِسی سبب سے یہ خط شامل نہیں سمجھا جاتا۔

۳۳ ۔ بمطابق Middle East Media Research Institute, Ahmad Dabour, Secretary General of the Palestinian Information Ministry, wrote in the November 14, 2002 edition of Al-Hayat Al-Jadida ''اگر ہم زایونزم کواس طرح پیش نہ کریں تو یورپ کی قوم پرست اور نسل پرست تحریک جو سابقہ نو آبادیت اور استعماریت کے بعد اٹھی تھی، وہ ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

۳۴ ۔ David Matas, "Israel and the Palestinians: Myths and Realities" (Institute for International Affairs of B'Nai Brith Canada, 2001), p. 5 میٹس ایک اور دلچسپ نقطہ اٹھاتے ہیں: ''جرمنی کا قانون ہر اُس شخص کو جرمن آکر شہریت لینے کی اجازت دیتا ہے جو کسی بھی جرمن شہری کی نسل سے

ہو اور جس کو ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء سے ۸ مئی ۱۹۴۵ء کے دوران سیاسی، نسلی یا مذہبی بنیادوں پر شہریت دینے سے محروم رکھا گیا تھا۔ ایسے شخص کا پہلی نسل کا آبادکار ہونا ضروری نہیں۔ جرمنی کا یہ قانون بذاتِ خود غیررسمی طور پر ’لاء آف ریٹرن‘ کہلاتا ہے ، اگرچہ اقوام متحدہ کی کسی قرار داد نے جرمن لاء آف ریٹرن کو نسل پرست قرار نہیں دیا۔‘‘

۳۵ ۔ Amnon Rubinstein, A minority within a minority," Ha'aretz, October 7, 2002. Rubinstein quotes Dr. Alex Lowenthal, head of the Israeli Health Ministry's Public Health Service: جن کا کہنا ہے ، ’’عرب عیسائیوں کی صحت کی صورتحال اسرائیل میں بہت عمدہ ہے۔ یہودیوں سے بھی بہتر۔‘‘

۳۶ ۔ ویب سائٹ پر تصویر دیکھئے۔

۳۷ ۔ Thomas Friedman, The Lexus and the Olive Tree (New York: Farrar, Straus Giroux, 1999), p. 278

۳۸ ۔ Irfan Husain, "When will we ever learn?" DAWN, December 21, 2002

۳۹ ۔ Farid Esack, On Being a Muslim: Finding a Religious Path in the World Today (Oxford: Oneworld Publications, 1999), p. 15

۴۰ ۔ اِس کلپ کو دیکھئے۔

۴۱ ۔ Fareed Zakaria, The Future of Freedom: Illiberal Democracy at Home and Abroad (New York: W.W. Norton, 2003), pp. 135-36

۴۲ ۔ Hala Boncompagni, "Japanese pocket monster 'Pokemon' game fans passions in Jordan," Agence France Presse wire service, April 5, 2001

بون کمپانگی نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے، ’’سعودی عرب اور قطر میں پوک مان پر پابندی کے فتویٰ یا مذہبی فرمان کے بعد عمان میں جذبات کا کھیل شروع ہو گیا ہے اور اِس گیم نے عیسائی کمیونٹی کے اندر تناؤ پیدا کر دیا ہے جبکہ کچھ اُردنی اِس کو اسرائیلی سازش کے طور پر لیتے ہیں۔ سیریا آرتھوڈوکس کرسچئین کمیونٹی کے فادر ایمانوئل ایسٹیفن بانا نے اِس نفرت کی لہر کو چند روزپہلے ہی محسوس کر لیا تھا جب پہلا گمنام پیغام اُن کی فیکس مشین پر آیا تھا۔ پیغام میں بتایا گیا تھا کہ

لفظ پوک مان اور اِس گیم کے دوسرے کرداروں کے نام یہودی الفاظ ہیں جو شام کی قدیم زبان میں موجود ہیں اور اِسے اسلام کی توہین تصور کیا جاتا ہے۔ پادری نے اے ایف پی کو بتایا تھا کہ 'وہ (مسلمان) کہتے ہیں کہ لفظ پوک مان کا مطلب ہے کہ میں یہودی ہوں اور پکاچو (گیم کا مرکزی کردار) اللہ کی بُری اور جذبات مجروح کرنے والی تشبیہہ ہے۔''

۴۳ ۔ اُسی ملا، شیخ عبدل عزیز بن عبداللہ الشیخ نے الزام لگایا کہ پوک مان ٹریڈنگ کارڈز کی اکثریت چھ ستاروں والی علامت پر مشتمل ہے ، جو زایونزم کی بین الاقوامی علامت ہے اور جو اسرائیل کی ریاست کی بھی علامت ہیں۔

۴۴ ۔ President George W. Bush (speech at the United States Military Academy, West Point, New York), June 1, 2002. Download at www.whitehouse.gov

۴۵ ۔ Hisham Kassem in interview with "All Things Considered," National Public Radio, July 29, 2002

۴۶ ۔Saad Ibrahim (speech to Freedom House, Washington, DC), October 21, 2002
۴۷ ۔ابو زید کے بارے عمدہ تبصرہ پڑھنے کیلئے ملاحظہ فرمائیں۔ Mary Anne Weaver, "Revolution by Stealth," New Yorker, June 8, 1998
۴۸ ۔ Saad Ibrahim (speech to Freedom House, Washington, DC), October 21, 2002
۴۹ ۔ Jon B. Alterman, Egypt: Stable but for How Long?" The Washington Quarterly, Volume 23, Number 4, Autumn 2000, p. 115
۵۰ ۔ Saad Ibrahim (speech to Freedom House, Washington, DC), October 21, 2002
۵۱ ۔ Rami Khouri, "Don't stifle a rare Arab voice of moderation," Globe and Mail, July 5, 2000
۵۲ ۔ Claudia Winkler, Egypt's Sakharov," Weekly Standard, July 31, 2002, p. 1 of online version. Download at www.weeklystandard.com
۵۳ ۔ To download this letter, visit www.memri.org, click on "Reform in the Arab Muslim World," and then go to "October 15,

2002: Liberal Arab Intellectuals Call on President Mubarak to Free Dr. Sa'ad Al-Deen ".Ibrahim

۵۴ ۔ مجھے اِس بات کی تصدیق بہت ساری خواتین سے ملی۔ ظاہر ہے وہ اپنا نام افشا ہونے کی خواہش نہیں کریں گی۔

Amir Taheri, "The Arab Role," National ۔ ۵۵ Review Online, December 20, 2002

Izzat Majeed quoted by Tom Friedman, ۔ ۵۶ "Breaking the Circle," New York Times, November 16, 2001. Friedman took the quote from what he calls "the popular Pakistani daily, ".The Nation

Muhammad Ali Jinnah (in his first speech ۔ ۵۷ as Governor-General of Pakistan), August 11, 1947

Ahmed, conversation in Toronto, ۔ ۵۸ September 13, 2002

Akbar Ahmed and Lawrence Rosen, "Islam ۔ ۵۹ and Freedom of Thought,"

www.islamfortoday.com (archived), p. 2

۶۰ - Pervez Musharraf as quoted by
www.bbc.co.uk, February 16, 2002

۶۱ - Source: Akbar Ahmed, "Reforming the
Madrassah," www.beliefnet.com (archived), p. 1

۶۲ - Zbigniew Brzezinski, Le Nouvel
Observateur, January 15-21, 1998, p. 76

۶۳- President Eisenhower as quoted by Noam
Chomsky, "Drain the swamp and there will be no more mosquitoes," The Guardian, September 9, 2002, p. 1 of online version

۶۴- Donahue," MSNBC, August 2, 2002"

۶۵- King Fahd as quoted by John Esposito, "A
Response to 'The Place of Tolerance in Islam'," Boston Review, February/March 2002, p. 2 of online version

اسلام کا نچلا پوشیدہ حصہ

زیادہ عرصہ کی بات نہیں ہے، شمالی امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں میں کسی ہفتہ کے موقع پر خدا اور ہم جنسوں کے موضوع پر اظہارِ خیال کر رہی تھی(۱)۔ میرا موضوع عالمگیر اتحاد کے حوالے سے تھا جو عیسائیت سے شروع ہوتا ہوا یہودیت اور اسلام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تینوں مذاہب کے لوگوں اور دیگر سننے والوں سے لیکچر ہال بھرا ہوا تھا۔ فقط ایک جتھا تیار ہو کر آیا۔ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (ایم ایس اے) نے اپنے ارکان کی ایک بٹالین بھیجی جو ہال کے گھیر پر ایک قطار میں کھڑی تھی۔ وہ سب کھڑے تھے تاکہ میں جب بھی اپنے نوٹس سے نظر اٹھا کر جس سمت بھی نگاہ کروں میں اسلام کے معتبر اور نامطمئن چہروں کو دیکھ سکوں۔

سوال و جواب کے دور میں میں نے اپنے سننے والوں کیلئے ایک استفساریہ اعتراض اٹھایا۔ اگر اسلام ایک 'سیدھا راستہ' ہے تو پھر گھمن گھیریوں پر کیوں عمل ہو رہا

ہے؟ کیوں مشرقِ وسطیٰ سے میری ایک دوست اسلام کو ایک ترقی پسند قوت کہتی ہے، صرف یہ جانتے ہوئے کہ اُس کے پاس اپنے حجاب کو ڈیزائن کرنے کا اختیار ہے، جبکہ ایک دوسری دوست پاکستان سے مجھے پوسٹ کارڈ ارسال کرتی ہے جس میں ایک عورت کے جسم کے گرد تھیلا سا چڑھا ہوا ہے جس سے بمشکل دیکھنے یا سانس لینے کیلئے ایک درز ہے؟ (نیچے لکھا ہے، 'پشاور سے سلام!' یہ پوسٹ کارڈ طالبان کے زمانے کی فخریہ یاد ہے)۔ میری یہ بتانے کی کوشش تھی کہ اسلام بہت سارے معاملات میں اتنا سہل نہیں جیسا مسلمانوں کو بتایا گیا ہے۔

وہ نقطہ بعد میں ہونے والے غل غپارہ میں ہی گم ہو گیا۔ 'عمل میں کیوں فرق ہے؟' ایم ایس اے کا ایک رکن کمرے کے پیچھے سے چلایا۔ 'کیونکہ پاکستانی صحیح مسلمان نہیں ہیں، وہ 'کنورٹس' ہیں اسلام تو عربوں پر اُترا تھا'۔ اِس پر اُس کے جنوبی ایشیائی رفیقوں نے اپنے سر میری طرف سے پھیرے، اُس پر وحشت اور ضرررسانی کے انداز کے ساتھ چڑھ دوڑے۔ ایم ایس اے کا ہم جنس پرست مخالف بریگیڈ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

اگلے روز ایک پاکستانی عورت نے مجھے ای میل بھیجی۔ وہ مجھ سے اُس طالبعلم کے بارے معافی مانگنا چاہ رہی تھی جو مجھے مسلسل گھورتے ہوئے جھپکا دینا چاہتا تھا۔ وہ میرا کچھ نقصان نہیں کر سکا، میں نے لکھا۔ نقصان تو ہوا ہے، اُس نے جواباً لکھا۔ اپنے عرب ساتھی کی تشریح کہ وہ تو فقط ایک مقلد مسلمان ہے پر وہ رات بھر غور کرتی رہی۔ 'میں ہم جنسوں کو چیلنج کرنے کا حق رکھتی ہوں'، اُس نے زور دیا، 'مگر میں یہ کہوں گی کہ میں تمہیں حواس باختہ کرتے سمے اچھا محسوس نہیں کر رہی تھی'۔ میرے نقطہ نظر کے مطابق دلیل کا جواب دلیل سے دینا ہوتا ہے۔ میں صرف یہ نہیں جان سکی کہ 'اصل حکم' سے کس طرح اختلاف کرتے ہیں؟ مزید بعد کی ای میلوں میں اُس نے وضاحت کی کہ اُس کی مراد عرب کے 'اصل حکم' سے ہے۔ وہ یہ جاننا بھی چاہ رہی تھی کہ اُس کی تنظیم میں عرب نسل پرستی سے کس طرح نپٹا جا سکتا ہے؟

میں نے 'کیویر ٹیلیویژن '' پر اپنے عرصہ کے دوران یہی سمجھنے کی کوشش کی۔ مسلمان ناظرین کی ایک بڑی تعداد نے میرے مذہبی مبادیات کو خالصتاً نسلی بنیادوں

پر چاک چاک کر کے رکھ دیا۔ ایک 'فخریہ عرب' کے ایک پسندیدہ خط نے مجھے جھوٹی اور ہم جنس پرست سورنی کا خطاب دیا کیونکہ بقول اُس کے مجھے ایک 'انڈین گنوار' کو اسلام کی کیا سمجھ ہو سکتی ہے۔ مجھ پر رحم کھائیے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ بچپنے میں میری زندگی پر عربیت کا اتنا اثر تھا کہ جب مجھے بچے 'پاکی' کہتے تھے تو میں انہیں یہ کہتے ہوئے لڑ پڑتی تھی کہ میں اصل میں عرب تھی۔ وہ ناظرین جو مجھے سورنی کہتے تھے، میں اُنہیں فقط یہ جواب دیتی تھی کہ ہم مسلمان سور نہیں کھاتے، لہذا آپ کی بات میں کوئی وزن ہے کہ ہم سور ہو سکتے ہیں؟ وہ شے جس پر وہ 'ننگا' ہو جاتا تھا وہ تھیں اُس کی گالیاں۔

اُن دنوں مجھے ایک بڑا نقطہ نہیں سوجھا تھا۔ جو اَب سوجھتا ہے۔ یہ بانی کے اعزاز کے بارے ہے۔ جب عرب اسلام کا ایجنڈا تشکیل دینے کے اعزاز کی بات کرتے ہیں، وہ اِس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کیسے تقلید نے دانش کی جگہ لی۔ جس طرح عرب ذہن کنفیوژن کا شکار ہو چکا ہے اُسی حساب سے مسلمان ذہن بھی اُلجھا ہوا ہے۔۔جیسے تمام مسلمانوں کو ایک بھڑی ہوئی قطار میں

مارچ (یا لنگڑا کر) کرناچاہئے۔ ’ہم اتنے سمارٹ کہاں ہیں‘‘ یہ پوری اسلامی دنیا میں گیارہ ستمبر کے حوالے سے عام پیش کی جانے والی وضاحت ہے کہ مسلمان گیارہ ستمبر کے سانحے کا پلان بنانے میں کیوں ممکنہ حد تک ملوث نہیں ہیں(۲)۔ ’بوجھو کون والی‘ یاوہ گوئی میں یہودیوں کی سازشوں کو نمایاں کیا جاتاہے۔ ہمیں اِس بات پر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ یہ تھیوریاں مشرقِ وسطیٰ میں آناً فاناً پھیلائی گئیں، جہاں اسرائیل خاص دشمن تصور کیا جاتا ہے۔ مگر یہ الزام کہ یہودیوں نے گیارہ ستمبر کا پلان بنایا، بڑے یقین کے ساتھ پاکستان، سنٹرل ایشیااور شدت کے ساتھ جنوب مشرق ایشیا کی روایتی کثیر الثقافتی مسلمان کمیونٹیوں میں پھیل رہا ہے ، جہاں کے بارے عربوں کا یہ بغض ہے کہ رنگ برنگے لوگوں کا اسلام کے ساتھ کیا تعلق۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ آج مسلمان اُس طرح ایک بین الاقوامی برادری نہیں ہیں جس طرح ایک عرب قبیلے کی صورت ہیں(۳)۔ یہ ایک عرب قبیلہ ہے ، اِس سے کم تر نسل کے لوگ اپنی اطاعت کو شیوخ کے حضور پیش کریں۔ شناخت، تحفظ نہیں، کا دارومدار تقلید پر ہے۔ شاید اسی لئے فلسطین

اسرائیل تنازعہ، تمام منطقی اعتبار سے ایک علاقائی جنگ، دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد کی آزمائش کا امتحان بن چکی ہے۔ حقائق کی مدبرانہ جانچ پڑتال نہ صرف غیر متعلقہ ہو چکی ہے بلکہ اِس کی ضرورت پر بھی زور نہیں دیا جاتا۔ قبائلی تعلق کے مان کی خاطرہر چیز کو درست قرار دینا ہی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔
جہاں دیدہ صحافی فرید ذکریا ۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب 'آزادی کا مستقبل' میں میرے نقطہ کی توثیق کرتے ہیں، 'انڈونیشیا کے مسلمان جنہیں بیس سال قبل یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ فلسطین کہاں ہے ، آج فلسطینیوں کی خاطر جہادی بننے کو تیار ہیں۔ عرب اثرات تو آرکی ٹیکچر تک میں دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اپنی عمارتوں پر اسلامی دنیا عرب اثرات کو مقامی رنگ میں ملا کر رکھ دیتی ہے جیسے ہندو، جاون اور روسی ثقافتوں میں۔ مگر جیسے انڈونیشیا اور ملائشیا میں مقامی ثقافتوں کو بھی نظر انداز کیا جانے لگا ہے کیونکہ وہ خود کو کافی حد تک اسلامی (یعنی عرب) نہیں دیکھ پا رہے (۴)'۔
شاید یہ صحرائی ذہن کا انداز ہے جو 'حصار' (ڈمی

چیود) کو ایجاد کرتا ہے، مسلمان دنیاؤں میں یہودیوں اور عیسائیوں کو منظم طور پر دبانے کی کوشش۔ حتکہ کیوں ہماری رواداری کے اعلیٰ دور میں بھی مخصوص لوگوں کو کم تر جانا جاتا تھا؟ کس بات نے نسلی منافرت پر مبنی دستاویز معاہدہ عمر کو جنم دیا؟ جو قرآن پر بھی فوقیت اختیار کر گیا، قرآن غیر مسلموں سے محبت کی گنجائش دیتا ہے ۔ پھر کس بات نے کٹر پن کی حدود کا تعین کیا؟ مجھے یہ نقطہ نظر پیش کرنے دیجئے: صحرا میں مساوات پیدا نہیں ہو سکتی بالکل نہیں اگر قبیلے کی نسل ایک رکھنا مقصود ہو۔

شایدیہی صحرائی قبائلی نظام کی گرفت ہے کہ فلسطینی خودکش بمبار وں کا دارومدارعرب آمروں کے فرمان پر ہوتا ہے (۵)۔ صحرائی قبیلے کی پدرانہ شفقت کا یہ مطلب ہے کہ خیر شیوخ کی مرضی سے قطرہ قطرہ کر کے ٹپکتی ہے۔ اس حوالے سے 'ہمیں بہت زیادہ خود تنقیدی درکار ہے'، یہ بات ڈاکٹر ایاد سراج نے غزہ میں اپنے مرصع گھر میں بیٹھے جولائی ۲۰۰۳ء میں کہی۔ وہ غزہ کمیونٹی مینٹل ہیلتھ پروگرام کے بانی ہیں۔ وہ ایک ایسے فلسطینی ہیں جن کی صاف گوئی نے یاسر عرفات

کو اُنہیں گرفتار کرنے پر مجبور کیا۔ ڈاکٹر سراج اُس خود مسلط خوف اور احساس کا ذکر کر رہے تھے جس سے اسرائیلیوں کا بطور استحصالی حلیہ بگاڑا جاتا ہے اور پھر انہوں نے اپنے لوگوں کے بارے یہ بات خود ہی کہی، 'مجھے اندازہ ہے کہ ہمارے بہت سارے نفسیاتی عوارض ہیں۔ یہ مردوں کا معاشرہ ہے جہاں عورت کا کوئی کردار نہیں ہے ، یہاں پر اندھی پیروی کی بوجھل فضا ہے ۔۔۔ یہ ایک قبائلی نظام ہے جہاں اختلاف کو بغاوت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ہم نے ابھی تک تمام عرب ممالک کے اندر باشعور شہریت کی ابتدا ہی نہیں کی جہاں تمام لوگ قانون کے سامنے برابر ہوں۔ یہ بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔' میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں۔ راجا شہادھے رمالا میں کھل کر بول نہیں سکے تھے کیونکہ وہ خود مانتے تھے کہ فلسطین میں سماجی تعلقات کا بچھا جال فرد کی آزادی کو روند ڈالتا ہے۔ لوگ کم وبیش خود کو ایک زنجیر کے ساتھ بندھے پاتے ہیں جہاں ایک کمزور کڑی ۔۔ اختلاف رائے کی آواز ۔۔ کی کوئی جگہ نہیں۔ آپ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں جب آپ الگ تھلگ ہونا چاہتے ہیں کیونکہ آپ کی منزل فقط آپ کی منزل نہیں

ہے ، یہ آپ کے قبیلے کی ملکیت ہے۔ آپ کی عزت فقط آپ کی عزت نہیں ، حد سے تجاوز کرنے کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنے رشتہ دار اکثر اوقات اپنے مہربان کا خیال نہیں۔ اور ممکن ہے کہ یہ اسلام کی صحرائی شخصیت کی وجہ سے ہی ہے ورنہ کیوں ایک مسلمان عورت کو بے عزت ہونے والے کنبے کی تلافی کیلئے زنا کا نشانہ بنایا جاتا چاہے اُس کنبے کی بے عزتی میں اُس عورت کا کوئی کردار نہ ہو بلکہ کسی اور کا ہو۔ مگر چونکہ اُس عورت کا ایسے کنبے سے تعلق ہے ، اُس کا زنا کرنے سے اُس کے کنبے کی بے عزتی مقصود ہے ، عورت کو خاندان کی خونی نسلوں میں ایک مہرے کے طور پر استعمال کرنا مقصود ہے۔

’یہ اسلام نہیں ہے!‘ آپ میں سے کچھ احتجاجاً کہیں گے۔ ’ پوری ملت اسلامیہ کا طرزِ عمل مذہبی اور غیر مذہبی اقدار کا ملاپ ہے!‘ یہ صحیح ہے نا ، اِسی لئے یہ سوال ابھرتا ہے ، کیا صحرا کے رواجوں کو اسلام سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے لیکن اگر واقعی ہی کیا جا سکتا ہے تب تو ہمارے پاس اصلاحات کے مشکل راستے کی کوئی امید ہے۔

اگر آپ اس بات کے بارے سوچیں تو میں آپ کو اِس کا جواب دینے پر چیلنج کرتی ہوں: کیوں مذہب کیلئے مقامی رواجوں سے رہائی پانا اتنا مشکل ہے ۔۔ قبائلی رواجوں سے ۔۔ کیااسلام کی شروعات کی غرض سے کسی ٹھوس قبیلے کی ضرورت ہوتی ہے؟ ہر مذہب کا اپنا ایک الگ انداز ہوتا ہے ، اُس کے ذہن اور شریر کے تانے ہوتے ہیں۔ اسلام کے صحرائی قبائلی نظام میں کیا کچھ شامل ہے جو استحصال کی سطح پر مرتبوں کو متعین کرنے کا فضیلہ سرانجام دیتا ہے؟

غابر اصفور ایک مصری مصنف ہیں جو نتارا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیسے 'صحرا کے اسلام' نے اُن کے اپنے ملک کی اوپر نیچے ہونے والی طوفانی روایات کے ساتھ ملاپ کیا۔ صحرائی اسلام کے بارے اُن کی رائے ہے ، 'یہ الحرا ۔۔ تنگ راستوں والے شہری بازاروں ۔۔کی ہمہ جہت اور مول تول والی زندگی کے خلاف ہے ، یہ شدت پسند ہے (۶)'۔ ساتویں صدی کے بدوؤں کی طرح، جنہوں نے ہر موڑ پر پشتینی جھگڑوں کو اُن لوگوں کے خلاف آگے بڑھایا ، صحرا متاثر اسلام پسند نفرت کو تو فوری جنم دیتے ہیں۔ 'دوسرے' ، اس کا مطلب ہے کہ یہودی، اس کا

مطلب ہے کہ مغربی لوگ۔ اس کا مطلب ہے کہ عورتیں جن کے بارے اصفور کہتے ہیں کہ اِن کا شمار صحرا کی ثقافت میں بطور 'برائی اور شہوت کا منبعہ(۷)' ہوتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سعودی عرب کی دولت نے صحرا کی گھناؤنی عادات کو پھیلایا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اِن عادات نے اسلام کی تشکیل کافی عرصہ سے کی ہوئی ہے اِس سے پہلے کہ ہم ایسا ہونے دیتے۔ تسلیمہ نسرین، بنگلہ دیش کی جلاوطن مصنفہ اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر، نے مجھے ایک ٹھوس مثال دی جو اُن کے تجربے کا حصہ تھی سعودیوں کے امیر ہونے سے پہلے کے دور کی۔ 'بچپن میں' اُن کا کہنا تھا، 'مجھے بتایا گیا اللہ ہر شے کو جانتا ہے۔ ہر شے سے مراد ہے ہر شے۔ لہذا اللہ کو بنگالی بھی آنا چاہئے، کیا اُس کو نہیں آتی؟' وہ اپنی ماں سے پوچھتیں۔ 'ایسا کیوں ہے کہ میں عربی میں نماز پڑھوں؟جب میں اپنے اللہ سے کلامِ کرنا چاہوں، کیوں میں دوسرے کی زبان سے کروں؟' اُس کی ماں کوئی وجہ بیان نہ کر سکے، بس روایتی باتیں دہرا دے۔ ' وہ قرآن کو اس لئے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تھی کہ حدیث میں لکھا ہے کہ جب تم مرو

گے تو دو فرشتے آئیں گے جو روح سے سوال کریں گے۔
اِن سوالوں کے جوابات عربی میں دینا ہوں گے بصورتِ
دیگر تمہاری قبر بہت تنگ کر دی جائے گی۔ کیوں وہ
فرشتے بنگالی نہیں جانتے ہوں گے؟ یہ تو ایسے ہی ہے
جیسے خدا مسلمانوں کے ذہنوں پر سوار ہو گیا ہے ،
قابض ہو گیا ہے (۸)‘۔ اُس کیلئے بالغ شخص کو مذہبیات
کو چیلنج کرنا چاہئے ، نسرین کو ۱۹۹۴ء میں اپنا ملک
چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ اَب سویڈن کے کسی
نامعلوم مقام میں رہتی ہیں۔
اُس کی ماں کی عربی کیلئے تقدیس سے مسٹر خاکی اور
اُن جیسے لاتعداد مسلمان یاد آتے ہیں۔ میں آج تک اس
بات کو نہیں سمجھ سکی۔۔ سرخم تسلیم کر لینا وہ بھی
زبان کے آگے۔ کیا عیسائی ایک دوسرے کو یونانی زبان
نہ جاننے کی وجہ سے کمتر گردانتے ہیں، یونانی جو نئے
عہدنامہ کی زبان ہے؟ ایک وقت تھا کہ عیسائی عبادات
فقط لاطینی زبان میں ہوا کرتی تھیں، جس سے ویٹیکن
پادریوں کی طاقت برقرار رہی۔ مسلمانوں کے پاس کوئی
ویٹیکن نہیں ہے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ مجھے بھی تسلیمہ
نسرین کی طرح خدا سے رابطے کیلئے ایک ایسی زبان

استعمال کرنے کا کہا گیا جو میرے لئے اُسی طرح تھی جس طرح یونانی ہو سکتی ہے۔ کیوں عربی کی جگہ کوئی اور زبان نہیں لے سکتی؟ یقیناً! اللہ کا پیغمبر کیلئے پہلے لفظ تھا، 'پڑھو!' اور عربی ہی وہ زبان تھی جس میں انہوں نے پڑھا۔ تاہم جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ محمد پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے۔ یہ بات مسلمانوں سے کوئی پوشیدہ نہیں۔ خدا کے احکام پڑھنے کے حوالے سے اُن کی قابلیت معجزوں سے ظاہر ہوئی،اپنی آبائی زبان کی فوقیت سے نہیں۔

مجھے تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ عرب تہذیب کے بادشاہوں نے خدا کو 'آل مائٹی' کے بت کے مقابلے میں کھڑا کیا۔ قرآن کا اصرار ہے کہ 'خدا ہی ہے جو مشرق ومغرب کا مالک ہے، تم جس طرف بھی رخ کرو خدا تمہارے سامنے ہو گا(۹)'۔ کیوں پھر مسلمان دن میں پانچ دفعہ مکہ کی طرف جھکتے ہیں؟ کیا یہ صحرا کی طرف جھپٹنے کی نشانی نہیں ہے؟

مجھے بے شک سطحی کہئے مگر صحرائی قبیلوں کی نشاندہی اُس لباس سے بھی کی جا سکتی ہے جو مسلمان پہنتے ہیں۔ عرب کی سرزمین سے باہر کروڑوں

مسلمان عورتیں، بشمول مغرب، خود کو ڈھانپتی ہیں۔وہ مانتی ہیں کہ یہ مذہبی جھکاؤ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ کلچر کی اطاعت قبول کرنے کی نشانی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کہاں سے ایرانی عورتوں نے بعد از انقلاب کی چادر کا ڈیزائن حاصل کیا۔۔(۱۰) ایسا ڈیزائن جو آپ کے ایک بال کو بھی نظر نہ آنے دے؟ ایک عالم سے جو لبنان میں شیعوں کا رہنما تھا۔ اَب یہ تو بہت 'ہیوی ڈیوٹی امپورٹ' ہو گئی۔ جبکہ قرآن نے پیغمبر کی بیویوں کوبرقعہ پہننے کا کہا تھا، اُس نے کبھی بھی باقی عورتوں کو یہ فعل کرنے کا فرمان جاری نہیں کیا تھا۔ برقعہ عورت کو ریت اور گرمی سے محفوظ رکھتا ہے۔۔ جس کو عین اُسی طرح عرب سرزمین سے پرے افریقہ کے صحاران اور آسٹریلیا کے صحرا میں لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں بند گلے والا سویٹر اور بیس بال کی ٹوپی کو مذہبی ضروریات پورا کرتے ہوئے اپنا سکتی ہوں۔اپنے چہرے کو ڈھانپنا، 'جو مجھ پر کرنا واجب ہے'، عرب صحرا نواؤں کی فتح سے کچھ کم بات نہیں ہو گی، جن کا انداز ایمان کاایک معتبر حصہ بن چکا ہے کہ کس طرح ایک مسلمان عورت کو اپنا آپ لپیٹنا

چاہئے۔ مجھے بتائیے کہ کیا اللہ برقعے کی طرح کام کرتا ہے؟

صحرائی لوگوں کی لباس، زبان اور عبادات میں طوطے کی طرح نقل کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم کائناتی خدا کی پیروی کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کو وہ قصے کہانیاں شاید معلوم نہیں ہو نگے جن کی بنیاد پر اسلام صدیوں تک پھیلایا گیا۔ اِن قصے کہانیوں نے غیر عرب مسلمانوں کو عرب آقاؤں کا گاہک بنا دیا۔۔ ایسے گاہک جن کو اسلام کی 'روشنی' کے نام پر ہر اُس شے کو خریدنا ہے جو اُن کو بیچی جائے۔

میرے لئے اِن سب قصے کہانیوں میں سب سے بیزارکن جاہلیہ ہے، وہ اخلاقی ابتری جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل پائی جاتی تھی۔ میں نے حال ہی میں ٹورونٹو کے اندر اپنے ایک عزیز کے ہاں کتاب کی ورق گردانی کی(١١)۔ یہ کتاب اسلام سے پہلے دور کو جہالت کا زمانہ قرار دیتی ہے۔ یہ طے کر لیا گیا ہے کہ ساتویں صدی کا عرب جزیرہ بدچلنی اور تشدد میں ڈوبا ہوا تھا، جس سے ایک توحیدی مذہب کی ضرورت اجاگر ہوئی۔ میں اِس بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ مگر قرآن

اخلاقی زوال کی بات صرف عرب تاریخ کے حوالے سے کرتا ہے۔ بڑ یہ ہے ، عربوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ بیشتر غیر عرب اقوام جن پر انہوں نے فتح پائی تھی، ذہنی طور پر جاہل اقوام تھیں۔ فاتحین کو وثوق کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ چونکہ قرآن اسلام سے پہلے دور کو جہالت سے تعبیر کرتا ہے ، پیغمبر محمد سے پہلے ساری دانش توہینِ رسالت کے مترادف ہے اور یہ بات عرب کے باہر بھی اتنا ہی سچ ہے جتنا عرب کے اندر۔ یہ وہ داستان ہے جس نے تسلیمہ کی ماں کو ایک مذہبی روبوٹ بنا رکھا تھا ، جو عربی کو احساس گناہ کی تلافی کے طور پر پڑھتی رہتی تھی۔

فرید زکریا کی طرح وی ایس نائیپال نے اِن مضمرات کو بڑے پیمانے پر دیکھا ہے ۔ کچھ سال پہلے ، نائیپال نے ایران، پاکستان، ملائشیا اور انڈونیشیا میں اپنی سفری روئیداد کوتفصیل سے رقم کرنا شروع کیا۔ اُن کی مغربی آمروں سے آزادی کی جدوجہد کو سمجھتے ہوئے ، اُسے 'جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ کوئی نوآبادیاتی نظام اتنا اندر تک گھسا ہوا نہیں جتنا عربوں کی نو آبادیت کے ساتھ آنے والا اُن کا عرب مذہب۔۔۔عرب مذہب کے حوالے سے ایک

مضمون تھاکہ اِس سے پہلے ہر شے غلط ، گمراہ کن اور ملحدانہ تھی؛ اور اِن ماننے والوں کے دل ودماغ پر محمدن زمانے سے قبل کچھ بھی نہ تھا(۱۲)‘۔ میں نے بہت سارے مسلمانوں کو نائیپال کے بارے نسل پرست کا لقب کہتے ہوئے سنا ہے۔ یہ حیران کن ہے کیونکہ اُس کا نقطہ تو مجھے یہ سمجھانے میں مدد دیتا ہے کہ کیوں مدرسہ میں میں نے بہت ساری اسلامی روایات کا عیسائی یا یہودی منبعہ ہونے کے بارے کبھی نہیں سنا تھا۔ یہ ماننا کہ یہ اثرات اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا اسلام سے پہلے عربوں کی کامل حماقت سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور جسے عرب مسلمانوں نے اپنے آباؤ اجداد سے لیا تھا اور یہ کہ وہ انقلابی ہونے کی بجائے دو سروں کے ساتھ دوغلے تھے ۔ مگر یہ سب کچھ کہنے کا مطلب قبیلے سے غداری ہے۔ جو ہم نہیں کر سکتے، کیا ہم کر سکتے ہیں؟

اچھا، ممکن ہے ہم کر سکتے ہوں۔ اِس گھسے پٹے سوال پر غور کیجئے کہ کیا قرآن شروع سے آخر تک خدا کی لکھی ہوئی کتاب ہے؟ اسلام کی پہلی دہائی کے دوران، جوایک نئے مذہب کو سمجھنے کیلئے بہت تھوڑا وقت

تھا ، عربوں نے بین الاقوامی سطح پراللہ کے نام پر چند بڑی فوجی کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ صاف بات ہے کہ قرآن کی تدوین استعماریت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے جلدی میں کی گئی۔ ایک اہم تحقیقی پس منظر دینے کیلئے ایک مضمون 'قرآن کیا ہے؟' دی اٹلانٹک منتھلی میں شائع ہوا جو آذربائیجان سے واپس لوٹنے والے ایک فوجی جنرل کی کہانی بیان کرتا ہے۔ وہ فوجی جنرل پیغمبر محمد کے تیسرے خلیفہ عثمان کو متنبہ کرتا ہے کہ وہاں کے نو مسلموں نے قرآن کیا ہے کے موضوع پر بات بات میں اُلجھنا شروع کر دیا ہے۔ اُس نے خلیفہ کو ہوشیار کیا کہ 'اُن لوگوں پر نظر رکھو' اس سے پہلے کہ اختلاف رائے کے ہاتھوں وہ بے بس ہو جائیں جیسا کہ یہودی اور عیسائی ہو چکے ہیں۔ عثمان نے قرآن کی تدوین کو جلد ختم کرنے کا حکم دیا۔ یاد شدہ الہاموں کو لکھا گیا ہو گا اور بکری کی کھال کے بکھرے پارچوں پر لکھی گئی آیات کو اکٹھا کیا گیا ہو گا تاکہ اِن سب کو ایک قرآن کی صورت میں تقسیم کیا جائے۔ 'نامکمل' یا غیر سرکاری کاپیوں کو تلف کیا گیا۔ سوال یہ ہے: جس مسودے کو پہلے عجلت میں تیار کیا گیاتھا وہ کیسے نئے

مکمل متن سے کم ’مکمل‘ متن تھا؟
یہاں یہ سوچنے کی وجہ موجود ہے کہ قرآن میں ادھوراپن موجود ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی عرب بادشاہت کی ترجیحات ساتھ ساتھ واضح ہو رہی تھیں۔ جس سے مذہب کو نوآبادیت کے طابع کیا جا رہا تھا لیکن اپنے اوپر اس کا اطلاق نہیں تھا۔ ممکن ہے قرآن کی چند آیات کو سیاسی ضرورت اور مقصد کیلئے استعمال کیا گیا ہو؟
کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عرب جنگجو جو اپنے رواجوں سے نئے مذہب کی نسبت بھرپور طریقے سے واقف تھے، نے اپنے رواجوں کو اسلام میں گھسیڑ دیا ہو اور پھر اُس اسلام کی ترویج کی ہو؟ یہ دیکھنا مشکل نہیں ہے کہ کیسے صحرائی عربوں کی ثقافتی پٹاری، جیسا کہ قبائلی دیواریں، ہی اصل اسلام کی صورت اختیار کر گئی ہوں۔ اور نہ یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ کیسے اصل اسلام ایک تابعدار اسلام بن گیا۔۔ خدا کا تابعدار کم اور اُس کا جشن منانے والوں کا زیادہ۔
البتہ قبائلیت کا شکنجہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ذرا نرم تھا اور اختراع کی قدرت نے نشوونما پائی۔ ہم اِس بات کا کیسے حساب لگائیں گے کہ سنہری دور کی

تجارت، مباحث اور ثقافت کیسے باہم بوئی گئیں؟ اس کی ایک پیداوار ایک کھلے دل کے سائنسدان اور فلسفی الکندی تھے ، جنہوں نے ’پہلے سے آباد لوگوں اور نوآورد لوگوں‘ کیلئے ’بہت زیادہ ممنونیت‘ کا اظہار کیا کہ ’اگر یہ ایک ساتھ نہ رہتے تو ہمارے لئے ناممکن ہوتا ، ہماری تمام تر دلجمعی کے باوجود، ہماری پوری زندگیوں کے دوران کہ ہم سچائی کے اصولوں کو سمجھ سکتے۔۔۔ (۱۳)‘؟ قصہ مختصراً، کیا درست ٹھہرا؟ میں سوچتی ہوں کہ کیا یہ مستقبل کا تصور تھا؟

فوجی فتوحات حاصل کرتے چلے جانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ عربوں نے محسوس کیا کہ اَب اُن کا مستقبل محفوظ اور قابلِ فخر ہے۔ جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب تھا کہ اسلام کو سخت گیر بنانے یا سر پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی بہتر تھا کہ اسلام کو لچکدار حیثیت سے پیش کیا جائے تاکہ تیزی سے پھیلتی ہوئی سلطنت کا پیغام بھی پھیلے اور اُس کا نظم و نسق بھی چلتا رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ مذہب اور سیاست کو جدا نہیں کر سکتے تھے مگر آپ مطلق العنانیت اور عزت کو الگ الگ رکھ سکتے تھے۔ یہ احساس کہ مطلق العنانیت

سے عزت حاصل نہیں کی جا سکتی، کی وجہ ہی تھی کہ حریص آمروں نے اُس وقت کے بہترین دماغوں کو اکٹھا کیا۔ جو یہودیوں اور عیسائیوں کے تھے ، اور بلاشبہ غیر عرب مسلمانوں کے بھی تھے۔ یہ غیر عرب تھے جنھوں نے سنہری دور تک اور اُس کے دوران اسلامی قوانین تشکیل دئیے۔ قریب ایک سو پینتیس مکتبہ ہائے فکر سامنے آئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب مسلمانوں نے اپنے قبائلی ماضی اور کثیر الثقافتی مستقبل میں ایک توازن ڈھونڈا۔

اس سارے معاملے میں ایک دوسرا سبق بھی ظاہر ہوا۔ جب عرب مسلمانوں سے سلطنت چھن گئی، انہوں نے ماضی اور مستقبل، قبائلیت اور رواداری کے درمیان توازن قائم کرنے کی پاداش میں حرجانہ بھی بھرا۔ وہ غیر عربوں کے ساتھ لڑائیوں میں نیچے جاتے گئے ، بربریوں سے لے کر منگولوں تک، صلیبی جنگیں لڑنے والوں سے لے کر سلطنتِ عثمانیہ کے ترکوں تک۔ یہ شکستیں جہاں دیدہ عرب جنگجوؤں کی ہزیمت کا باعث بنیں۔ اِس سے بھی آگے ، اگرچہ اِن کے ذہنوں نے ہار قبول کر لی تھی ، کہا جاتا ہے کہ منگولوں نے تیرہویں صدی

میں لاکھوں نسخے ٹگری دریا میں بہا دئیے تھے۔ جس کے پانی، ایک رقیق القلب مسلمان کا کہنا ہے ، ’کئی دنوں تک سیاہی اور خون سے سیاہ رہے (۱۴)‘۔ جہاں تک صلیبی جنگوں والوں کا تعلق ہے ، انہوں نے آسمان کے نیچے بھاری بھرکم الاؤ جلائے جن کو پادری ایک وقت میں اسی ہزار جلدوں سے آگ لگایا کرتے تھے۔ اَب یہاں پر یہ استعارہ پوشیدہ ہے کہ عربوں نے اپنا مستقبل کس طرح دیکھنا شروع کیا ، ڈوبا ہوا ، راکھ شدہ یا غضبناک۔ اُن کو مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔

اَب ایک ہی غیر متنازعہ جیت تھی جس پر صحرائی عرب دعویٰ کر سکتے تھے ، وہ اسلام کے معرضِ وجود میں آنے والی گھڑی کے بارے تھی، وہ یہ کہ قرآن عرب کے دل سے نکلا، عربی زبان میں، جو اِس بات کا اظہار ہے کہ اللہ کا ’آخری‘ کلام ہمیشہ عربوں کی نمائندگی کرے گا۔ کوئی دوسرا شخص جغرافیائی یا روحانی طور پر اتنا قریب نہیں ہو سکتا۔ لہذٰا اِس نظر فریب وارفتگی کے بعد تقدیس بھی یہاں پر ختم ہوتی ہے اور حتکہ نجات بھی ۔ مگر یہ مرہم پٹی بم ثابت ہوئی۔ ماضی اور مستقبل کا یہ مخدوش توازن آہستہ آہستہ ماضی پرستی کے دفاع پر

منتج ہوتا چلا گیا۔۔ اور خاص طور پر بنیادپڑنے کی گھڑی کی صورت اختیار کرتا گیا۔ میں اِس کو 'فاؤنڈامینٹلزم' کا نام دیتی ہوں۔

'فاؤنڈامینٹلزم' نے کئی المیوں کو جنم دیا۔ مذہبی اجارہ داروں، اسلام تک رسائی پانے والوں، نے اسلام کے اصل چوکیداروں کی حیثیت اختیار کر لی۔ اجتہاد، آزاد خیالی، کے دروازوں کو بارہویں صدی میں بند کرنے کے ساتھ مفتیان کرام نے سچائی کا گشت کرانے کی غرض سے پہلے ہی طاقت حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ جوں جوں سچ تنگ ہوتا چلا گیا، اُن کا اختیار پھولتا چلا گیا، اور اُن کو دانشور کی بجائے سپاہی بنانے لگا۔ ہر نوعیت کی اختراعات مشکوک ہو گئیں اور آخرکار پابندی کا شکار ہو گئیں۔ 'بنیاد پڑنے کی گھڑی ' کے ورثاء ہونے کی حیثیت سے علمائے کرام نے 'اصل 'کامل' متن کی طرف رجوع کیا ، یعنی قرآن اور حدیث، اِس بات کا ثبوت ڈھونڈنے کیلئے کہ اِن میں باقی علوم کی تلاش سے چھٹکارے کی کیا صورت ہے۔ پیغمبر کی احادیث میں سے ایک کا انہوں نے بہت چرچا کیا۔ 'نئی باتوں سے ہوشیار رہو، ہر نئی شے ایک اختراع ہے اور ہر اختراع کا انجام

غلطی ہے (۱۵)‘۔ مستقبل تعمیر کرنے کا کیا عظیم راستہ تھا، آپ ایسا نہیں سوچتے؟

اختراعات کی تھوتھنی صرف عرب سرزمین تک محدود رہنی چاہئے ، اگر اِن کو کسی صورت متعارف کروانا بھی ہو۔ اِس کی بجائے ، صحرا سے پرے مسلمانوں کیلئے اختراع مخالف قانون ہونا چاہئے۔ ۱۵۷۹ء میں ، مثال کے طور پر استنبول میں ایک رصدگاہ قائم ہوئی۔ ۱۵۸۰ء میں ، علمائے کرام نے اُس کو گرا دیا۔ اپنی تمام تر شہرت کے باوجود، مسلمان دانشور مراد ہوف مان لکھتے ہیں، ’حتکہ قاہرہ کی یونیورسٹی سائنس کے میدان میں باصلاحیت نہ تھی‘۔ صرف چند صدیوں پہلے کی پستی دیکھئے جب اسلام نے پوری دنیا کو فلکیات، ریاضیات، طب اور دیگر علوم سے آشنا کیا۔ بداعمالی دیکھئے ، اُسی زمانے کے واقعات میں ایک شخص کو ۱۷۲۸ء میں استنبول اور مسلم دنیا کا پہلا پرنٹنگ پریس لگانے کی اجازت دی گئی۔ ’یہ مسلمانوں کیلئے ضروری ہے ، مغرب سائنس میں پہلے ہی آگے ہے ، ہمیں اِس روشنی سے محروم نہیں ہونا چاہئے ‘۔ ابراہیم میوتی فیریکا نے پریس کا لائسنس لینے کی غرض سے اپنی درخواست میں لکھا

تھا۔ ۱۷۴۵ء میں اُسے اپنی دکان بند کرنا پڑی۔ ملاؤں نے چھاپہ خانہ پر پابندی لگا دی۔
صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیت جامد ہو گئی۔ مثال کے طور پر، بیسویں صدی کے آغاز میں ایرانی شہزادی نے حقوق نسواں کی تحریک (کسی حد تک قومی تحریک)کا بھر پور آغاز کیا جو اُس کی ریاست کے آئین پر بھی حاوی ہو گئی(۱۶)۔ اُسے اماموں کی حمایت بھی مل گئی۔ جی ہاں، آدمیوں کی۔ ایران کے شہر اصفہان، ہندوستان کے شہر آگرہ، مراکش کے شہر فیز، یوگوسلاویہ کے شہر سراجیوو۔۔ غرض ہر بڑے شہرجس کی بھی عالمی حیثیت تھی، میں مذہب زدگی چھوٹی موٹی بغاوت کے مترادف تھی۔ تب اسلام میں مختلف فرقوں کے بھی کوئی خاص معنی نہ رہے تھے۔ کیرن آرم سٹرونگ وضاحت کرتی ہیں، ’شیعوں کی ایک شاخ اسماعیلیوں کو سچائی کی تلاش تھی جہاں سے بھی مل سکے ، صوفیوں کی حضرت عیسیٰ کیلئے عظیم رغبت تھی، اور مجذوبوں کیلئے جو ارسطو اور افلاطون کے مطالعے سے بہت متاثر تھے اور جو مذہب کی ایک آفاقی صورت ڈھونڈ رہے تھے (۱۷)‘۔ مگر یہ سب لوگ اور

مقامات بیرونی دائرے میں تھے۔ جو تھوڑے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے اسلام کی عمومی تعلیمات کو ہلا نہ سکے۔ مگر عربوں نے ہلایا۔

اِس کی ایک وضاحت ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں، صحرا کے ملاؤں نے سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ مذہبی اصلاح کے ضمن میں تین بنیادی نقاط کو ختم کرنے کیلئے زورازوری کی: افریقہ میں غلاموں کی تجارت میں مسلمانوں کی حاکمیت کو ختم کرنے ،عورت کو پردے کے غلاف سے آزاد کرنے اور کافروں کے پیغمبر کی سرزمین پر رہنے کے ضمن میں۔ مکہ کے مفتی اعظم نے استنبول سے آنے والی افواہوں کی بنیاد پر فوری فتویٰ صادر کیا۔ ’غلاموں کی تجارت پر پابندی مقدس شریعت کے خلاف ہے۔۔اُس نے زہر اگلا۔ ’مزید براں۔۔۔عورتوں کو پردے کے بغیر چلنے پھرنے کی اجازت دینا، اُن کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار دینا یا پھر اس طرح کی باتیں مقدس قانون کے خلاف ہیں۔۔ ایسی تجاویز سے ترک کافر بن جائیں گے اور پھر یہ واجب ہو جائے گا کہ اُن کی اولادوں کو غلام بنا لیا جائے (۱۸)‘ ۔ اگرچہ اصلاح پسندوں یعنی ترکوں نے عرب مبلغین کو مطمئن کر دیا۔ استنبول کے مرکزی

مفتی نے اُنہیں یقین دہانی کرائی کہ 'چند گستاخ لوگ جنہیں دنیا کی اشیاء کی حرص ہے ، نے اِن جھوٹوں کو گھڑا تھااور اپنی مکروہ طور پر خودنمائی کی تھی'اور اس طرح 'سرکش سلطنتِ عثمانیہ غلطی کا ارتکاب کرنے لگی تھی مگر خدا نے ہمیں محفوظ رکھ لیا(۱۹)۔ میں 'محفوظ رکھنے' پر زور دیتی ہوں کیونکہ اسلام میں غلطی کا ارتکاب تو ویسی ہی چیز ہے جو 'فانڈامینٹلزم' کا حصہ بھی ہے۔ جیسا کہ مسلمان یورپیوں سے فوجی اور مادی اعزاز میں مزید پیچھے چلے گئے ہیں تو پھر 'فاؤنڈامینٹلزم' ہی پیچھے باقی رہ جاتا ہے۔

اور 'بنیاد ڈالنے کی گھڑی' کے خبط کا یہی شاہانہ المیہ ہے۔ مذہبی 'تجدید' پر زور پیچھے دیکھنے کیلئے ہے۔ میرا مطلب ہے مستقل۔۔بہت پیچھے چودہویں صدی میں جب اسلامی سلطنت غیر عرب ہاتھوں میں چلی گئی۔ اصلاح پسندوں میں پہلی معروف ہستی، دمشق کے دانشور احمد ابن تمیہ نے منگول حملہ آوروں کو لادین قرار دیا۔ اگرچہ انہوں نے اسلام قبول کیا ہوا تھا مگر چونکہ منگولوں نے شریعہ کو اپنے قوانین نافذ کر کے بے دخل کر دیا تھا۔ جب ابن تمیہ نے منگولوں کی بات سنی ، پیغمبر

کے زمانہ میں سیاست اور مذہب میں کوئی لکیر نہ تھی، جس کا مطلب تھا کہ بات منگولوں کی اختراع ہے۔ ناقابلِ قبول۔ ابن تمیہ نے اپنی چابک کو مسلمان فلسفے، صوفی ازم اور شیعہ اسلام تک گھمایا۔ ہر کوئی بعدازمحمد کی اختراع کو اپنائے ہوئے تھا۔ 'ابن تمیہ کا اچانک ہی انتقال ہو گیا'۔ آپ کے گرداگرد کوئی تاریخ دان شاید یہی کہے۔ وہ بھی اُس ا بتدائی نقش کی صورت مرے، اپنے پیچھے متاثر کرنے کی وراثت چھوڑتے ہوئے۔۔ یا مستقبل کے اصلاح پسندوں کیلئے پیغام چھوڑتے ہوئے'۔ اِن میں سے کیا زیادہ اہم ہے۔

میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتی ہوں۔ ۱۹۵۰ء اور ۶۰ء کی دہائیوں میں ایک مصری مرتد سید قطب ابن تمیہ سے براہِ راست متاثر ہوا۔ جنرل ناصر نے قطب کو پھانسی پر لٹکا دیا مگر کئی برس جیل میں بند رکھنے کے بعد۔ قطب کی قیدخانے میں لکھی تحریروں نے نئی اسلامی تحریک میں روح پھونک دی، خاص طور پر مسلم اخوان کی تحریک میں ۔ قرآن اور ریوالور گینگ جس کا میں نے پیچھے ذکر کیا۔ حال ہی میں مسلم اخوان نے منصوبہ سازوں کی تنظیم جنم دی جس سے محمد عطا

کا بھی تعلق تھا۔
اور اگر یہ ابن تمیہ کی عصری سوچ کا اثبات نہ کرتی ہو تو یہ دیکھئے: سید قطب کے جلاوطن بھائی نے اسامہ بن لادن کو سعودی عرب میں پڑھایا۔ اسامہ نے کیا سیکھا؟ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ، جو غیر ملکی تسلط کے دوران ابن تمیہ نے اجاگر کیں تھیں اور اُس کے ساتھ قبر میں چلی گئیں جن کو منگولوں سے نفرت کرنے والوں نے بہت سراہا تھا۔ ابن تمیہ کے سات سو سالوں بعد ہمارے پاس بن لادن کی پٹی ہے جو پیغمبر کی زمین پر غیرملکی حملہ آوروں کے خلاف ہے۔
آج حملہ آور امریکی ہیں۔ پینٹاگون کے ۲۰۰۳ء کے اعلان کے باوجود کہ امریکی افواج کی اکثریت سعودی عرب سے قطر چلی جائے گی، مگر ابن تمیہ کے اصولوں کے مطابق ایک سرحد سے دوسری سرحد کے اندر چلے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امریکی فوجیوں نے اپنی نوآبادیت کو ختم کر دیا ہے۔۔ قطر پیغمبر کے جزیرے کا ہمیشہ حصہ رہے گا۔ صلیبیوں کو اپنے اوپر چڑھانے کی ذمہ داری ہمیشہ ریاض پر لاگو ہو گی۔ اور ایک دوسری چیز: بن لادن نے امریکیوں کو صلیبی ثابت کر کے

جذباتی انٹینا کھڑا کر دیا ہے لیکن اُس نے دو حالتیں بیان نہیں کی ہیں کہ 'صلیبی' سعودی عرب میں کسی بھی جگہ پر عیسائیوں کی عبادت پر پابندی کا لحاظ رکھتے ہیں۔۱۹۹۰ء میں جب صدر جارج بش نے سعودی عرب میں امریکی افواج کے اڈے کا دورہ کیا تو انہوں نے ملک کے اندر 'تھینکس گوننگ'کی تقریب نہ منانے پر اتفاق کیا۔ صدر نے بین الاقوامی پانی کے اوپر یو ایس ایس ناسا کے اسٹیشن پر دعا کی۔

یہ کہ سعودیوں نے بڑے شیطان کے ساتھ الحاق بن لادن کی توثیق کی خاطر کیا ہے کہ ہاؤس آف سعود اور وائٹ ہاؤس میں پاگندگی کس انتہا کی ہے۔ جبکہ امریکہ کو نیچا دکھانا لازم ہے، لہذٰا اُس کے میزبان سعودیوں کو بھی۔ بن لادن کا مشن واضح ہے۔ مسلمانوں کو اِن دونوں مقامات سے بچانے کیلئے، وہ اسلام کی 'بنیاد پڑنے والی گھڑی' کی اطاعت گزاری کر رہا ہے۔

کیایہ محض امر اتفاقی ہے کہ بن لادن غاروں میں اتنا وقت صرف کر رہا ہے، جس طرح پیغمبر محمداپنی پیغمبری کی حالت میں وقت گزارتے تھے؟ پیغمبر اُن آسائشوں کو اختیار کر سکتے تھے جو اُن کی امیر بیوی

اپنے ساتھ لائیں تھیں مگر انہوں نے سادہ زندگی کو ترجیح دی۔ اسی طرح بن لادن بیوقوفی کی حد تک دولت کے باوجود ایک جبہ لپیٹے رہتا ہے۔ پیغمبر مکہ کے ایک بڑے قبیلہ سے سامراج مخالف پیغام پھیلانے کی غرض سے منحرف ہوئے تھے ۔ بن لادن نے خود کو ایک بااثر خاندان سے الگ کیا۔ پیغمبر نے پورے اقتصادی نظام کی اخلاقیات کو اپنا نقطہ نظر دیتے ہوئے ہفت پہلو شہر مکہ میں للکارا تھا ۔ مکہ جو تجارت کی شاہراہوں کا شہر تھا جہاں تاجر اپنی مرضی کے بتوں کی پوجا کر سکتے تھے۔ نیو یارک کا شہر بن لادن کیلئے اسلام سے قبل مکہ کی طرح ہے۔ اُس کے مطابق، ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرنے والے لادینی مادہ پرستی کی پریڈ میں شامل متحاربین تھے، ایسا نظریہ جو چٹکلے چھوڑنے کی عبادت کرتا ہو اور اپنی ذات کا اسیر ہو۔ ایسا نظریہ جو اُن کو بت پرستی کے احساسِ گناہ اور ایک خدا کے شرک میں مبتلا کر دے۔ اور یہ پیسے کو کنٹرول کرنے والے یہودیوں پر تو دگنا لاگو ہوتا ہے۔

اِس کے متوازی نظریے تو بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ پیغمبر محمد کا اخلاقیاتی انقلاب ٹیکنالوجی کے انقلاب کے

ساتھ ساتھ ہی آیا جس میں نت نئے طور طریقے اونٹوں
کی زین پر سوار ہو کر تیز تر ہوگئے۔ مزید تجارت، زیادہ
حرص اور گہری سماجی عدم مساوات نے جنم لیا۔ کل
اونٹوں کی کاٹھی باندھی، آج معاملہ آن لائن ہو گیا۔
پیغمبر نے اپنی فوج کو کھلانے کی خاطر دشمنوں کے
کارواں پر ہلے بولے۔ بن لادن کی جنگی پٹاری نے امریکہ
کے گاہکوں کو فائدہ پہنچایاجو تیل اور افیون کو نہ ختم
ہونے والی حد کے ساتھ سونگھ رہے تھے۔
پیغمبر نے ایسی روایتی تراکیب استعمال کر کے چکمہ
دیتے ہوئے فوجی فتوحات حاصل کیں جیسے اپنے گرداگرد
خندق کھودنا ، اپنے بے خبر مخالفین کو چپکے سے جا
پکڑنااور جنگ کیلئے تیار اعلیٰ نسل گھوڑوں کو اپاہج
بنانا۔ بن لادن کے ہراول دستے نے سپر طاقت پر حملے
کیلئے جہازوں کو کاٹا۔ پیغمبر محمد نے اپنی قوم کو
سیاسی عمل میں مصروف قرار دیا جس کی سرحدبندی
فقط مذہب کی لکیر سے ہونا طے پائی تھی۔ بن لادن نے
اپنے کام کرنے والوں کا کثیرالقوام گروہ تشکیل دیا جو
غیر ملکی نقشوں سے آگے نکل جاتا ہے۔محمد نے مکہ کے
مظلوم عوام کی ہمدردی حاصل کی اس سے پہلے کہ وہاں

کی اشرافیہ اُن کے کنٹرول کو محسوس کرے اور مسلمان بن جائے۔یقینی طور پر، بن لادن کیلئے یہ کام طویل تر ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں، قریب پانچ لاکھ پاکستانیوں نے جدت پسندی کی حمایت میں ریلی نکالی۔تاہم ہم بن لادن کیلئے چاہت کو کم نہیں دکھانا چاہیں گے، جب اُسی مہینے گیلپ پول سروے میں بتایا گیا کہ بیاسی فیصد شہری پاکستانی آبادی بن لادن کو آزادی کا سپاہی مانتی ہے(۲۰)۔

بن لادن کی حکمتِ عملی مسلمانوں کو بھلی لگ سکتی ہے جو اپنے پُرتعیش اور عیاش حکمرانوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اُس کا پرانے واقعہ ’بنیاد کی گھڑی‘‘ کو بار باردہرانے سے مسلمانوں کو تلافی کی بھوک میں تسکین ملتی ہوگی۔لیکن اگر صحیح طور پر دیکھا جائے تو بن لادن کا انقلاب انقلاب نہیں ہے۔ اُس کا اسلام کچلنے کے ایک نہ ختم ہونے والے چکر میں لاتا ہے جس میں مسلمان پہلے ہی گھرے ہوئے ہیں، ماسوائے چند استشنیٰ کے، عرب فتوحات سے اب تک۔ اُس کا قبائلی مذہب ہے جو اتحاد کو یکسانیت کے متوازی کرتا ہے جو فرد اور آزاد خیالی کے اوپر مفسرین کی ہتھ ٹیکی بازی کو موقع فراہم

کرتا ہے ۔ بن لادن بادشاہت مخالف ایجنڈا کے علاوہ کچھ پیش نہیں کرتا۔ وہ مزید صحرائی آمریت کا تصور پیش کرتا ہے۔

سوچئیے ، کہاں بن لادن کے مشن کی جڑیں ہیں: سعودی عرب۔ وہ صرف اپنے حکمرانوں سے مخاطب ہے ، ملک سے نہیں۔اس بات کی بہت اہمیت ہے کیونکہ سعودی عرب کا وجود ایک معاہدے کے تحت مذہب سے سیاسی مفادات کے مابین جھولتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں ایک قبیلے کے سربراہ محمد ابن سعود کا ایک مذہبی 'انقلابی' محمد بن عبدالوہاب سے ضرورت کی شادی کی مثال ٹکراؤ ہو گیا۔ عرب جزیرے کے ٹکڑوں سے بادشاہت ڈھالنے کی میری کوششوں کی مدد کرو، اُس نے الوہاب سے کہا اور میں تمہیں نئی سلطنت کا مذہبی رہنما بنا دوں گا۔ اشرافیہ کی جانب سے بار بار نکال باہر ہونے کے عادی الوہاب نے دستخط کر دئیے۔ اُس کا 'انقلابی' اسلام ابن تمیہ سے متاثر شدہ تھا ، جس سے بن لادن آگے متاثر ہو گیا۔ یہ اسپارٹا کی خوبیوں والا مذہب ہے جس کی دانشورانہ صلاحیتوں کی کھال اتری ہوئی ہے اور مسلسل جہاد میں مصروفِ عمل ہے ۔اِسی جہادی توجیہہ

نے الوہاب کے سیاسی رفیق ، ابن سعود کے قبیلہ کودہشت گردوں پر قابو پانے کے جہاد کی اجازت اگلے دو سو برسوں تک دے رکھی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں، سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکڑوں سے سابقہ سعودی ریاست ابھری۔ اِس کا کامل غیر جمہوری معاہدہ وہابی ملاؤں کے ساتھ اپنی جگہ قائم رہا۔ لہذاٰ اِس کی جہاد کی توفیق بھی برقرار رہی۔ اِن دونوں باتوں سے سعودی عرب نے مسلمانوں کو غلام بنانے کے فن میں کمال حاصل کیا۔ میں آپ کوحج کی زیارت کے موقع کی تصویریں دکھاناچاہتی ہوں جو ہرسال شائع ہوتی ہیں۔دنیا بھر کے انسانوں کا اکٹھ اپنے عروج پر ہوتا ہے ، یہ درست ہے نا؟ اَب اس تصویر میں اِس حقیقت کو شامل کیجئے کہ سعودی بادشاہ دو مقدس مقامات کے وارث کے طور پر تصویر میں جڑے ہوئے ہیں۔ وہ داد رسی کرنے والے کی حیثیت میں ہر رنگ، نسل اور جنس کی نمائندگی کرنے کی کوشش کرتے نظر آئیں گے ۔ تاہم اصل تصویر اتنی خوش کن نہیں ہے ۔ ریاض شیعوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے جو اسلام کا دوسرا بڑا فرقہ ہے ، کا اندازہ اِس ایک حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے : سعودیوں کی

سرکاری تعلیمات کے مطابق، شیعہ یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ظاہرا تو اِس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ یمنی یہودیوں نے اسلام کو تقسیم کرنے اور اُلجھے اذہان کے مسلمانوں کیلئے تلمودی طرز کے خیالات بوئے۔ یہ فریب زدہ لوگ ہوتے ہوتے شیعہ بن گئے۔

یہودیت کی ایک کڑی ہونے کے ناطے، شیعوں کا مرتبہ 'ذِمی' لوگوں کا ہے، کیا وہ ایسے ہیں؟ حقیقت میں، سعودی عرب کے اندر اُن کا مقام ایسا ہے۔ حال ہی میں ایک شیعہ اسماعیلی مسلمان نے امریکی کانگریس کو بتایا کہ اُس کے ساتھ کیا بیتی جب نجران میں اُس کے گھر کو سعودیوں نے ہتھیا لیا۔ 'صرف نجرانی ہی مذہبی غلبے کا شکار نہیں ہیں'۔ علی الیامی نے بتایا، 'بلکہ اُن کی زندگی کے تمام راستے بُری طرح مسدود کر دئیے گئے ہیں۔ وہابی گورنروں، امیروں اور ججوں نے اُن کو اُن کی بہت ساری زرخیز زمینوں سے بے دخل کرر کھا ہے۔اس کے علاوہ وہابی اسماعیلیوں کے فارموں اور مویشیوں کی پیداوار کا آدھا حصہ زبردستی لے جاتے ہیں(۲۱)۔۔۔'

نوٹ کیجئے اِس اندھیر نگری کو جو موجودہ صورتحال میں ہے اور محمد کے عہد میں یہودی کسانوں کے اوپر

گزری۔ آپ کا یہ سوچنا 'جائز' ہے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ شیعہ مسلمان اصل میں یہودی ہیں(۲۲)۔
شیعہ سعودی عدالت میں جج نہیں بن سکتے۔ وہابیوں کے علاوہ کوئی بھی جج نہیں بن سکتا۔ آئیے دو اور دو چار دیکھتے ہیں: سعودی عرب میں شیعہ ججوں کے پیچھے اُن لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں جو پہلے ہی مانتے ہیں کہ وہ ملحد ہیں۔یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء کے اسلامک ہیومن رائٹس چارٹرمیں بھی اِس بات کا ذکر نہیں جس پر تمام مسلمان ممالک نے دستخط کئے ہیں۔ اس وستاویز میں کہا گیا ہے کہ ہر کوئی باانصاف سماعت کا حقدار ہے۔ ہر کوئی، میں سوچتی ہوں، سوائے غیرمسلمانوں کے۔ جیسا کہ شیعہ یہودی ہیں۔۔۔ اوئے ہوئے، ذہن چکرا جاتا ہے۔
اسی طرح عورتیں عدالت میں حاضر نہیں ہو سکتیں حتکہ وہ قتل میں ملوث ہی کیوں نہ ہوں۔ 'اُن کے پاس کار رکھنے کا قانونی حق ہے (۲۳)'، امریکہ میں سعودی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر علی الاحمد نے بتایا۔ اور ہنوز اُن کو گاڑی چلانے کی اجازت نہیں ہے۔ دونوں باتیں اِس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ عورتیں سعودی عرب میں

ستاون فیصد آبادی پر مشتمل ہونے کے باوجود عقل میں کمتر سمجھی جاتی ہیں۔ 'اُن کو اپنے باپوں سے شوہروں یا بیٹوں کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے'، الاحمد نے وضاحت کی۔ متواٰ، مذہبی پولیس اِن کمتر بالغوں کو پابندیوں پر قانون کے مطابق کاربند بنانے کیلئے مستقل پیچھے پڑی رہتی ہے۔ جس میں ویلنٹائن ڈے کے موقع پر سرخ لباس نہ پہننا بھی شامل ہے۔ ایسا جرم جس پر گرفتاری کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔
مارچ ۲۰۰۲ء میں عملدرآمد کا یہ نتیجہ نکلا کہ جوان عورت اسکول کی آتشزدگی کے دوران تب تک اسکول سے نہیں نکل سکتی جب تک وہ پوری لمبائی کا آبایہ اپنے اوپر نہ گرا لے۔ سعودی عرب کی اپنی خبروں کے مطابق پندرہ طالبات ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئیں جب مذہبی پولیس نے اُنہیں واپس اسکول کی جلتی عمارت کے اندر دھکیل دیا کہ وہ اپنے ابایہ پہن کر نکلیں، وہ ابایہ جسموں کے تھیلے بن کر باہر نکلے۔ میری ایک سعودی واقف کار نے اِس چشم دید واقعہ پر شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مقامی اخباروں نے یہ کہانی فقط سعودی عرب کے وزیر تعلیم کومصیبت میں ڈالنے کیلئے شائع کی

ہو گی۔ کیسے ریاست کے ماتحت چلنے والا پریس 'مصیبت میں ڈال سکتا ہے'؟ حقیقت یہ ہے کہ اِس ہولناک واقعہ نے سعودی صحافیوں کو بھی موجود صورتحال کو چیلنج کرنے پر مجبور کر دیا۔ اُن کے پاس ایسا کرنے کی ہر وجہ موجود تھی: دنیا کے کسی ملک میں قانون کے تحت عورت کو چہرہ پر نقاب ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں یہ گھمنڈ نہیں ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو پیغمبر محمد کی بیویوں کا اوتار قرار دے ۔ قرآن میں صرف پیغمبر کی بیویوں کو نقاب پہننے کا حکم تھا۔

کیا آپ سعودی عرب کے تعفن زدہ منجمد قبائلی معاشرے کے بارے مزید کچھ جاننا چاہتے ہیں؟ جہاں طاقت کا سرچشمہ سینئر شہزادوں کی ٹولی ہے ۔ وہی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں اور ملاؤں کے مافیا کو امداد مہیا کرتے ہیں جن کی وفاداری اُنہیں ہر صورت برقرار رکھنا ہوتی ہے تاکہ کسی قسم کی بغاوت سے نپٹا جا سکے۔ لہذٰا کیا ہمیں حیران ہونے کی ضرورت ہے کہ وہاں مغربی خبروں کی ویب سائٹس عام طور پر بلاک رہتی ہیں، مگر وہ ویب سائٹس جو نفرت، تشدد اور دہشت پھیلاتی ہیں وہ پیغمبر

کی زمین سے قابلِ رسائی ہیں؟کیا اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت ہے کہ جب تک میڈیا نے ناقابلِ نظر انداز ہونے والے اداروں کی نشاندہی نہ کی، ریاض نے سعودی سرزمین پر اسلامی جہادی اداروں کے مالی معاملات کی پڑتال کرنا شروع نہ کی؟ کیا ہمیں یہ بات اُن آثار کی طرح پریشان کرتی ہے جن تاریخی عمارتوں کو سعودیوں نے گرا دیا، مثال کے طور پر اولین مسلمانوں کی تعمیر شدہ مساجد کہ کہیں لوگ اِن کی بتوں کے طور پر پوجا شروع نہ کر دیں۔۔ جیسا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دو عمارتیں؟ اور کیا اسی لئے علماء کے تحفظ کا عام لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ خیال کیا جاتا ہے، کیا اسی لئے سعودی عرب نے کبھی بھی اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کو قبول نہیں کیا؟ ۱۹۴۸ء میں ، صرف مشرقی بلاک اور اقلیت کی حکومت والے جنوبی افریقہ نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ تب سے اَب تک کمیونزم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جنوبی افریقہ نے اصلاحات نافذ کر دیں۔ اِس اثناء میں، سعودی عرب اکیلا ہی بے کیف اور مطلق العنان اسلام کی منادی کے ساتھ کرہ ارض پر رہ گیا ہے۔

اِس کے نتائج پاکستان اور سوڈان میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں جہاں بہت سارے مدرسے صرف قرآن کے متن کو پڑھاتے ہیں۔ آپ کو سوڈان میں ہونے والے قتل عام، غیر عرب مسلمانوں اور اِن کے ساتھ ساتھ غیر مسلمانوں کو غلام بنانے کا پہلے ہی علم ہے۔ اِس بدو انداز کی قبیلہ پرستی کو پاکستان میں دیکھا جائے تو آپ اِس بات کو قطعاً نظرانداز نہیں کر سکتے ،کچھ غیر مسلمانوں کو اس لئے مار دیا گیا کہ انہوں نے اسلام کے روایتی فجائیہ کلمات، اسلام علیکم ، بولنے کی جرات کی۔۔ جس کے معنی' آپ پر رحمت ہو(۲۴)'ہے۔ یوں ایک دوسری امن کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا۔

مزید مشرق کی طرف بڑھیں تو صحرائی اسلام نے افغانستان کوسعودی عرب کے مذہبی انداز میں مسخ کر رکھا ہے۔ طالبان کے زیر سایہ، نئے نام اسلامک ایمیرات آف افغانستان نے سعودی طرز کی مذہبی پولیس کا نمونہ پیش کیا تھا ، عورتوں اور شیعوں کو دبانے کا وہی سعودی اندازاور حتکہ سعودی طرز پر بت پرستی کو ختم کرنے کیلئے تاریخی مقامات کو اُڑانے کا انداز۔ بنگلہ دیش میں بھی عیسائیوں، ہندوؤں اور بدھ مت کے

مجسموں کو اُڑانے کیلئے نشاندہی کی گئی۔ بنگلہ دیش کاغذوں میں ہی جمہوری ملک ہے۔ آئیے ، بامیان وادی کے بدھوں سے ہی کچھ سیکھیں، خاموشی کے ساتھ بیٹھ جائیں، امن کیلئے دعا گو ہوں، صحرائی اسلام کی مدد سے لڑنے کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔

وہابی دنیا کادور دورہ شمالی امریکہ تک بھی پہنچ چکا ہے۔ کیا آپ کو برٹش کولمبیا میں رچمنڈ کی مسجد میں اُس بیکار لائبریری تک کی رسائی کیلئے میری جنگ یاد ہے؟ لو لیجئے ، طالبات نے امریکہ کے ایک بڑے اسلامی اسکول میں ویسا ہی مذہبی انداز اپنایا ہوا ہے ، اِس اسکول کو پیسہ سعودی دیتے ہیں۔ جیسا کہ یہ پڑھایا جاتاکہ یہودیوں کو دوست نہ بناؤ،اُس اسکول میں ثبوت کے ساتھ ثابت ہوا کہ صرف میں اکیلی نہ تھی۔ یہاں پر عربی زبان کی درسی کتاب کا ایک پیرا تھا ، یہ کتاب سعودیوں نے امریکہ کے ایک اسکول کے مسلمان بچوں کوفراہم کی تھی، ’’اسلام کو نہ ماننے والے ، بت پرست ور اُن جیسے دوسروں کو قابلِ نفرت اور قابلِ مکروہ جانا جائے۔۔۔ ہمیں اُن سے الگ رہنا چاہئے اور اپنے اور اُن کے درمیان حدبندی قائم کرنی چاہئے (۲۵)‘‘۔

صحرائی اسلام جنوب مشرقی ایشیا کو بھی اپنے شکنجے میں لے رہا ہے۔ یہاں اسلام فوجی غلبے کی بجائے تجارت کے ذریعے پہنچا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جنوب مشرق ایشیا کے مسلمان تاریخی طور پر بدھ مت، تاؤ مت، عیسائیوں، سکھوں، ہندوؤں، کنفیوشسٹوں ۔۔اور عورتوں کے ساتھ مل جل کر رہ رہے تھے۔ مگر ملائشیا اور انڈونیشیا کی زمین کے حجم سے بھی زیادہ پیسہ مشرق وسطیٰ سے وہاں پہنچا۔ وہاں کے قوانین اور آزادیاں بھی بدلنا شروع ہو گئیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۶ء میں پولیس نے مس ملائشیا کے مقابلہ حسن میں داخل ہونے والے تین مسلمانوں کو گرفتار کیا۔ لڑکیوں کے گھر والوں نے پہلے کبھی مقابلہ حسن میں مسلمان لڑکیوں کی شرکت کے بارے فتویٰ نہیں سنا تھا۔ جب انہوں نے سنا تو اُن کے کانوں کو یقین نہ آیا کہ ایسی بندش اُس ملک میں لگے گی جس کی نشوونما رواداری کے ماحول میں ہوئی تھی۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط سے ، ملائشیا کی بہت ساری ریاستوں نے شریعہ کا قانون نافذ کر رکھا ہے جس کے مطابق کسی فتویٰ کو متنازعہ قرار دینا جرم ہے۔ اگر وہ

آپکی گستاخی پر آپ کو دھر نہ لیں تو وہ آپ کو لجاجت پر پکڑ لیں گے۔ ’بہت کم مسلمانوں کے پاس سوال کرنے ، چیلنج کرنے یا حتکہ اسلام پر سرعام بات کرنے کی جرات ہے ‘، یہ بات ملائشین فیمنسٹ نیٹ ورک اِن اسلام‘ کی رُکن زینہ انور نے کہی ہے۔ ’اُن کی اس طرح سماجی تربیت ہوئی ہے اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مذہبی علماء ہم سے بہتر جانتے ہیں(۲۶)‘۔ وہ جبکہ ’ ایک عورت ، اچھے مسلمان کے طور پررہنا چاہتی ہیں اور بی ۵۲ کو اونچے سروں میں سننا چاہتی ہیں۔ مجھے اِس میں سے کسی بات پر بھی تضاد نظر نہیں آتا(۲۷)۔

یہ زینہ انور کی طرز کا اسلام نہیں تھا جس نے مس ورلڈکے مقابلہ حسن کو سن ۲۰۰۲ء میں نائجیریا سے نکال باہر کیا تھا۔ وہ گڑبڑجو بآسانی پھیل سکتی تھی، نے کئی گرجاگھروں کو آتشزدگی کے حوالے کر دیا اور کئی اموات کا موجب بنی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ کیا صحرائی اسلام اس طرح پھیلا تھا؟ کیا ’بنیاد پڑنے کی گھڑی‘ کے خبط نے مقابلہ حسن کے خلاف فساد بھڑکایا تھا؟آخر مس نائجیریا نے تو پچھلے برس ہی یہ مقابلہ جیتا تھا، جس سے اُس کے ملک کو یہ اعزاز ملا کہ وہ

اگلے برس اِس مقابلے کی میزبانی کر سکے۔ نائجیریا کے مسلمانوں کو یہ سب کچھ تو ایک عرصہ سے معلوم تھا۔ فسادات تو ایک صحافی کی اس رائے سے شروع ہوئے کہ پیغمبر محمد اس مقابلہ حسن کو بند کروا دیتے اور جیتنے والی حسینہ سے شادی کر لیتے۔ ایک خلافِ عقل تبصرہ تھا مگر کیا قتل و خون اور ڈکیتیوں کے لائق تھا؟ لیکن جب لوگ دل میں یہ ایمان بٹھا لیتے ہیں کہ 'بنیاد پڑنے والی گھڑی' کے کسی پہلوکو خطرہ درپیش ہے تب مذہب اُن کو جامد، کھڑاک سے ٹوٹنے والی اور غیرانسانی سطح پر لے جاتا ہے۔ اِس معاملہ میں، غیر انسانیت کی یہ انتہا تھی کہ دل آزاری کرنے والے اخبار نے تین بار معافی مانگی، مسلمان احتجاجیوں نے اخبار کے دفاتر کو آگ لگا دی۔ ایک اور چیز: وہ کالم نگار جس نے پیغمبر محمد کے بارے گستاخ بات لکھی، نے کچھ ہفتے قبل عیسائیوں کو سخت بُرا بھلا کہا اور عیسیٰ کا نام خراب کیا۔ کوئی شخص نہیں مراتھا(۲۸)۔
'فاؤنڈامینٹلزم' ہمارا قتل کر رہی ہے۔ ۔ اور دوسری اس طرح کی باتیں بھی۔ وہ کون لوگ ہیں ، جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہم بنیاد پڑنے والی گھڑی کے کتنا

قریب ہیں؟اس مفروضے کو استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہیں،یا پھر اس بات سے چشم پوشی کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ تباہ کن حد تک۔ اَب وقت آ گیا ہے کہ کمال اتاترک، جدید ترکی کے معمار، سے ایک نقطہ لیا جائے۔ ۱۹۲۵ء میں اُس نے اعلان کیا، 'میں آج یہ سمجھنے کو مکمل طور پر قاصر ہوں کہ سائنسی علوم کی تابناک روشنی کے دورمیں اور تہذیب وتمدن کے ہر پہلو سے آشنا عہد میں۔۔۔ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں ، اس قدر قدیمی کہ وہ اپنی زندگی اور اخلاقیات کی فلاح کیلئے ایک یا ایک دوسرے شیخ کی رہنمائی تلاش کریں(۲۹)'۔ اتاترک نے خود کو خاص طور پر بنیاد پڑنے والی گھڑی کے اسلام سے ہر قسم کا ناطہ توڑ کر اہلِ نظر ثابت کیا ۔ اُس نے کوئی خالص کھیل نہیں کھیلا کیونکہ اس کے نتیجہ میں صرف ایک جیتنے والا پیدا ہونا تھا: ایک بادرویش شخص جس نے ہر اُس چیز کو کم کر دینا تھا جو کہی گئی ہو، دیکھی گئی ہو اور آزمودہ کار ہو۔ کسی بھی معاشرے کی نشوونما کیلئے ، اتاترک کو معلوم تھا ، کہ بہت سارے شعبوں میں بہت سارے جیتنے والوں کے امکانات کی ضرورت ہوتی ہے۔

بنیاد پڑنے والی گھڑی کو دبانے سے اتاترک نے ترکی میں جمہوریت کی بنیاد رکھ دی۔ اس کے باوجود کہ فوج کے ڈنگ اِس جمہوریت کو ڈستے رہتے ہیں، اور اِس جمہوریت میں اور بھی کئی طرح کی کوتاہیاں ہیں، مگر یہ جمہوریت ہنوز مسلمان دنیا میں سب سے بہتر ہے۔اور کٹر مسلمان جو ترکی کی سیاسی زندگی میں حصہ لیتے ہیں، جیتنے والے بن سکتے ہیں۔ نومبر ۲۰۰۲ء میں ترکوں نے اسلامی پارٹی کو حکومت دلوائی۔ یہاں پر ایک دوسرا بتانے والا نقطہ یہ ہے: ترکی کے اسلام پسندوں کی مقبولیت کا دارومدار امریکہ کی خارجہ پالیسی کی مخالفت کرنے یا اسرائیل کی سرزنش کرنے میں نہیں ہے۔ اس کا دارومدار روزگار میں اضافہ اور کرپشن کے خاتمہ کے وعدے کرنے پر ہے۔ بحرین میں ووٹروں نے ٹھیک اُنہی ترجیحات کی بات کی جب وہ ووٹ ڈالنے کیلئے ترکی کے انتخابات سے ایک مہینہ پہلے گئے۔۔یہ گلف عرب ریاستوں میں پہلا الیکشن تھا جہاں عورتوں نے بھی ووٹ ڈالے۔ اِن ووٹروں نے مستقبل کی بات کی، ماضی کا قصہ نہیں چھیڑا(۳۰)۔

اگر بولنے کا موقع دیا جائے تو بہت سارے مسلمان کہیں

گے کہ وہ بنیاد پڑنے والی گھڑی کو دہرانا نہیں چاہتے۔ وہ اُس راستے کا بہت تھوڑا حصہ لینا چاہیں گے جو گزر چکا ہے اور وہ زیادہ حصہ اُس راستے کا اپنانا چاہیں گے جو آگے ہے (۳۱)۔ جب مشتعل پاکستانی والدین نے اُن علماء کرام کا پیچھا کیا جنھوں نے اُن کے بیٹوں کو جرائم (جہاد) کیلئے بھرتی کیا تھا، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ آگے جانے کی خواہش میں کتنا کھل کر بولا جاتا ہے۔ جب انڈونیشیا کے معتدل مسلمانوں نے کتاب 'میاں بیوی تعلقات کا نیا رخ' شائع ہونے دی، اسلام اور انسانی حقوق کو باہم ملانے کی سعی کرتے ہوئے (۳۲)، تو آگے سفر میں چند مزید ہمسفرملتے ہیں۔ جب سخت گیر ملا طالبعلموں کی ریلی کے اثرات کے احتجاج میں غصے میں بھرے پارلیمنٹ سے باہر نکلے تو اس کا مطلب ہے کہ مستقبل جوش مار رہا ہے۔ جب سعودی عرب کا انگریزی روزنامہ، دی عرب نیوز، ایسا کالم چھاپ سکتا ہے جو اسرائیلیوں کے عربوں سے کہیں آگے اقتصادی اعدادوشمار کی تفصیلات فراہم کرتا ہے اور جب یہ کالم چیخ کر سرخی سجاتا ہے، 'عربو حقائق کا سامنا کرو(۳۳)!'۔ آپ کو بتاؤں کہ بند منہ کھلنے لگے ہیں۔

واہموں جیسی قبائلی چپ اَب ختم ہونے کو ہے۔ جیسا کہ حال ہی میں نیو یارک ٹائمز میں اُردن کے وزیرِ خارجہ نے لکھا، ’عرب رہنماؤں کو خود کش بم دھماکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہئے اور اپنے سیاسی اور اقتصادی نظام کو مزید جمہوری بنانا چاہئے (۳۴)‘۔

جب لبنان کا صحافی لکھتا ہے کہ ’ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کی بھرپور کوششوں کیلئے گیند اَب واشنگٹن کے احاطہ میں ہے‘۔ اُس کا مقصد آزادی کے پیمان کو دعوت دینا تھا (۳۵)۔ جب عرب دانشوروں نے مصری ٹی وی پر چلنے والی یہود مخالف سلسلہ وار ٹی وی ڈرامہ کی مذمت کیلئے امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا ساتھ دیا تو اِس کا مطلب تھا کہ ایک دوسرے پر دارومدار کرنے کے مواقع کا آغاز ہو چکا ہے۔ مغرب کی طرف سے جتنا سفارتی دباؤ بڑھے گا، تبدیلی کیلئے اندر سے اٹھنے والی آوازوں کو اُتنا ہی حوصلہ ملے گا۔

اورجب مراکش کے بادشاہ نے شریعہ لاء پر نظرِ ثانی کا اعلان کیا جس کے مطابق کثرت الازدواج کا خاتمہ کرتے ہوئے عورتوں کو طلاق، حق مہر اورتحویل تک رسائی دی۔۔ یہ وہ اصلاحات ہیں جن کی بنیاد خود قرآن میں ہے۔

مزید براں جب شمالی امریکہ میں ’پروگریسو مسلم یونین‘ کے نام سے ایک ایسا گروہ پروان چڑھا جن کا پلیٹ فارم ’’تمام انسانوں کی مساوی حیثیت اور قدرومنزلت‘‘ کی تصدیق کرتا ہے، یہ گروہ اسلام کے رہنما متن کے حوالے سے ’’محتاط تحقیق اور بھرپور تعلق‘‘ پر زور دیتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ ’’سچ تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں‘‘، تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ مغرب کی آزادی مسلمانوں کی نئی نسل کو اجتہاد کے احیاء کیلئے آگے بڑھا سکتی ہے، اجتہاد جو اسلام کی تخلیقی فکر کی گمشدہ روایت ہے۔

آگے جانے کے راستے کو، جو مجھے دکھائی دیتا ہے، بیک وقت تین مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کرنا ہو گی: ایک، اسلامی دنیا میں مسلم اقتصادیات کو مضبوط کرنے کیلئے تمام مسلمان خواتین کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ دوسرا، صحرا کو اسلام کی نت نئی ایک دوسرے کی متضاد توجیحات کی چھوٹ دے کراپنا پیسہ پیچھے چھوڑ کر بھگانا ہو گا۔ اور تیسرا، مغرب کے ساتھ کام کرنا ہو گا، اُس کے مخالف نہیں۔ ہر ایک معاملے میں، ہمیں فرسودہ قبائلیت کو دبانا ہو گا۔

میں اَب یہاں تک خود کو ریفیوزنک کے طور پر پابند کرتی ہوں۔ اَب میرے اجتہاد کے مشن کے بارے پڑھئے۔

حوالہ جات:
۱ ۔ میری ویب سائٹ پر اِس حوالہ نمبر کو کلک کر کے میری تقریر پڑھ سکتے ہیں۔
۲ ۔ اِس بات کو آپ میرے دوست طارق فتح سے بھی معلوم کر سکتے ہیں، جنھوں حال ہی میں پاکستان کا دورہ کیا اور وہاں اِس طرح کی متعدد باتیں سنیں۔اسی طرح طارق علی اپنی کتاب The Clash of Fundamentalisms میں بھی لکھی ہے۔ ’’میں گیارہ ستمبر سے اَب تک بہت سارے اپنے لوگوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں ملا ہوں، ایک سوال ہمیشہ دہرایا جاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان ایسا کام کرنے کے ٹھیک ٹھاک اہل ہیں؟ میرا جواب ہوتا ہے ، ’بالکل‘۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ آپ کس کو اِس واقعہ کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، اور جواب ہر جگہ ایک ہی ہوتا ہے ، اسرائیل۔‘‘
۳ ۔ اِس موضوع پر مزید پڑھنے کیلئے ، دیکھئے۔Anwar

Shaikh, Islam: The Arab National Movement (Cardiff: Principality Publishers, 1995) and W.R. Clement, Reforming the Prophet: The Quest for the Islamic Reformation (Toronto: (Insomniac Press, 2002
۴۔ Fareed Zakaria, The Future of Freedom: Illiberal Democracy at Home and Abroad (New .York: W.W. Norton, 2003), p
145
ذکریا کے یہ مشاہدات کہ عرب کے اثرات انڈونیشیا کے اسلام کواپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں، کی تصدیق Tracy Dahlby کی کتاب میں واردا حفیظ سے ایک ملاقات کے تذکرے میں بھی ہوتی ہے۔ 'واردا حفیظ ،شہری غریب علاقوں میں کام کرنے والی ایک وکیل ہیں، نے مجھے بتایا کہ دفاتر میں کام کرنے والی خواتین نے حجاب پہننا شروع کر دیا ہے۔ حوالہ دیکھیں: Tracy Dahlby, "Indonesia: Living Dangerously," National Geographic, March 2001۔ اصل میں حجاب سر پر اوڑھنے والا عربی صافہ ہے۔ مزید حوالہ دیکھئے۔
Simon Winchester, Krakatoa: The Day the

World Exploded 150 August 27, 1888 (New York: HarperCollins, 2003) ۔ ونچسٹر لکھتے ہیں،
انڈونیشیا عربوں سے ’کنورٹ‘ ہوا اور ابھی بھی ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ عرب اور عرب ثقافت انڈونیشیا کے مذہبی رہنما ہیں۔‘‘(صفحہ ۳۲۶)اِس بات کی حیران کن مثال دیکھنے کیلئے کہ کس طرح عرب پُرسکون صوفیوں کو بنیاد پرستی کے جذبے کی طرف مائل کر سکتے ہیں، صفحہ ۳۳۰۔۳۳۲ ۔ یہ بات ڈاکٹر ایاد سراج نے مجھے ایک انٹرویو کے دوران ۲جولائی ۲۰۰۳ء کو کہی۔ وہ ماہر نفسیات ہیں اور غزہ کمیونٹی مینٹل ہیلتھ پروگرام کے بانی ہیں۔ انہوں نے فلسطینی معاشرہ میں قبائلیت کو سب سے بڑا مسئلہ قرار دیتے ہوئے کہا ’ یہ ایک قبائلی نظام ہے جہاں اختلاف کو بغاوت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ہم نے ابھی تک تمام عرب ممالک کے اندر باشعور شہریت کی ابتدا ہی نہیں کی جہاں تمام لوگ قانون کے سامنے برابر ہوں۔ یہ بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔‘

۶ ۔ Gaber Asfour, "Osama bin Laden: Financier of Intolerant Desert' Islam," New Perspectives Quarterly, Winter 2002, p. 1 of online version.

Download at www.digitalnpq.org

۷ ۔ کچھ مبصرین کا کہنا ہے کہ پیغمبر محمد کے چوتھے خلیفہ علی نے مسلمان مردوں سے کہا 'عورت کی برائیوں سے ہوشیار ر ہو، اُن عورتوں سے بھی خبردار رہو جن کے بارے کہا جاتا ہو کہ وہ اچھی ہیں۔ اُن کی اچھی باتوں کو بھی نہ سنو مبادا کہ تم اُن برائیوں میں پھنس نہ جاؤ۔' کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ اُس جنگ کے بعد کہے جو جنگ پیغمبر کی بیوی عائشہ کی سربراہی میں اُن کے ساتھ لڑی گئی۔

۸ ۔ میری ویب سائٹ پر اِس حوالہ کے انگریزی حصہ میں کلک کر کے پوری رپورٹ پڑھئے ۔

۹ ۔ قرآن، ۲:۱۱۵۔۔ کئی جگہ پر قرآن یقینی طور پر کہتا ہے کہ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔ کیا یہ تضاد نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا مکہ کے بارے آیت دوسری آیت کی نسبت زیادہ درست ہے؟

۱۰ ۔ جس ملا کا ذکر ہے اُس کا نام ہے ، موسیٰ صدر۔ مزید پڑھئے ۔ Amir Taheri, "The Freedom to go Topless," Wall Street Journal, December 6, 2002

۱۱ ۔ Ja'far Subhani, The Message (City

unknown: Islamic Seminary, 1984), p. 41
اِس کتاب کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اِس کا مصنف آغاز ہی اِس بات سے کرتا ہے کہ یہ کتاب مکمل طور پر تعصبات سے پاک ہے اور کسی مخصوص مفاد سے بے نیاز اِن واقعات کو جمع کیا گیا ہے۔ (p. xviii).، اِس بات پر توجہ دینے کی اِس لئے ضرورت ہے کہ اِس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے، ''یہودیوں کے خطرناک منصوبے''۔ اس باب میں قصے کہانیوں کو پھیلانے کی غرض سے 'یہودی پروگرام' کو ننگا کیا گیا ہے (صفحہ ۱۷۹) ۔

۱۲ ۔ V.S. Naipaul, "Our Universal Civilization," The Writer and the World: Essays (New York and Toronto: Knopf, 2002), p. 508

۱۳ ۔ Al-Kindi as quoted by David C. Lindberg, Theories of Vision from Al-Kindi to Kepler (Chicago: University of Chicago Press, 1976), p. 18

۱۴ ۔ Mohammed Ayub Khan, review of What Went Wrong?, www.islamonline.net, June 16, 2002

۱۵ ۔ Quoted by Murad Wilfried Hoffman, Islam:

The Alternative (Reading, UK: Garnet, 1993), p. 32

۱۶ ۔ شہزادی کا نام تاج ایس سلطانہ ہے ، شہزادی نے شاہی گھرانے کے اندر فرانسیسی اور فارسی ادبیات میں تعلیم حاصل کی۔ Bernard Lewis۔ لکھتے ہیں کہ وہ پرشیا اور مغرب میں عورت کے مقام کے فرق کے بارے باریک بین طور سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنی تحریروں ، خاص طور پراپنی یادوں اور چند نظموں میں، اپنی ہم جنس عورتوں کی زبوں حالی اور پابندیوں کو رد کر دیا تھا۔ مزید پڑھئے۔ What Went Wrong? Western Impact and Middle Eastern Response (Oxford, New York: Oxford University Press, 2002), p. 95

۱۷ ۔ Karen Armstrong, A question of faith" (review of Richard Fletcher's The Cross and the Crescent), The Guardian, March 1, 2003, p. 3 of online version

۱۸ ۔ Sheikh Jamal, "chief of the Ulema of Mecca," as quoted by Bernard Lewis, What Went Wrong?, p. 92

۱۹۔ Arif Efendi, Chief Mufti of Istanbul, as quoted by Bernard Lewis, Ibid., p. 93

۲۰ ۔ Richard Behar, "Pakistan: A Kidnapped Nation," Fortune, April 29, 2002, p. 3 of online version

جون ۲۰۰۳ء میں Pew Research Center for the People and the Press نے چوالیس اقوام کے سروے کے نتائج کا اعلان کیا۔ اِن میں بتایا گیا تھا کہ فلسطین، انڈونیشیا اور اُردن کی واضح اکثریت اور مراکش کی قریب آدھی آبادی نے کہا تھا کہ ہمیں اسامہ بن لادن پر اعتبار ہے کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں درست کام کر رہا ہے ۔۷۱ فیصد فلسطینیوں نے یہی بات کہی تھی۔ مقبولیت کی یہ شرح یاسر عرفات کو بھی مات کر رہی تھی۔ اِس سروے کو آپ اِس ویب لِنک پر ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ "Views of a Changing World 2003," at http://people-press.org

۲۱ ۔ Dr. Ali H. Alyami, testimony to the U.S. Congress, June 4, 2002, p. 2 of speaking notes

۲۲ ۔ شیخ محمد صالح المناجد شیعوں کو یہودی کہتا

ہے۔ یہ ملا وہی شخص ہے جس نے ضرورت سے زیادہ ہنسنے پر منع کیا تھا، حال ہی میں اِس ملا نے شیعوں کے خلاف فتویٰ جاری کیا ہے۔ کم ازکم وہ اپنی سطح پر خوشی سے محروم اسلام میں تو جی رہا ہے۔

۲۳۔ Ali Al-Ahmed, testimony to the U.S. Congress, June 4, 2002, p. 1 of speaking notes

۲۴۔ Source: Nicholas Kristof, "Watch What You Say," New York Times, June 21, 2002.

۲۵۔ Dr. Abdulla Al-Tarekee, A Muslim's Relations with Non-Muslims, Enmity or Friendship, p. 28

یہ کتاب امریکہ کے Fairfax, Virginia-based Institute for Islamic and Arabic Sciences سے شائع ہوئی ہے۔ مزید تفصیلات کیلئے اِس دستاویز کو دیکھئے۔

"Saudis Spread Hate Speech in U.S." put out by the Saudi Institute and the Foundation for the Defense of Democracies, September 9, 2002.

۲۶۔ Zainah Anwar, "Modern, and Moderate, Islam," Asiaweek, September 16, 1997, p. 34

۲۷ ۔ Zainah Anwar quoted by Anthony Spaeth, "Trouble in Purdah," Time International, April 8, 1996, p. 2 of online version

۲۸ ۔ کینیڈین ہیومن رائٹس کی وکیل کین ویوا لکھتی ہیں، ’سات ستمبر کو اخبار کے ایک مضمون میں مس ڈینئیل نے عیسائی گرجا گھروں پر ملک کے سماجی اور اخلاقی زوال پرنگاہیں ہٹالینے پر تنقید کی تھی۔ ’اگر عیسیٰ کو دوبارا آنا ہوتا‘ وہ لکھتی ہیں، ’’وہ اُن لوگوں کو کیا کہتے جو خود کو اُس کا نام لیوا کہتے ہیں‘‘۔ حوالہ: "Jihad versus Miss World," Globe and Mail, November 30, 2002, p. 2 of online version

۲۹ ۔ Kemal Ataturk as quoted by David Remnick, "The Experiment: Will Turkey be the model for Islamic Democracy?" New Yorker, November 18, 2002, p. 51

۳۰ ۔ Sources (among others): Patrick Graham, "Troubled Turkey goes to polls," National Post, November 2, 2002 and Tom Friedman, There Is Hope," New York Times, October 27, 2002.

۳۱ ۔ Khalid Duran, "Muslim world at a

crossroads," Washington Times, January 4, .2002

Read a review of the book by Karim Raslan, -٣٢ "Indonesia's moderate Islamists," Foreign Policy, July-August 2002, Issue 131, pp. 77-79

Muhammad Omar Al-Amoudi, "Face the- ٣٣ .facts, Arabs," Arab News, May 29, 2002

Marwan Muasher, "A Path to Arab - ٣٤ .Democracy," New York Times, April 26, 2003

Saad Mehio, "A specter is haunting the - ٣٥ Middle East: democracy," The (Beirut) Daily .Star Online, October 1, 2002

اجتہاد آپریشن

یہ شاید مضحکہ خیز لگے کہ کوئی جو مذہب دان بھی نہ ہو،سیاستدان یا سفارتکار بھی نہ ہو (کسی بھی اعتبار سے کچھ بھی نہ ہو) ، یہ کہنے کی گستاخی کرے کہ اسلام میں کس طرح کی اصلاحات ہونا چاہئیں۔ ایک بار پر تو میں اِس بارے سوچتے ہوئے خود کو بہت متکبر محسوس کر رہی تھی، مگر صرف ایک بار ۔ مجھے 'اپنا مقام جاننے' کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تبدیلی کہیں سے تو آنی ہے۔ پھر کیوں ایک نوجوان مسلمان عورت سے نہیں جس نے (اسلام کی) ساکت حالت کی دفاع کیلئے جذباتی یا کسی بھی قسم کی وابستگی پال نہیں رکھی۔

میں نے اَب تک جو کچھ اکٹھا کیا ہے، آپ کے سامنے رکھتی ہوں۔ مسلمان مسلسل اقلیتوں اور عورتوں کی تذلیل کے طرزِ عمل کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ کیا اِن دونوں مسئلوں پر ایک ہی وقت میں قابوپایا جا سکتا ہے؟ میں نے قرآن سے کافی امید کی ڈوریاں نکالیں، اس کے ساتھ

ساتھ تاریخ سے بھی، تاکہ اصلاحات کے امکان کو دیکھ سکوں۔ مثال کے طور پر، مسلمانوں کا تجارت کے ساتھ صدیوں پرانا محبت کا رشتہ ہے ، اِس بات نے میری دلچسپی کودو وجوہات کی بناء پر بڑھایا۔ پہلی، تجارت نے ہمیشہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین اچھے تعلقات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دوسری، قرآن میں عورتوں کے کاروباری شخصیات بننے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میرا فی الفور تجزیہ یہ تھا: خدا شناسی اور عورت کو کاروبار میں لگا دینے سے ممکن ہے کہ اسلام میں روشن خیال اصلاحات کا آغاز کیا جا سکے۔ مگر کیا کوئی اور بھی سمجھتا ہے کہ یہ خیال کارآمد ہو سکتا ہے؟

اکتوبر ۲۰۰۲ء کی ایک دوپہر کو، میں نے ' اوپرہ وِنفری شو' کی ایک قسط دیکھی جس میں ہمشیرگان ملت اسلامیہ کی ایک افسوسناک ریاست کی داستان سنی۔ اوپرہ نے ایک ایسی عورت کو نشر کیا جس کو سنگساری کی سزا کا حکم ہواتھا۔ایک دوسری عورت کے چہرے پر تیزاب پھینک کر چہرے کو بدشکل کر دیا گیا تھا اور تیسری نے بتایا کہ اپنے معاشرے میں اُس کی

حیثیت جوتی کے برابر ہے ، نہ کم نہ زیادہ۔ ’میں کیا کر سکتی ہوں؟‘اوپرہ نے بیباک ہو کر کیمرہ سے پوچھا۔ پروگرام کے ڈائریکٹر نے کٹ کر کے زینب صلبی کو پیش کیا، جو اوپرہ کے مہمانوں میں سے ایک تھیں۔ ’مجھے ایک افغان عورت ملی جس نے کہا کہ اگر اُس کے پاس ایک سو ڈالر ہوں تو وہ ایک آمدن دینے والا کاروبار شروع کر سکتی ہے ...‘ صلبی جو گلوبل ایڈووکیسی گروپ فار وومین کی سربراہ ہے ، نے ٹی وی ناظرین سے اپیل کی، وہ افغان کاروباری خواتین کی مدد کیلئے بولتی رہتی ہیں، ’اُس افغان عورت کے پڑھنا لکھنا سیکھنے میں اُس کی مدد کیجئے تاکہ وہ کہیں اُن کاغذوں پر دستخط نہ کر دے (جو اُس کے بچوں کو اُس کی تحویل سے جدا کر دے)، اُس کی مدد کیجئے کہ وہ اپنے حقوق جانے تاکہ اپنے شوہر یا قبیلے کے سردار کو کہہ سکے ، ’’نہیں،تم میرے ساتھ یوں نہیں کر سکتے‘‘۔ اُسے اپنی جنگ خود لڑنے میں مدد کیجئے (١)۔ صلبی نے تجویز پیش کی کہ مغرب کی عورتیں مسلمان دنیا کی عورتوں کے کاروباروں میں سرمایہ کاری کریں۔ جب عورتوں کے پاس پیسہ ہو گا ، جسے انہوں نے خود کمایا ہو گا ، تو وہ مشکلات کے

بارے بہت سارے سوالات اٹھائیں گی۔
میرے لئے اِس ٹاک شو کی حیثیت 'میری مدد کرو'' جیسی تھی، مگر یہ شو عزتِ نفس کے حوالے سے بھی تھا اور آخرِکار مذہبی اصلاحات کے حوالے سے اہم تھا۔ جب مسلمان عورتیں سوال کرنا شروع کریں تو وہ وہ خاندان کی 'عزت' کا بیچ لگا کر معزز انسانوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ 'عزت' کا تقاضہ ہے کہ آپ اپنی شخصیت کو قربان کر کے اپنے شوہر، باپ یا بھائیوں کی ساکھ، مقام اور خوشحالی کو بحال رکھیں۔ اور سوال اٹھانا اس بات کی نشاندہی ہے کہ آپ سانجھا اثاثہ نہیں ہے ۔ آپ خود اپنی ذات کی ترجمانی کرنا چاہتی ہیں، اپنے نام سے ظاہر ہونا چاہتی ہیں، اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہیں اور اُن کو اپنی آواز میں پیش کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کا وقار ہے ۔ اچھائی اسی میں ہے جو پیغمبر محمد نے تمام مسلمانوں سے چاہی ہے کہ ہم قبیلوں میں سے اُس کو لائق سمجھتے ہیں، جو اپنے اندر جھانک سکیں، مسلسل اپنے آپ کو ٹھوکے دیں، شدید کچوکے جو ساتویں صدی کے عرب قبیلے کی غیر مساوات، عداوت اور تشدد کی سرزمین کو اجاڑ دیں۔ مسلمان عورتوں کی

کاروباری صلاحیتوں کو آزاد کرنے سے ، ہم اکیسویں صدی میں عزت کو وقار کو بدل سکتے ہیں جس کے نتیجہ میں یہ اصلاح لا سکتے ہیں کہ اسلام اس طرح کا ہے۔ کاروباری خواتین کی مدد آپریشن اجتہاد کا نمبر ایک گول ہو سکتا ہے ، ایک ایسی مہم جو اسلام کی تبدیلی میں’اسٹارٹ کِک‘ ہو۔

میں خود کو ابھی پیدا ہونے والی جدوجہد کا رہنما مقرر نہیں کر رہی۔ درحقیقت میرا نہیں خیال کہ اِس کا کوئی ایک رہنما ہونا چاہئے۔ مسلمان دنیا کو بیڑیوں سے آزاد کرنا ایک بلند حوصلے والا کام ہے جس کیلئے اتحادیوں کی ایک قطار درکار ہے ، اگر قبائلیت کو اُڑانے کا کام کرنا ہو تو اُن میں مغربی دنیا کے لوگ بھی چاہئیں۔ اِن کاوشوں کیلئے باہم تہذیبوں کی بصیرت چاہئے۔ جلتی ہوئی گیارہ ستمبرواضح طور پر یاد دلاتی ہے کہ ایسا کچھ پھر ہو سکتا ہے اگر ہم خود کو ’دوسروں‘ کے مسائل سے دور نہ لے جائیں، سبق یہ ہے کہ دنیا کے اچھے شہری گھر کی حفاظت کرنے سے بڑے فوائد کو نہیں کھوتے۔ اس بات سے قطع نظر کہ مغربی لوگ اِس حقیقت کو نہیں مانتے مگر مغربی لوگوں کو یہ حقیقت

ماننا پڑے گی۔
اور ہمیں اَب یہ ماننا ہو گا کہ عرب مسلمان اَب ترقی کا آغاز کر رہے ہیں۔ عرب ممالک میں ساٹھ فیصد کے قریب لوگ بیس سال سے کم عمر کے ہیں(۲)، جو کہ امریکہ میں انتیس فیصد ہیں۔ بہت سارے نوجوان عرب مسلمانوں کے پاس کالج کی ڈگریاں ہیں، مگر اِن میں سے اکثریت کو نوکریاں ملنے کا امکان نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ ایک طرح سے اچھی خبر ہے۔ بیکار ماش اکثر انتہا پسند جماعتوں میں جا گھستے ہیں جو مفت کھانے ، بامقصد سرگرمی اور غصے کو نکالنے کی جگہ فراہم کرنے کا وعدہ دیتی ہیں۔ آپ اِن کو ایک اور نسل کا وقت گزارنے دیں، اُن کی تعداد بڑھ کر چالیس فیصد تک پہنچ جائے گی۔۔قریب آج کے تیس سو ملین سے بڑھ کو ۲۰۲۰ء میں چار سو تیس ملین ہو جائے گی(۳)۔ جو بھی اِن بچوں کو اقتصادی اور سماجی سطح پر حصہ لینے سے روکے گا وہ اِن کو انتہا پسندی کی افراتفری کی دعوت دے گا جواس کرہ ارض کے بیشتر حصہ کو اپنی لپیٹ میں لے گی۔ عرب میں بچوں کی یہ بڑھتی تعداد مغرب کا بھی اُتنا ہی مسئلہ ہے جتنا مشرق وسطیٰ کا۔

۲۰۰۱ء میں اقوام متحدہ کے ایک سروے کے مطابق آدھے عرب نوجوانوں نے کہا کہ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں اور وہ بے چینی کے ساتھ مغرب کی جانب دیکھ رہے ہیں(۴)۔ یہ بے چینی کافی ہو چکی، ۲۰۰۰ء میں آسٹریلیا نے مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا سے ممکنہ غیر قانونی تارکینِ وطن کو متنبہ کیا کہ اُن کی آمد پر انہیں مگرمچھوں، سانپوں اور کیڑوں مکوڑوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے (۵)۔مگر اِس کے ساتھ ساتھ مغرب امیگرینٹس (تارکینِ وطن) کے بغیر آگے بھی نہیں جا سکتا۔ یورپی یونین، امریکہ، جاپان ، کینیڈا اور آسڑیلیا کے لوگ تیزی سے بڑھاپے کی طرف جا رہے ہیں اور نئے پیدا ہونے والے بہت کم ہیں۔ اِن خطوں کو نئے ورکروں کی ضرورت ہے جو کھپت سازی کو برقرار رکھ سکیں، ٹیکسوں کے نظام کو بحال رکھ سکیں جن کے نتیجے میں سماجی بہبود کے اخراجات برقرار رہ سکتے ہیں، خاص طور پر بوڑھوں کی سماجی بہبود کے ضمن میں۔ قصہ مختصر، مغرب کو مسلمانوں کی ضرورت ہے۔

مغرب کو محمد عطاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہیمبرگ کے طالبعلم اور گیارہ ستمبر کے ہائی جیکر نے قرآن کو

چمچے کے ساتھ حلق سے اِس طرح اتارا ہوا تھاجس طرح وہ کمپیوٹر پروگرامنگ میں آگے بڑھا ہوا تھا۔ اُس کی معتدل سیکولر تربیت کے باجود، اُس کی مصر سے انجینئرنگ کی ڈگری اور جرمنی سے پوسٹ گریجوئشن کے باوجود، عطا میں یہ اہلیت پیدا نہ ہو سکی (یا پھر اُس کو اِس بات کی پرواہ ہی نہ تھی) کہ وہ اسلام کے ٹھیکیدا مفسروں سے کچھ سوالات کر سکتا۔

مغرب کو اُن مسلمانوں کی ضرورت ہے جو کھرے سوالات کر سکیں، اور باہر کی دنیا میں آپریشن اجتہاد شروع کرنے کا مقصد ہی یہ ہے۔ کیوں تب تک انتظار کیا جائے جب لاکھوں مسلمان آسٹریلیا، برطانیہ، جرمنی اور شمالی امریکہ کی سرحدوں تک پہنچ جائیں؟ کیا یہ اُس تحفظ کے احساس کی وجہ سے نہیں ہے کہ مسلمان اِن ممالک کو اِس لئے بھی رخ کرنا چاہتے ہیں کہ اُنہیں پہلے ہی علم ہے کہ اِن روادار ہمہ جہت معاشروں میں گھٹے ہوئے اسلام کی بجائے رواداری والا اسلام ہے؟ پھر کیسے ہم اصلاحات کو مسلم دنیا میں اپنی تہذیب کو ثبت کئے بغیربوئیں گے؟

آپریشن اجتہاد زیادہ سے زیادہ مسلمان عورتوں کو

کاروباری خواتین کی توانائی دے کر شروع کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے محمد یونس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مسلم دنیا میں خواتین کو آغاز کیلئے تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر کے کاروباری بنایا جا سکتا ہے۔ ایک بنگلہ دیشی ماہر معاشیات، محمد یونس نے گرامین بینک کی بنیاد رکھی تھی۔ 'گرامین' بنگالی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'دیہاتی'، اور یہ بینک معمولی رقوم کے قرضے اُن لوگوں کو فراہم کرتا ہے جن کو عام مالیاتی ادارے ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتے خاص طور پر اُن کو جن کے پاس اپنی زمین نہ ہو، جو کہ اکثر خواتین ہی ہوتی ہیں۔ بمطابق 'نو-نان سینس گائیڈ ٹو انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ' اکتیس ملین افراد جن میں ایک تہائی عورتیں ہیں اور دوتہائی دنیا کے ''غریب ترین لوگ'' ہیں ، کو چالیس ممالک کے اندرگرامین بینک نے اپنے آغاز سے آج تک چھوٹی رقوم کے قرضے دئیے ہیں(۶)۔ بینک نے اُن کاروباروں کو قرض دئیے جو سولہ سنگھار کا سامان سے لے کر موم بتیاں، چھتریاں، مچھروں کی جالیاں اور حتکہ موبائل فون تک بناتے تھے۔ اور قرضوں کی واپس کی شرح؟ اٹھانوے فیصد، ہمیں دیہاتوں میں موجود

سماجی دباؤ کا شکرگزار ہونا چاہئے جنہوں نے شہرت خراب نہیں ہونے دی۔ قبائلی اقدار کو اس طرح برتنا ایک صحتمند انداز ہے نہ کہ اس طرح جس طرح اکثر مسلمان عورتوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے۔قرضوں کی واپسی کی اس شرح کے مقابلے میں بنگلہ دیش انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک کو دیکھئے جس کے ہاں قرضوں کی واپسی کی شرح دس فیصد ہے (۷) جو صرف اُن لوگوں کو قرضے دیتا ہے جو جائیدادوں کے مالک ہوتے ہیں۔ کوئی مقابلہ نہیں۔

سو یہاں پرآپریشن اجتہاد کابیڑا اٹھانے کا تصور کرتے ہیں: فرض کیجئے ، اگر امریکہ ، یورپی یونین، کینیڈا ، آسٹریلیا ، جاپان اور دیگر امیر اتحادی اپنی قومی سلامتی کے بجٹ میں سے کچھ رقم لیتے ہیں اور اُس کو ایک جگہ پوری دنیا کی مسلمان عورتوں کو چھوٹے قرضے دینے والے ادارے کی صورت میں اکٹھا کر دیتے ہیں۔

یہ بات استعماریت کی علامت نہیں ہو گی۔ یہ قرضے کسی کو ناجائز طور پر نہ دئیے جائیں، یہ اُن عورتوں کو دئیے جائیں جو اپنے معاشروں میں کسی پوری نہ ہونے

والی ضرورت کو دیکھیں اور محسوس کریں کہ وہ صحیح طور پر اِس کمی کو پورا کر لیں گی۔ مثال کے طور پر اُس دیہاتی کو دیکھئے جس نے یونس کو گرامین بینک بنانے کی ترغیب دی ۔ بانس کی کرسیاں بننے والی ایک عورت نے یونس سے کہا کہ خام مال خریدنے کیلئے اُسے تاجر سے ادھار لینا پڑتا ہے جو اُس کا تیار مال خریدتا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کے ادھار پر منحصر کرتی ہے ، وہ اُس کے مال کی خود قیمت مقرر کرتا ہے جس میں سے اُس کو دن میں گھر لے جانے کیلئے دو پیسے بچتے ہیں۔ اَب اس میں کیا استعماریت ہو گی اگر اُس عورت کو اپنی بیچارگی ختم کرنے کیلئے تھوڑے سے وسائل مل جائیں؟ یہ بھی یاد رکھئے کہ اسلامی روایات تو کاروبار کے ساتھ سرگرم رہی ہیں(۸)۔ ایک پرانا مقولہ ہے ، 'خدا تمہارا حج قبول کرے ، تمہارے گناہ معاف کرے اور تمہارا سارا مال بک جائے '۔ تجارت اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے حتکہ قرآن کی ایک تھیوری اس کے متعلق ہے کہ قرض خواہ اپنے پیسے کی وصولی کے خاطر تب آ سکتے ہیں جب وہ جنہیں قرض دیا گیا ، منافع بنانا شروع کر دیں، اِس سے ایک لمحہ پہلے نہیں۔

خوش قسمتی سے چھوٹے قرضوں کی ادائیگی کا اچھا ریکارڈ ہے اور اِس بات کا امریکہ کو کم از کم علم ہے۔ بل کلنٹن کی صدارت کے دوران امریکہ نے ہر سال آئندہ کچھ سالوں کیلئے اس نوعیت کے قرضے دو ملین ڈالر کی صورت میں رکھے۔ جیسا کہ کلنٹن نے ۲۰۰۲ء کے شمارہ ''نیو پرسپیکٹو کوارٹلی'' میں لکھا، 'وہ دو ملین بڑھ کر پچاس ملین ہو جانے چاہئیں(۹)'۔ انہوں نے چھوٹے قرضوں کی اہمیت کیلئے ساتھ دیا کیونکہ وہ اِن قرضوں کے آرکینساس کے دیہی بیوٹی پارلر سے لے کر افریقہ کے مویشی فارموں پر اثرات کے خود گواہ ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں کلنٹن نے یونس کو گرامین بینک کی طرز پر پائن بفلو آرکینساس کے لوگوں کے لئے ایک اچھی شہرت والے ادارے کو قائم کرنے کیلئے نامزد کیا۔ کچھ سالوں بعد اور سینکڑوں کامیاب واقعات کے تذکرے پر مشتمل ایک کتاب 'ہمیں قرضہ دو: کیسے محمد یونس کے چھوٹے قرضوں کے انقلاب نے بنگلہ دیش سے شکاگو تک عورتوں کی کایا پلٹ دی' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ مگر افسوس، کیا مسلمان ممالک کو اِن باتوں کی طلب ہے یا پھر کلنٹن ضرورت سے زیادہ توقع کر رہے ہیں؟ ایسا

دکھائی دیتا ہے کہ اُن کی نوبل انعام کے لئے نامزد ماہر معاشیات ہرنیندو ڈی سوٹو سے گفت و شنید ہوئی ہے جن سے انڈونیشیا، پاکستان، الجیریا اور مصر کی حکومتوں نے رجوع کیا ہے (۱۰)۔ یہ حکومتیں ڈی سوٹو کی مہارت سے متاثر ہوئیں۔۔ قریب المرگ معاشی صورتحال کو کس طرح زندہ کیا جائے۔ کسی بھی مردہ معاشیات کی دو مثالیں ہوتی ہیں۔ ایک بلیک مارکیٹ کے حوالے سے ہے جس میں کاروبار بہی کھاتوں اور ٹیکس کے نظام سے بالا بالا ہوتے ہیں اور دوسرا قبضہ گروہوں کی جائیدادیں جن کا اُس زمین اور جائیداد پر کوئی قانونی حق نہیں ہوتا جو اُن کے قبضے میں ہوتی ہیں۔ہم بات کر رہے تھے اُن اثاثوں کی جن کو غریب لوگ قانونی طور پر رجسٹرکروانے کے متحمل نہیں ہو سکتے کیونکہ یوں گورنمنٹ کیلئے کاغذی کارروائی کرنے کے واسطے اچھا خاصہ وقت اور فیس درکار ہوتی ہے۔ سرخ فیتے کو نرم کیجئے، ڈی سوٹو نے تجویز پیش کی اور کہا کہ پھر دیکھئے کس طرح نچلے درجے کے کاروبار حقیقی تعمیری شکل اختیار کرتے ہیں۔ قبضہ گروہ رہن رکھ کر مورٹگیج کا پیسہ حاصل کر لیتے ہیں اور فوری ضرورت کا اہتمام

کر لیتے ہیں۔ فقط نقد کا کاروبار قانونی اور نامور کمپنیوں کیلئے آسان ہے۔ حکومت قابل ادا ٹیکس کاروباروں کو تحویل میں لیتی ہے۔ ہر کسی کا کام بن جاتا ہے، خاص طور پر عورتوں اور بچوں کا۔ عورتیں اور بچے ہی ہوتے ہیں جو غیر قانونی جائیداد کی حفاظت کیلئے گھر میں ہوتے ہیں۔ مردوں کو کام کیلئے باہر جانا ہی ہوتا ہے۔ جب جائیداد کی کاغذی کارروائی ہوتی ہے ،تب اگرچہ عورتیں اشیاء کی فروخت کیلئے گھر سے باہر نکل سکتی ہیں اور بچے اسکول جا سکتے ہیں۔ جب پیرو نے ڈی سوٹو کی حکمتِ عملی کو اپنایا تو اسکولوں کی حاضری چھبیس فیصد بڑھ گئی(۱۱)۔ اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ مٹھی بھر مسلمان حکومتیں ڈی سوٹو کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہی ہیں تاکہ وہ اُن کا معاشی تجزیہ کر سکیں۔ ایک ہزار سے زائد لوگوں نے انہیں دبئی میں سنا۔ مگر اُن کا پیغام حکام سے بالا زیادہ دل کو لگتا ہے۔

سن ۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں اقوام متحدہ نے اپنی پہلی عرب ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ جاری کی، جس کی تحقیق و تحریر عربوں کی اپنی تھی، جس میں بتایا گیا

کہ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں اپنی آدھی آبادی کی توانائیوں کو نظر انداز کر رہی ہے یعنی عورتوں کی۔ دراصل 'عورتوں کوچھوٹ' اُن تین کم مائیگیوں میں سے ایک تھی جن کو رپورٹ میں بیان کیا گیا تھا ، دوسری دو کم مائیگیوں کا تعلق 'تعلیم' اور 'آزادی' سے متعلق ہے۔ پہلی غلطی کے ازالہ کر دینے سے تعلیم اور آزادی میں اضافہ ہو جاتاہے۔ عورتوں کی مدد کر دینے سے سب کو ایک ساتھ مالی آزادی کا سہارا ملتا ہے جو سب کو اندر ہی اندر پڑھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اُن کو بڑے لوگوں کی غیبی ہدایتوں پر یقین کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی اگر وہ خود سے نتائج اخذ کر سکیں کہ قرآن میں کیا کیا ہے۔ میں یہ کیسے جانتی ہوں کہ عورتوں میں اپنی تفہیم کیلئے دلچسپی ہے؟ مہاجرین میں سے ایک بوڑھی افغان عورت آج کل ایک ایسے اسکول میں پڑھتی ہے جس کو نوجوان عورتیں چلا رہی ہیں اور وہ اُس کو طالبان کے زمانے میں خفیہ طور پر چلا رہی تھیں۔ 'میں یہ خود جاننا چاہتی تھی کہ کیا یہ قرآن میں موجود ہے جو ملا ہم کو بتاتے ہیں(۱۲)، اُس بوڑھی عورت نے ایک امریکی کو اپنے پڑھنے کی وجہ بتائی۔

فرض کیجئے کہ بطور کاروباری شخصیت کے، اُس عورت کے پاس پس پشت کر کے رکھ دینے کیلئے وسائل ہوتے۔ تب اُس کے پاس پڑھنے کیلئے ٹھوس وجہ ہوتی۔ ایک واضح آیت، جو امام شاذ ہی نچلے اور درمیانے طبقے میں پیش کرتے ہیں، میں قرآن نے عورتوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنے نکاح نامے کی شرائط کا اپنی ذاتی ضرورت کے مطابق تعین کریں۔ 'اگر عورت کو برے سلوک کا خدشہ ہو۔۔۔اپنے شوہر کی طرف سے'، پارہ چار کی آیت کہتی ہے 'اُن کیلئے کوئی بُرا نہیں ہو گا کہ وہ باہم معاہدہ بنائیں، جو اُن کیلئے اچھا ہو۔ لوگ حرص میں اوندھے منہ لیٹے ہوئے ہیں(۱۳)'۔ آج عورت کی طرف سے شادی کی ذاتی شرائط میںیہ کچھ شامل ہو سکتا ہے:

'میرا شوہر میری جانب یا میرے بُندوں کی جانب ناپسندیدہ انگلی بھی نہ اٹھائے، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو میں اِسے برا سلوک تصور کروں گی اور میرے پاس اُس کو طلاق دینے کا حق ہو گا'۔ اُس چھوٹے قرضے کو ایک سنجیدہ کامیابی میں ڈھالنے کی کیا کامیاب ترغیب ہے۔ جو مرداِس حق کو چھیننے کی کوشش کریں، اُن کو ایسا کرنے کیلئے قرآن سے حقیقی تاویل لانا ہو اور شادی سے

پہلے معاہدہ کرنا ہوجسے شریعہ جج پاس کریں۔
آدمیوں کو بھی آپریشن اجتہاد سے فائدہ پہنچے گا، جیسے جیسے کاروباروں کو غیر ملکی امداد ملے گی۔ مقامی سرگرمیوں میں باہر کا پیسہ یقینی طور سے فوج، تحفظ کے اداروں اور نوکر شاہی پرانحصار کر کم کرے گا، یہ وہ تین بڑے شعبے ہیں جن کو اپنانے کیلئے فی الحال مسلمان مرد اپنا پورا زور لگاتے ہیں۔ امریکہ کے اسٹیٹس ڈیپارٹمنٹ کے پالیسی ڈائریکٹر، رچرڈ حاس نے اِس بات کے ادراک کا اظہار کیا کہ کس طرح مردوں کی عزت عورتوں سے وابستہ ہے۔ دسمبر ۲۰۰۲ء میں حاس نے واشنگٹن کی ایک تقریب میں حاضرین کو بتایا ، 'پدری معاشرے ، جہاں عورتیں مردوں کی طابع ہوتی ہیں ، ایسے معاشرے ہوتے ہیں جہاں مرد مردوں کے بھی طابع ہوتے ہیں(۱۴)'۔ گلوریا سٹینم بھی اِس سے بہتر نہیں کہہ سکی۔ عورتوں کو کاروبار کی طرف مائل کرنے پر خرچ کرناشاید سب کیلئے سنہری موقع ہے کہ پیسے والے علماے کرام کی باقاعدہ اجارہ داری کو ختم کیا جائے اور عام لوگوں پر حاوی اِن علماء کو پیسہ فراہم کرنے والے آقاؤں کے اثر کو بھی۔

اسلام کو آزاد خیال بنانے کے نقطہ نظر سے آپریشن
اجتہاد ایک اُمید افزا بات دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ وعدہ
اُکھڑ سکتا ہے اور آخرکاربیکار ہو سکتا ہے جب تک
اسلام کے 'انسانی حقوق' کے بارے احکام یہی تقدیس
پاتے رہے کہ مرد ہی اپنے خاندانوں کے کفیل ہیں اور
عورتوں کے کمانے پر پابندی ہے۔ اور میرا ابھی تک ا،س
بات پر بھی ایمان ہے کہ خوشحالی یا خوشحالی کا
امکان اِس عزم کو توڑ سکتا ہے کہ صرف آدمیوں کو ہی
گھر حلال کمائی لانا ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں
اس بات کی وضاحت کروں کہ کیسے جینے کی ضرورت
نئی سوچ کو جنم دیتی ہے۔

میں ایک غصہ دلانے والی بات سے آغاز کروں گی۔
۱۹۹۷ء میں اسلام پسندوں نے اوپری مصر کے علاقہ
لکسر سے اٹھاون سیاحوں کو مار دیا۔ یہ قتلِ عام نچلے
سطح پر قتل و غارت کی لہر جو کچھ برس پہلے شروع ہو
گئی تھی ، کے بعد ہوا۔ اُس قتل وغارت میں چند برطانوی
سیاحوں کو ایک مقام پر مارا گیا تھا، چند جرمن
سیاحوں کو دوسرے مقام پر اور ایک اور جگہ پر ایک یا
دو تائیوانی قتل کر دیے گئے۔ لکسر کے قتل عام نے اونٹ

کی کمر توڑ کر رکھ دی کیونکہ اِس قتل عام کے نتیجہ میں مصر کی سیاحت کودو بلین ڈالر تک کا نقصان ہوا۔ اِس کے بعد مصر کی عوام دہشت گردی کے خلاف ہو گئی اور انہوں نے سولہ سال پرانے ایمرجنسی کے قانون کی حمایت شروع کر دی جس کا مذہبی جہادیوں کی بیخ کنی کیلئے بے رحمدلانہ طور سے اجراء کر دیا گیا۔ یہ شرمناک بات ہے کہ ایمرجنسی قانون سیاسی اقتدار کے حریصوں کے پاس ایک ڈنڈے کی صورت میں آ گیا، خیر یہ میرا اِس وقت نقطہ نہیں ہے۔ نقطہ یہ ہے کہ جس گھڑی دہشت گردی اقتصادیات کیلئے خطرہ بن گئی، مصری حکام دہشت گردوں کیلئے خطرہ بن گئے۔

جب ہر ایک کوبہتر زندگی کے امکان کی پیشکش خواتین کے کاروباروں کے ذریعے کی جائے تو لوگوں کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔۔قبائلیت سے تجارت تک، شوہر کی عزت بطور واحد کفیل کے طور پر سے لے کر عورت اور مرد کے مابین مساوی وقار تک کیلئے۔ ممکن ہے کہ میں بہت رجعت پسند ہوں مگر سیاحت کا کاروبار ہمیں بتاتا ہے کہ ہم سینائی جزیرے میں کس طرح اسرائیلیوں اور مصریوں کے درمیان باہم تعلق کی صورتیں دیکھتے ہیں۔

مصریوں نے کاروبار دینے کو سراہا۔ وہاں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کافی بہتر تعلقات پائے جاتے ہیں جو کسی حد تک اِس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تجارت سماجی تعلقات کو بہت بہتر طور سے آگے لے جا سکتی ہے۔

پھر بھی میں صحرائی اسلام کی پوجا کرنے والوں کی طاقت کے استعمال کو کمتر نہیں گردانتی۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ بنیاد کی گھڑی پڑنے کے ورثاء دلوں کو 'خواتین کا طرزحیات مسلم قوانین کے تحت ' نامی ویب سائٹ میں ہلاتے ہیں، یہ ویب سائٹ اسلام کے ہیومن رائٹس کارکنوں کی ہے۔ بنیاد کی گھڑی پڑنے کے ورثاء کا اِس ویب سائٹ پر کہنا ہے، ' ہم نے ابلاغ کی ٹیکنالوجی کے سب سے زیادہ اثر پذیر ہونے والے ذریعے کو اپنا لیا ہے ۔۔۔جس میں تبلیغ کیلئے سادہ اور سستی آڈیو کیسٹس کو استعمال کر رہے ہیں جو عورتوں ا ور مغربی اقدار کی طے شدہ برابری اور شخصی آزادی کے خلاف مذمتی تقاریر پر مشتمل ہیں، اوریہ چیزیں لوگوں کو تشدد پر اکساتی ہیں اور حتکہ مخالفین کو قتل کرنے پر بھی۔ ایسی کیسٹوں کی مسلمان ممالک کی گلیوں اور

بازاروں میں بھرمار ہے۔ اِن کو عوامی اجتماعات میں نشر کیا جاتا ہے، مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکرز پر اور ریڈیو پر(۱۵)۔‘

یہاں تک کہ سب سے زیادہ مقبول ذریعہ ابلاغ ٹی وی پر بھی، جیسا کہ لبنان میں المنار کا چینل جو حزب اللہ سے منسلک ہے اور جسے لبنانی حکومت نے ۱۹۹۷ء سے لائسنس دے رکھا ہے۔ المنار کا منشور، ’عرب اور اسلامی برادری کے تہذیبی کردار کو بڑھانا‘ درحقیقت یہودیوں کی مذمت کرنے کا ایک حربہ ہے۔ اس ٹی وی اسٹیشن کی ویب سائٹ پر ایک پروگرام ’انقلاب ال سورہ‘ کے نام سے پیش کیا جاتا ہے جس کا اگر مفہومی ترجمہ کیا جائے تو ’تاثر کی تبدیلی ‘ بنتا ہے۔ یہ میڈیا شناسی کے حوالے سے ہے یا پھر یہ تب واضح ہوتا ہے جب آپ بمشکل اِس شو کو پورا دیکھ سکیں تو اِس کی وضاحت سامنے آتی ہے۔ ’انقلاب ال سورہ‘ یہودیوں کی ہیبرو زبان کے تمام سمعی و بصری ذرائع ابلاغ اور اخبارات کا جائزہ لیتا ہے تاکہ صورتحال کو آشکار کرے اور صیہونیوں کی جنگ و جدل کے خفیہ مقاصد کو عریاں کرے(۱۶)‘۔

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پروگرام کے میزبان و پیش کار

اسرائیلی جیلوں میں اسیر رہ چکنے والے ایک صاحب ہیں۔ کیا بات ہے ، صیہونی تشددکے بعد زندگی تو واپس آئی۔ آخری بار جب میں نے ویب سائٹ دیکھی تب یہ بھی وعدہ تھا کہ جلد شاپنگ سیکشن کا اجراء ہو گا۔ یہ صاف ہے کہ تجارت 'فاؤنڈامینٹلزم' کا اکیلی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میڈیاآپریشن اجتہاد کا ایک دوسرا محاذ ہو گا۔ مگر امریکہ کی کہانی بہتر رخ کے ساتھ بیان کرنے کی بجائے ، جو کہ خودنمائی اور غیرمتعلقیت کا ایک ساتھ بھڑک اٹھنے والا آمیزہ ہے ، اگر مغرب کی امداد سے چلنے والا میڈیا جو مسلمان ناظرین کو اپنی کاروباری خواتین کے واقعات سنائے؟ ڈیوڈ ہوف مین انٹرنیوز نیٹ ورک کے صدر ہیں، یہ تنظیم دنیا بھر میں آزاد میڈیا کو امداد دیتی ہے۔ وہ سابق سوویت یونین کے مقامی ذرائع ابلاغ کو اعانت دینے کی تائید کرتے ہیں۔ 'مجھے جو بتایا گیا ہے کہ سولہ سو براڈ کاسٹروں اور تیس ہزار صحافیوں وماہرین ابلاغیات کو امریکہ کی امداد سے ملنے والی ٹریننگ اور تکنیکی معاونت کا فائدہ ہوا ہے'، ہوف مین نے مارچ ۲۰۰۲ء کے شمارہ 'فارن افئیرز میگزین' میں لکھا ، 'ایک درجن سے زائد قومی

ٹیلیویژن نیٹ ورک اِن کوششوں کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئے جن کو دوسو ملین ناظرین دیکھتے ہیں۔ اَب سابق سوویت یونین کے ہر شہر میں چینلوں کی ایک ورائٹی دستیاب ہے (۱۷) جس میں سے ہر کوئی اپنا انتخاب کر سکتا ہے‘۔

کیا اچھا ہو اگر مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے مغربی اتحاد کے نتیجہ میں اسلامی دنیا کے اندرعورتوں کو ٹی وی اسٹیشن قائم کرنے اور چلانے کا موقع دیا جائے؟ کیا مناسب بات ہو اگر اوپرہ ونفری اس اتحاد کی رہنما ہوں؟ اوپرہ کو اندازہ ہے کہ ایک باہر کی شخصیت ہونے سے کیا محسوس ہوتا ہے، کیا ’شکار بننے کے علم‘ نے اُنہیں مفلوج کر دیا اور اِن سب سے علاوہ کیا وہ بچوں اور عورتوں کی تعلیم کی سرگرم حامی نہیں ہیں؟ اوپرہ کی بھرپور موجودگی آپ مردوں کو دفن کر دینے کے مترادف ہو گی جو اسلامی ممالک کی ہر شے کے سیاہ وسفید کے مالک ہونا چاہتے ہیں۔ ایک سمجھدار شخص نے اوپرہ کو مسلمان عورتوں کے ایک شو کے دوران کہا، ’چاہے آپ اس بات کو پسند کریں یا نہ کریں، آپ ایک چنگاری ہو‘اوپرہ نے اُس کی بات کو رد نہ کیا۔ سیٹلائٹ چینلز ہر

اعتبار سے اسلامی دنیا کے اندر گھستے چلے جا رہے ہیں۔ چھاپہ خانہ نے پروٹسٹنٹ اصلاحات کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا تھا۔۔ علم پر بلا شرکت غیرے قابو کو ختم کر دیا تھا۔۔وہی کردار آزاد ٹی وی چینلز اسلام کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں۔

ہم اعتدال کے ساتھ آزمانے اور درست نتائج لینے کی خاطر ریڈیو نشریات کا آغاز کر سکتے ہیں۔ ایک اور چیز بھی ہے کہ ریڈیو آپریش اجتہاد کے ابتدائی مشکل دنوں میں کام کرنے والوں کی شناخت کو چھپا سکتا ہے۔ ہر کوئی نہیں چاہے گا کہ اُسے سڑکوں پر اس طور پہچان لیا جائے (اور اٹھا لیا جائے) کہ اِس شخص نے کہا تھا کہ پیغمبر محمد نے عورتوں کو اُن کا مطیع ہونے کی بجائے اُن کا ساتھی قرار دیا تھا۔ کچھ مسلمان اپنی شناخت اس حوالے سے بھی نہیں کروانا چاہیں گے کہ انہوں نے حضرت خدیجہ کے واقعات سنائے تھے، جو پیغمبر کی پہلی چہیتی بیوی تھیں، اُن سے پندرہ برس بڑی تھیں اور انتہائی امیر تھیں جو کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے والی تاجر تھیں اور انہوں نے حضور سے خود شادی کرنے کی تمنا کا اظہار کیا تھا۔ یہ بھی کہا

جاتا ہے کہ خدا کی بندگی قبول کر لینے میں بھی زیادہ ترخدیجہ کی مشاورت شامل تھی اور اس کے بعد بھی محمد اُن سے مشاورت لیتے رہے۔ یہ واقعات ممکن ہے غلط ہوں جو تاریخی طور پر درست ہونے کی بجائے قیاس آرائی ہو یا ایک بڑے آدمی کے پیچھے رہ جانے والی باتوں کا حصہ ہو۔مگر مجھے یقین ہے کہ میں اکیلی مسلمان نہیں جو لگی لپٹی کے بغیر آزاد خیالی پر مبنی مباحث کو اپنی سچائی اور موزونیت کے ساتھ نشریاتی رابطوں پر سننے کی تڑپ میں ہوں۔ نائجیریا میں انسانی حقوق کی وکیل ڈاکٹر عائشہ امام کا کہنا ہے کہ اس طرح کے مباحث کو عام کرنا بیحد مشکل ہے، ’لہذا وہ لوگ جو نئے شریعہ قانون کی قدامت پسند نوعیت کے حوالے سے بہت نامطمئن ہیں، کو بنیاد بنا کر یہ جانے بغیرتنقید کرنا حق سمجھتے ہیں کہ اُن کے پاس بولنے کیلئے کافی علم نہیں ہے (١٨)‘۔ دوسرے لفظوں میں، شبہات کو کھولنے سے اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ شبہات کو بیان کرنا اس امکان کی تائید کرتا ہے کہ آپ قبیلے کے ساتھ بھڑ سکتے ہیں۔ اگر کوئی ’اصلاح ساز‘ شبہے سے بچنے کی کوشش کرے تو اسلام کے بطور مذہب ہونے کی

تصدیق ہو گی صرف سخت دل ہونے کیلئے نہیں بلکہ نرم دل ہونے کیلئے بھی۔۔ وہ لوگ جن کے پاس سوال کرنے کی جرات نہیں ہوتی اُن کے پاس کچھ اور کرنے کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا۔

صرف اسلام سے ہی یہ اپیل کیوں ہے؟ یہ وہ سوال ہے جسے تسلیمہ نسرین نے اٹھایا ہے جو اٹل طور پر سمجھتی ہیں کہ اصلاح تبھی ہوگی جب مذہب میں تبدیلی کی جائے گی۔ جہاں تک اُن کی تشویش کا معاملہ ہے ، مسلمانوں کو مذہبی قوانین کی جگہ سماجی قوانین لانا ہوں گے ، مسجد اور ریاست کو مکمل طور پر الگ الگ کرنا ہوگا۔ مگر کیا اسلامی ممالک کو یہودی عیسائی معاشروں کی طرح انسانی معاشرے بنانے کیلئے تقلید کرنا ہو گی؟ میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ جو اِس سوال کا جواب ہاں میں دیتے ہیں، اُن کو اگلا مرحلہ درپیش ہے : حقیقت یہ ہے کہ اسلام کروڑوں عورتوں کی شناخت کا ستون کھڑا کرتا ہے ۔ اِس موقع پر مذہب کو عوامی زندگی سے مکمل باہر کر دینا بھی غیر حقیقی ہو گا ، اور یہ غیر تعمیری بھی ثابت ہو سکتا ہے ۔

یونیورسٹی آف لوئیس ول میں شعبہ مذہبیات کی پروفیسر

رفعت حسن کا ایک براہ راست تجربہ ہے۔ جس کی وہ یوں وضاحت کرتی ہیں، 'اگر آپ کسی افغان عورت سے پوچھیں، ''کیا تم انسانی حقوق کے بین الاقوامی موقف پر اعتبار کرتی ہو؟''، وہ آپ کو خالی نظروں سے دیکھے گی۔ اگر آپ اُس سے پوچھیں ، ''کیا تم خدا کو مانتی ہو؟'' وہ کہے گی، ''بالکل'' اگر آپ اُس سے پوچھیں کہ ''کیا تم اُس خدا پر ایمان لاتی ہو جو فقط مہربان اور رحم کرنے والا ہے؟'' وہ کہے گی، ''بالکل''اگر آپ اُس سے پوچھیں ، ''کیا تم اُس خدا کو مانتی ہوجو تمہاری مارپیٹ اور تم پر تشدد چاہتا ہے(۱۹)؟'' وہ فوری طور پر آپ کی بات سمجھ جائے گی اور کہے گی، ''نہیں''۔ لہذا آئیے عملی بات کریں۔ کیا ہم مسلمان عورت کو کم از کم چند بنیادی انسانی حقوق کیلئے کھڑا کرنے میں مددگار ہوناچاہتے ہییا پھر اُس کو غیر مذہبی قوانین کے تحت زندگی گزارنے کے اعتبار سے ، کیا ہم چاہتے ہیں کہ وہ الگ تھلگ ہو کر زندگی گزاریں؟ یا عداوت مول لے کر؟ یا پھر بہکاوے میں آ کر؟

اور ضروری نہیں کہ کوئی پڑھی لکھی عورت بھی نسرین کے کٹر سیکولرزم سے اتفاق کرے۔ میں حال ہی

میں ایک جوان مسلمان عورت سے آٹوا میں منعقد ایک آئینی کانفرنس میں ملی۔ یہ عورت محکمہ انصاف میں وکیل ہے ، جو مغربی دنیا میں اپنے مذہب پر بامعنی طور سے عمل کرنے کی خاطر منتقل ہوئی تھی۔ اُس کیلئے ، حجاب پہننا شمالی امریکہ میں ایک انتخاب کا معاملہ ہے لیکن اُس کے آبائی ملک تیونس میں نہیں جس نے 'ماڈرن' ہونے کے چکر میں حجاب کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔

میری اس وکیل کے ساتھ ملاقات نے مجھے یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ مسلم دنیا کو جمہوری بنانے کی غرض سے ایک اعتدال درکار ہے۔ جس پر عمل کرنا ایک سیکولر ذہن کیلئے دشوار ہے۔ ہمیں اُس کے سر کیلئے ووٹ ڈالنا ہے ، پاؤں کیلئے نہیں۔ وکیل نے ثابت کیا کہ نوجوان پڑھے لکھے مسلمانوں میں عقیدے کو سرعام بیان کرنے کی آزادی جمہوریت کی بنیادی کنجی سمجھی جاتی ہے۔ اسلام کو 'ترقی' کی خاطر دبانا استحصال کے ہی مشابہہ ہے۔ جس طرح تیونس اور ترکی مذہبی زندگی اور مادی دائرہ میں دیوار کھینچتے ہیں(۲۰)تو وہ سیکولر جمہوریت کاکمتر نام رکھتے ہوئے بات کو ختم کر دیتے

ہیں۔ ’فاؤنڈامینٹلسٹ‘ تب احتجاج کر سکتے ہیں کہ اصل مقصد کشادگی نہیں ہے بلکہ مغرب زدگی ہے۔ اور یہاں پر ایک خاص رمز ہے: فاؤندامینٹلسٹ ماہرانہ طور پر اُن لوگوں کی مایوسی کو استعمال کرتے ہیں جن کی زندگیاں سیکولر حکومتوں نے پریشان حال کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اِس فضا میں انتخابات منعقد کروانے سے اکثر اوقات صحرائی اسلام کی قوتوں کو نمائندگی کا موقع مل جاتا ہے۔ بائی بائی جمہوریت۔

اس سے پہلے کہ عرب مسلمان ملکوں میں جمہوریت داخل ہو، اِن ممالک کو نت نئے خیالات سے آشنا کیا جائے۔ جیسا کہ میں کہتی چلی آرہی ہوں، اسلام کی متبادل تشریحات صحرا کے مقابلے میں اپنی جگہ پر ڈٹ سکتی ہیں حتکہ تمام علامتی سطحوں پر بھی۔ یہ تبھی ممکن ہو گا اگر ہم متبادل تفاسیرکو اختلاف رائے کے ساتھ پیش کریں، اُن پر بحث کریں ، نشر کریں، دوبارہ نشر کریں اور مقبول عام بنا دیں۔

میں جانتی ہوں کیوں تسلیمہ نسرین زور دیتی ہیں کہ سیکولرزم ہی واحد امید ہے۔ وہ نہیں سمجھتیں کہ آپ اسلام کی اقدار کا اثبات اس کی بالا دستی کی تیکھی

فضا کو نافذ کئے بغیر کر سکتے ہیں۔ میں اُن کی بات سمجھتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ماہر بشریات، ماہر سماجیات، نفسیات دانوں، مذہبی دانشوروں اور خدا بچائے۔۔ خدا کے منکروں تک سے رابطہ کیاکہ کیسے انسان مل جل کر رہنے کی بجائے غالب آنے کی فطرت کی طرف مائل رہتا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے اوائل میں میں نے ایک تجربہ کیا۔ میں نے یاسر عرفات کی نقل اتارتے ہوئے ایک مضمون لکھا جو ایک قومی اخبار میں شائع ہوا ، میں نے وہاں کی زمین مل بانٹنے کا ایک نقطہ نظر پیش کیا جس کے مطابق مسلمان فلسطینی اپنی عزت نفس، شناخت اور وقار کو بحال رکھ سکیں۔ میں نے پیغمبر محمد کی مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی اِس بات سے تعبیر کی، ’اپنی جگہ سے دور آباد ہونے سے تحفظ کی تلاش کی ایک شکل تھی(۲۱)‘۔ یہودی قبیلے مدینہ میں ایک عرصہ سے رہ رہے تھے اگرچہ اِن میں سے اکثر اپنی عداوتیں پیغمبر اور اُن کے لوگوں کے ساتھ رکھتے تھے۔ یاسر، میں نے التجا کی کہ تاریخ سے ہی کچھ سیکھ لیں۔ کیا یہ ادلے کا بدلہ کی صورت نہیں کہ فلسطین کو یہودیوں کے ساتھ تقسیم کر لیں جو کہ اوائل کے مسلمانوں کی

طرح قتل کی بے انصافی سے بھاگ کر حفاظت کی تلاش میں پہنچے ہیں؟ میں نے اندازہ کیا کہ میں نے برف توڑنے کا آغاز کر دیا ہے۔

اگلے روز اخبار میں ٹورنٹو کی ایک معروف مسلمان شخصیت کا خط شائع ہوا۔ اُس نے لکھا، 'ہجرہ کے معنی اپنی سلامتی کی خاطر اپنی جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ پر آباد ہونے کے ہیں اور اس میں نئی جگہ کے باسیوں کی دعوت شامل ہوتی ہے یعنی اپنے زور کے ساتھ نہیں۔ مس منجی نے اپنی دلیل پیش کرتے وقت اہلیت کی آخری شرط بیان نہیں کی تھی(۲۲)'۔اُس نے اس بات کی طرف نشاندہی کی کہ مدینہ کے قبائل نے پیغمبر کو اپنے جھگڑوں کی ثالثی کیلئے آنے کی دعوت دی تھی اور مدینہ کو اُن کی حفاظت کی جگہ بنانا چاہا تھا جب پیغمبر مکہ کی سختیوں سے باہر نکل رہے تھے ۔ اُس کا عیارانہ نقطہ یہ تھا کہ عربوں نے یہودیوں کو اپنے ساتھ فلسطین میں رہنے کیلئے دعوت نہیں دی تھی، لہذا ٰ ہجرہ کی مثال یہاں پر لاگو نہیں ہوتی۔

اِس سے اگلے روز ایک یہودی نے مسلمان کو جواب دیا۔ 'اُن مسلمانوں کیلئے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اُس خطے

میں یہودیوں سے پہلے آباد تھے، میں انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ابراہیم اور سارہ ہیبرون میں تب آباد تھے اور محمد کے وجود سے بہت پہلے سارہ کا انتقال ہوا تھا۔(۲۳)‘۔ ایک طرح سے یا دوسری طرح سے، ہم سب کو درست ہونا ہے، کیا ایسا نہیں؟ میں اُس گروہ کی طرف سست روی سے چل پڑتی ہوں۔

لیکن اگر آپ درست ہیں تو مجھے غلط ہونا چاہئے؟

میں نے اسرائیل کے ایک بااثر ربی ڈیوڈ ھارٹ مین سے یہ سوال پوچھا۔ اُس نے ایک دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کیا میری شان وشوکت یا میری زندگی آپ کیلئے خطرہ ہے؟“اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، ربی ھارٹ مین نے خود اپنا جواب دیا۔ ’میرا مطلب ہے مجھے مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے، ہمہ جہتی کو دیکھنے کی خاطر میں صبح چار بجے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں، میں اپنی نیند تباہ کر دیتا ہوں۔ اتوار کو گرجاگھر کی گھنٹیاں بجتی ہیں ۔ میں کہتا ہوں، ”بہت خوب، بچے ذرا دور ہو کر بجاؤ(۲۴)“۔

اور یہ بات مجھے تب سوجھی۔۔ مذہب ایک وجہ ہے جس کی بناء پر اسرائیل کثیر المذہبی جمہوریت عربوں کے

گراں ڈیل اور ہیجان خیز خاندانی سلسلوں کے درمیان قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہودیت نے، اسلام اور عیسائیت کے برعکس لوگوں کو اپنے اندر ڈھالنے کا نظام وضع نہیں کیا ہوا۔ اِس کا آفاقیت اپنانے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ اِس کے اپنے قوانین کے تحت یہودیت کی تعلیم (غیر یہودیوں کو) نہیں دی جاتی۔'یہی وجہ ہے کہ یہودی ''منتخب شدہ''لوگ ہیں، مسلمان حقارت کا اظہار رکھنے کی طبع رکھنے والے لوگ ہیں۔ منتخب شدہ لوگوں کو اپنا آپ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوزخ ہویا اونچے پانی، اُن کی نجات تھیلے میں پنہاں ہے'۔ میں اس کو المیے پر مبنی سوءِ فہم سمجھتی ہوں۔ یہودی سمجھتے ہیں کہ وہ منتخب شدہ لوگ ہیں مگر جنت کے میووں کی وجہ سے نہیں۔اُن کو زمین پر بوجھ کے حوالے سے اور تمام انسانیت کی نمائندگی کے حوالے سے بھی چنا گیا ہے۔ کیا یہودی خود کو اُس بوجھ کو سہارنے کے لائق ثابت کر پاتے ہیں، اِس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ نجات دہندگی کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ ' تھیلے کے اندر' ہونے سے بہت پہلے، نجات کا دارومدار ذمہ دار ہونے پر ہے۔ مگر اس کے معنی کیا ہیں؟ میں تو فقط

یہودیوں کے مرکزی عقیدے کا اظہار کر رہی ہوں: ذمہ دار ہونے کا مطلب قبائلی گھمنڈ کی مزاحمت کرنا ہے۔ انسان ہونے کے ناطے، یہودی بعض اوقات تکبر کو ارفع فن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔۔ یا کم از کم بھدے انداز کے ساتھ۔ میں ویسٹ بینک کے جنونیوں کی طرف واپس جاتی ہوں جو پہاڑی کے اوپر اپنی آبادکاریوں پرڈیوڈ کے چمکتے ستاروں کو لہراتے ہیں۔ میں شیرون حکومت کی جانب سے اُن مجرموں کی گرفتاری کے مسلسل انکار پربہت دکھی ہوں جو مسلسل اپنی غیر قانونی آبادکاریاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں اُن یہودیوں کے دفاع کی آڑ نہیں لینا چاہتی جو زیتون کے درختوں کی شاخوں سے آگ سلگاتے ہیں جنہیں عرب کسانوں نے عشروں سے پروان چڑھایا ہے اور وہ خود کو یشیوا کی چار دیواریوں میں بند کر لیتے ہیں جہاں وہ علوم، فلکیات سے لے کر فلسفے تک، پڑھنے کی پابندی لاگو کر لیتے ہیں، جسے وہ میمونائیڈز کا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں۔ ذہن میں رکھئے، یہ لوگ عصری یہودیت میں کم وزن کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ جوش میں بھرے ہوئے ہیں اور اِن کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے مگر یقینی طور پر یہ مرکزی دھارے کے

لوگ نہیں ہیں۔
وہ یہودی، جو مرکزی دھارے کے سمجھے جاتے ہیں، بہت نمایاں ہیں اور بعض اوقات ذمہ داری کی حد سے بھی آگے نکلے ہوتے ہیں۔۔ جن کی ہم مسلمانوں کو پہچان نہیں ہوتی۔ اپریل ۲۰۰۲ء میں اسرائیل کے حق میں ایک ریلی کے دوران، امریکہ کے نائب سیکرٹری دفاع پال ولف وٹز نے زیتون کی شاخ علامتی طور پر فلسطینیوں کے حوالے کی۔ یہاں پر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ولف وٹز نے اعتراف کیا کہ 'معصوم فلسطینی ایک بڑی تعداد میں مر رہے ہیں اور مصائب کا بھی شکار ہیں'۔ مجمع تمسخر کے ساتھ ہنس پڑا۔ لیکن ورلڈ جیوش کانگریس کے صدر ایڈگرڈ ایم برونف مین نے کیا کیا؟ اُس نے نیویارک ٹائمز کو تضحیک کے اعتراف کے ساتھ لکھا۔ 'وہ جو تمسخر اُڑاتے ہیں، اُن کو اپنے اوپر شرمندہ ہونا چاہئے اور اُن کو تورات کی قصص المثال سے ایک آیت یاد رکھنی چاہئے۔۔ خدا اپنے فرشتوں کی سرزنش کرتا ہے جو مصریوں کے ڈوبنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، یہ مصری اسرائیلیوں کا پیچھا کرنے والے تھے جو سرخ سمندر کو پار کرتے ہیں۔ خدا اُن فرشتوں سے کہتا ہے ، یہ بھی

میرے لوگ ہیں۔ فلسطینی مشرق وسطیٰ کی اِس جنگ میں مر رہے ہیں۔ میری ہمدردیاں یقینی طور پر اسرائیل اور اُس کے لوگوں کیلئے ہیں مگر ہم سب کو آگاہ رہنا ہے کہ فلسطینی بھی انسان ہیں(۲۵)'۔

'دوسروں' کو تسلیم کرنے کا ویسا ہی اقرار برطانیہ کے چیف آرتھوڈوکس ربی ، جوناتھن سیکس ، نے 'فرق کے وقار' کے عنوان سے لکھ کر کیا۔ سیکس نے اپنی تحریر میں لکھا، 'خدا فرق کو پیدا کرتا ہے ، لہٰذا وہ جو مختلف ہے اُس سے ملنا ایسا ہی ہے جیسے خدا سے ملنا(۲۶)'۔ ربی سیکس کے مطابق، 'خدا کی شبیہہ کو کسی دوسرے میں دیکھنا جو ہم میں سے نہ ہو، ارفعٰ مذہبی چیلنج ہے (۲۷)'۔ میں مانتی ہوں کہ سیکس کو الٹرا آرتھوڈوکس ربیوں کی طرف سے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہو گا، خاص طور پر اِس نقطہ کے حوالے سے کہ یہودیت سچائی کا آخری حرف نہیں ہے۔ تنقید کے زیرِ بار سیکس کو اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کرنا پڑی، تاہم تمام پر نہیں۔ فرق کی تقدیس کے حوالے سے بھی نہیں۔ اصل میں سالوں سے ربی سیکس یہودیوں کی ذمہ داری کو دوسروں کے لئے فروغ دے رہے تھے ، اُس تمام عرصہ کے

دوران جتنا عرصہ وہ برطانیہ کے آرتھو ڈوکس یہودیوں کے عہدے کے سربراہ رہے۔
کیوں میں انسانیت کے واسطے زور دے رہی ہوں کہ یہودیت مددگار ہو سکتی ہے؟ کیونکہ جیسا کہ میں توقع کرتی ہوں کہ آپریشن اجتہاد تینوں اہل کتاب لوگوں کے درمیان مکالمے کو مہمیز کرے گا، یہ سہ فریقی مکالمہ اُسی وقت اہم ہو گا اگر تلمودی طرز کی کشادگی میسر ہو گی۔ میری مراد بذاتِ خود تلمود سے نہیں ہے بلکہ وہ رویہ ہے جسے ربی ہارٹ مین نے کیا شاندار طریقے سے بیان کیا ہے کہ ابراہیم کا خدا ''حیرت کدے اور انوکھے پن کے خدا' 'جیسا ہے۔ ایسا خدا جس کی مرضی کا آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔
بہت سارے عرب مسلمانوں کیلئے یہ خیال بہت لغو تو نہیں؟ ملائشیا کے وزیر اعظم نے کہا کہ ایسا ہی ہے۔ کوالالمپور میں ۲۰۰۲ء کی بین الاقوامی مسلمان اسمبلی میں مہاتیر محمد نے یہ بات کہنے دی کہ اسلام کی لیڈرشپ عربوں سے اَب نہیں آ سکتی کیونکہ توازن قائم رکھنے کی خاطر عرب نہیں جانتے کہ غیر مسلمانوں سے کس طرح مکالمہ کرنا ہوتا ہے (۲۸)۔ تاہم اُنہوں نے کہا کہ

ایشیا کے مسلمان اِس کے اہل ہیں۔ مہاتیر عربوں کی اثر پذیری کے حوالے سے خود ہی یہ کہہ کر مکر گئے جب انہوں نے ملائشیا کے کرنسی کے بحران کی ذمہ داری یہودیوں کے سر ڈال دی اور اپنے ملک میں شریعہ کے قانون کے بڑھتے رجحان کی حمایت کر دی۔ اچھی خبر یہ ہے کہ ملائشیا مہاتیر کا نہیں ہے اور نہ ہمسایہ ملک انڈونیشیا، جو دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا مسلمان ملک ہے ، جہاں کروڑون لوگوں نے بالی کی نائٹ کلب کے بم دھماکوں کی مذمت کی ہے ۔ درحقیقت جنوب مشرقی ایشائیوں نے ہمیشہ اسلام کو ایک ایسی درآمد وبرآمد کی بندرگاہ پر اپنایا ہے جو کثیر النسل ہے (چینی، انڈین، ملائی) اور کثیر المذہب ہے (بدھ مت، عیسائی، ہندو اور مسلمان)۔

بالکل وسط ایشیا کے لوگوں کی طرح۔ قزاقستان جو مسلمان اکثریت کا ملک ہے اور سابق سوویت یونین سے نکلاجہاں پر آمرانہ نظام کی حکومت ہے اور یہاں پر سو کے قریب نسلی گروہ مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں پر سیکولرزم زندہ ہے اور روادار صوفی ازم پھل پھول رہا ہے ۔ وہاں پر حکومت کی میزبانی میں منعقد ہونے والی

ایک کانفرنس میں یہودی اکٹھے ہوئے ، ایک ایسی کانفرنس جس میں یہودی مسلمانوں کی طرف سے ایک مشترکہ اعلانیہ برائے امن پیش کیا گیا۔ وہاں پر انگریزی زبان کے سرکاری اخبارکی جانب سے ویلنٹائن ڈے کے موقع پر جوڑوں کے لئے مبارکباد پیش کی جاتی ہے (۲۹)۔ ہم اَب سعودی ریت کے تودے پر جی نہیں رہے۔ اگر اسلام کا دل صحرائی عرب کی اقدار سے زیادہ مضبوط ہے اور اُس میں سہہ جانے کی صلاحیت ہے تو ایشیا کے مسلمانوں کو ثابت کرنے کا موقع ہے کہ وہ اپنا مکالمہ ''حیرت کدے اور انوکھے پن کے خدا ''سے جاری رکھیں۔ میرے پاس مختلف مذاہب کے آپس میں مکالمے کے حوالے سے ایک دوسری تنبیہہ بھی ہے۔ جو بھی اِس مکالمے میں حصہ لیتا ہے ، وہ اِس تبادلہ خیال کے دوران ایک طرح کے فراڈ سے بھی پریشانی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔محمد سید تانتوی کے معاملہ پر غور کیجئے ، جو الاظہر مسجد کا شیخ ہے۔ آپ الاظہر سے زیادہ باوقار کسے کہیں گے۔ فرید ذکریا نے اِسے 'عرب دنیا میں مرکزی اسلام کا بہت اہم مرکز(۳۰)' قرار دیا ہوا ہے۔ مرکزی اسلام کے اعلیٰ مذہبی نمائندہ ہونے کے علاوہ شیخ تانتوی انگلینڈ میں

تینوں مذاہب کے ایک ادارہ کے بھی کرتا دھرتا ہیں، اس ادارے کا مقصد عیسائیوں، مسلمانوں اور یہودیوں میں مفاہمت پیدا کرنا ہے۔ یہ سب اچھا دکھائی دیتا ہے مگر پیرائیہ بیان کی سطح پر سے ریت ہٹا کر دیکھتے ہیں اور تھوڑا کھودتے ہیں کہ نیچے کیا ہے۔ اپریل ۲۰۰۲ کے ایک خطبے میں ، جس کا ترجمہ مڈل ایسٹ میڈیا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے کیا، شیخ تانتوی نے یہودیوں کو 'اللہ کے دشمن، سوروں اور بندروں کی اولاد(۳۱)' قرار دیا۔ مصر میں ۱۹۹۹ء کی ایک کانفرنس جو ایٹمی حکمت عملی کے حوالے سے تھی، شیخ نے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ 'اسرائیل کے خطرے کے پیشِ نظر ایٹمی ہتھیار حاصل کر لو' اور وعدہ دیا ، 'جیسا کہ اسرائیل کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں مگر اُس کو پہلے شکست ہو گی کیونکہ اسرائیل اُس خطے میں ہے جہاں کسی کو موت کا کوئی ڈر نہیں(۳۲)'۔

یہ بیانات صاف نہیں ہو سکتے جیسا کہ ایک آدمی کے بغیر دانتوں کی بھونکار نے فلسطینی مخمصے کو پاگل پن کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ حتکہ ابھی امن کا منصوبہ ختم نہیں ہوا تھا، اِس شخص نے اِسی طرح کی باتیں

کیں۔ جنوری ۱۹۹۸ء میں شیخ نے الجزیرہ ٹی وی کو ایک انٹرویو دیا۔ وہ اسرائیل کے چیف ربی سے اُنہیں دنوں قاہرہ کے ایک اجتماع میں ملا تھا، جس نے مصری اخبارات کے کان کھڑے کر دئیے۔ 'کیا اس طرح کے اجتماعات کا کوئی فائدہ ہے؟' الجزیرہ کے ایک پیش کار نے حیرت سے پوچھا۔

'کیوں نہیں' شیخ تانتوی نے کاں کاں کی۔ ' ذاتی طور پرمیں چیف ربی پر پل پڑااور اُس پر ثابت کر دیا کہ اسلام ہی اصل سچا دین ہے۔۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص بھی دشمن سے ملنے پر اس لئے احتراز کرتا ہے کہ وہ اُس کے منہ پر تھپڑ نہ مارے، بزدل ہے، جب تک کہ کسی اجتماع میں اسلام کے معاملہ میں خدمت مقصود ہو(۳۴)'۔

کیا اس طرح ہمارے تھپڑ مارنے کے شوقین شیخ کے خیالات تین مذاہب کے کسی ادارے کی سرپرستی کر سکتے ہیں؟ کیا یہودیوں کی شدید ٹھکائی کرنے کے موقع کے طور پر؟ یا پھر یہ رنگ صرف عربوں کے کانوں کو سنانے کیلئے اپنایا گیا تھا؟ میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میری طرف سے پہلے سوال کا جواب ملنے پر ہی تین

مذاہب کے اِس ادارے نے مجھ سے قطع تعلق کر لیاکہ جب میں نے پوچھا کہ کیسے زہریلی زبان والے شیخ تانتوی کو ادارے کا سرپرست بنایا ہوا ہے (۳۴) ؟ قطع نظر اِس بات کے کہ اُس کا خدا انوکھے پن کا خدا نہیں ہے بلکہ دہرے پن کا خدا ہے۔ میں ایسی عیسائی نہیں کہ ایک گال پرتھپڑ کھا کر دوسرا گال پیش کر دوں۔ اسلام کے اصلاح پسندوں کو اصل مقاصد حاصل کرنے کی خاطر دہرے پن سے مقابلہ کرنا ہو گا۔ اِس دہرے پن کو بین المذہبی مکالمے سے دور جانا ہو گا۔

میں بین المذہبی سیدھے عمل کو یوں تصور میں لاتی ہوں۔ عمل کی فہرست میں سب سے پہلے ، ہمیں یہ مکالمہ سعودی عرب کی جیل میں نہیں کرنی، سعودی عرب جو دہرے پن کا گڑھ ہے۔ یہ مکالمہ یونیورسٹیوں میں ہونا ہوگا جہاں طلباء اور پروفیسر پہلے ہی اسرائیل کے ساتھ اختلاف کرنے کیلئے قطار میں کھڑے ہیں مگر سعودیوں کو اپنے ریشمی دوغلے منہ پرے کرنے دیجئے۔ دی ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (ڈبلیو اے ایم وائی) ایک ایسی تنظیم ہے جو سعودیوں کے پیسے سے چلتی ہے، یہ تنظیم شمالی امریکہ کی بہت ساری یونیورسٹیوں میں پمفلٹ

تقسیم کرتی رہتی ہے۔ ایک پمفلٹ بعنوان 'اسلام کے انسانی حقوق' سریلے سروں میں وہ سب کچھ بتاتا ہے جس کی اسلامی مملکت اجازت دیتی ہے اور زور فقط اِس بات پر ہے کہ 'آپ کے پاس ظالم کے خلاف احتجاج کرنے کا حق ہے'، آپ کے پاس اس بات کا حق ہے۔ یہ پمفلٹ چودہ آزادیوں کے گیت گاتا ہے جس طرح 'آمرانہ قید سے تحفظ'۔ لیکن اگر آپ کو ارادے کے ساتھ شیعہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہدف بنایا گیا تھا تب آپ آمرانہ قید کے زمرے میں نہیں آتے، کیا آتے ہیں؟ جیسا کہ میں نے دکھایا، سعودی عرب شیعہ مسلمانوں کو بغیر کسی جھجھک کے ضرر پہنچاتا ہے۔

آئیے، اس پمفلٹ کی جشن منانے والی آزادیوں میں سے ایک اور کو دریافت کریں، 'قانون کے حضور برابری'۔ تاہم اگر قانون بذاتِ خود عقیدے یا حیاتیاتی بنیادوں پر نسل پرست ہو تب 'برابری' سے کیا مراد ہے۔ اور یہ سب کچھ سعودی عرب میں ہے جہاں قانون عورت کو اپنا کاروبار چلانے سے منع کرتا ہے اُس کاروبار کو جس کی وہ مالک ہو اور جہاں عورتیں اقلیت ہوں جس کا مطلب یہ ہے اگر ریاض طلسماتی طور پر تمام بالغ سعودیوں کو

ووٹ دینے کے حق کا اعلان بھی کر دے تب بھی یہ حق فقط مردوں کیلئے ہو گا۔ آخر میں خود پڑھئیے کہ ڈبلیو اے ایم وائی عورتوں کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ ’عورتوں کو دبانے کی اجازت نہیں ہے۔۔۔عورتوں کی عزت اور عصمت کا ہر حال میں احترام واجب ہے۔‘ایک سیکنڈ توقف کیجئے۔ عزت کا خبط گاہے بگاہے ہونا بذاتِ خود عزت کو کچلتا ہے۔ ہم اصل میں کیا پڑھ رہے ہیں تب تو عزت کی زیادتی کا خود ہی تعین کرنا طے ہے۔ ہاتھ کی یہ شعبدہ بازیاں ’ضمیر اور ایمان کی آزادی‘ اور ’مذہبی جذبات کا تحفظ‘ کے نام سے یہ آزادیاں ڈبلیو اے ایم وائی کی نمائش کردہ اور صحرائی اسلام کی پیش کردہ قطرہ قطرہ کر کے ٹپک رہی ہیں۔ اِن طلباء اور پروفیسروں کیلئے ، جوتنقیدی مفکرین کا بزعم خود روپ دھارے ہوئے ہیں کیونکہ وہ قدم بہ قدم صیہونیوں کے ساتھ جا سکتے ہیں، میرا ایک چیلنج ہے ، سعودیوں کی زبان لے لیجئے ، جو کچھ بھی نہیں ہیں اگر وہ سربند عقل کے آقا نہ ہوں۔

یونیورسٹی میں کٹر عیسائی، یہودی اور مسلمان طلباء کے درمیان اصل بین المذہبی اقدام یہ ہو گا اگر مکہ میں

اِن سب کے مشترکہ 'ابراہیمی حج' کا انتظام کیا جائے۔ ابراہیم اِن تینوں مذاہب کے صرف جنم داتا ہی نہیں تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم وہ پیغمبر تھے جنہوں نے (اپنے بیٹے اسمٰعیل کے ساتھ، یہ ایمان ہے) کعبہ کی تعمیر نو کی۔۔ اُس کالے پتھر کی جس کے گرد حج کا بیشتر حصہ عملی طور پر طواف کرتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جس کے بارے بتایا جاتا ہے کہ یہاں پیغمبر محمد نے کافر بتوں کو توڑ دیا تھا، اگرچہ انہوں نے راکھ میں دبے صلیبی نشان کو بازیاب کیا تھا۔ صرف مسلمان ہی کعبہ میں عبادت کر سکتے ہیں، آپ کا یہ کہنا ہے؟ تب مسلمان کیا ہے؟ میں نے حال ہی میں انٹرنیٹ پر بین المذہبی گفتگو کے حوالے سے خفیہ طور پر کچھ معلومات لیں اور اس سوال پر کشادہ دلی کی سطح کو دریافت کیا۔عاصم نام کا گفتگو میں شریک ایک دوسرے گفتگو کرنے والے سے کہتا ہے، جو اپنے آپ کو میٹ کیب بتاتا ہے، 'اگرچہ تم بطور یہودی اسلام کو زندگی میں عمومی طور سے اپنانے کی وجہ سے مسلمان نہیں ہو مگر میں تمہیں مسلمان اِس اعتبار سے مسلمان تصور کروں گا کہ تم نے خود کو خدا کے حوالے کیا ہوا ہے اور تمہاری خواہش ہے کہ تم

خدا کے احکامات پر عمل کرو۔ لہذاٰ شاید ایسا ہے کہ میں یہودیت کے قریب ہوں اور تم اسلام کے نزدیک کیونکہ ہم ایک خدا پر ایمان لاتے ہیں جو ابراہیم پر بھی آشکار ہوا ، لہذاٰ ہم ایک نقطے سے دور نہیں ہیں(۵ ۳)!' ایسے مباحث، جو ابراہیمی حج کیلئے اثرپذیری رکھتے ہیں ، مکہ میں آفاقی جذبہ لا سکتے ہیں۔۔ ایسی گلوبالزم جو یروشلم، روم اور جنیوا کو تابناک کر دے (پروٹسٹانزم کا ایک روحانی جال بُن سکے)۔

تاہم سعودیوں کو اس طرح کے ابراہیمی حج پر اعتراض ہو گا، انہیں آخرکار اِس کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کو مان لیں تو ویزہ کی شرط ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہوئے ایک ایسا پسندیدہ کام اُن کے ہاتھ میں ہے جو انہیں اپنی بادشاہت کے اوپر پردے گرائے رکھنے کی سہولت دیتا ہے ، بس اِن پردوں کو نہ دھوئیں۔ وہ اپنے دھوکہ بازوں سے بار بار پکارے جائیں گے۔ یونیورسٹی کے طلباء بھی پکاریں گے اپنے آراستہ ڈی ٹیکٹرز کے ساتھ سعودی عرب کے بارے اپنے مباحث سمیت۔

میں ابراہیمی حج کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ایک بہتر صورت پیش کرتی ہوں، شمالی امریکہ کے مسلمان طلباء

کو ایرانی طلباء کے ساتھ رابطہ کرنا چاہئے۔ ایرانی نوجوان نسل کی حیرت انگیز حد تک ایک بڑی تعداد باغی دانشوروں کی ہے۔ 'امریکہ مردہ باد' کے ایک جہان سے پرے اِن طلباء کے بینرز پکارتے ہیں، 'آمریت مردہ باد' (جس سے اُن کی مراد مذہب پر علماء کی آمرانہ حاکمیت ہے)۔ نوجوان ایرانی نسل توازن برقرار رکھنے کی خاطر اسرائیلی ریڈیو سنتی ہے اور اُن کی بڑی تعداد دیگر مسلمانوں کی نسبت دنیا سے اپنا ناطہ جوڑنے کی خاطر انٹرنیٹ کو استعمال کرتی ہے (۳۶)۔ اس کے علاوہ شیعہ ہونے کے ناطے اُنہیں سعودی عرب کے سنی آقاؤں کو حق قرار دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایران کے آیت اللہ سعودی طرز کی دہشت کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اکثر ہوتے ہیں اور حزب اللہ اُن کی شکرگزار رہتی ہے، مجھے اِس بات کا یقین ہے۔ تاہم یہ آیت اللہ ہی ہیں جن کے خلاف ایرانی طلباء بھاری بھر کم اور بڑے بڑے غیر متشدد جلوس نکالتے رہتے ہیں۔

اصل میں، یہ ایک انتیس سالہ ایرانی دوست ہی ہے جس نے مجھے مارٹن لوتھر کنگ کا 'برمنگھم جیل سے خط'

ای میل کیا تھا۔ میں نے یہ خط پہلے کبھی نہیں پڑھا تھامیرے دوست نے اِس خط پر پیش لفظ کے طور پر لکھا: شمالی امریکہ میں جب تمہارے ساتھی سعودی عرب کو ننگا کرتے ہوئے یہ خوف کھائیں کہ اِس بات سے مسلمان خار کھائیں گے تو انہیں برمنگھم کے روشن خیال مسلمان یاد دلانا جو کنگ کو اُن کے شہر میں غیر ضروری تناؤ پیدا کرنے سے روک رہے تھے۔ کنگ نے اُن سے کہا تھا، 'میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں لفظ ''تناؤ'' سے ڈرتا نہیں۔ میں نے انتہائی سرگرم رہتے ہوئے متشدد تناؤ کی مخالفت کی ہے لیکن غیر متشدد تناؤ ایک تعمیری صورت ہے جس کا آگے بڑھنا بہت ضروری ہے۔ بالکل جس طرح سقراطوں نے محسوس کیا تھا کہ ذہن میں تناؤ پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ یہ افراد کو قصے کہانیوں کی غلامی اور آدھے سچ کی سطح سے اوپر اٹھ کر پابندیوں سے مبرا تخلیقی تجزیے کے عالمِ خیال اور معروضی جانچ کی طرف لے جائے (۳۷)، ہمیں معاشرے میں تناؤ کی صورت پیدا کرنے کیلئے غیر متشدد تناؤ کے پیچھے پڑ جانا چاہئے جو انسان کو تعصب کی تاریک راہوں اور نسلی منافرت سے اٹھا کر فہم اور اخوت کی

شاہانہ بلندیوں تک لے جائیے‘۔ میری دعا ہے کہ آپریشن اجتہاد اسی طرح اپنا اثر چھوڑے۔
اَب اا پریشن اجتہاد کے چند ’بم‘ دیکھئے ۔۔ بنیادی اور بے باک سوالات جو سب کیلئے ہیں۔
* خواتین کے اختیار کے حوالے سے مباحث میں پوچھا جائیگا: کیا خدا ، جو اپنے آدھے عبادت گزاروں کو بطور ہتھیار مسلط کر دے ، سے محبت کی جا سکتی ہے؟ کیا اس طرح کی محبت معنی رکھتی ہے؟
* میڈیا کے حوالے سے مباحث میں پوچھا جائیگا: کیا (آسمانی) کتابوں کی موجودگی مادہ پرستی کے کھوکھلے خداؤں اور لغزش پا ٹی وی کو لگام دے پائے گی؟ کیوں گزشتہ ایک ہزار برس سے پوری عرب دنیا میں اتنی کتابوں کا ترجمہ نہیں ہوا جتنی کتابوں کا سپین میں ہر سال ترجمہ ہوتا ہے؟ کیا ایسا نہیں کہ لوگ جتنا باہر کے لوگوں کو جانیں گے اُتنا وہ اپنا احتساب کر سکیں گے؟ دوسری طرف، کیوں مصر مغربی مارکیٹوں کوجابر اصفور کی کتاب ’انتہا پسندی کے خلاف‘ یا علی سالم کی کتاب ’اسرائیل کا سفر‘ کے انگریزی تراجم سے بھر نہیں دیتا ، اِن دونوں کتب میں مسلمانوں کے اندر

رواداری دکھانے کی گنجائش موجود ہے؟ کیا ہر آخری مغربی ناشر نے اِن کتابوں کو مسترد کر دیا؟

* ابراہیمی حج کے حوالے سے سعودی عرب سے یہ پوچھاجائیگا: کیوں سعودیوں نے اپنی سرزمین پر عیسائیوں کو اپنی عبادت کی اجازت نہیں دے رکھی جبکہ خود سعودی واشنگٹن ڈی سی میں مسلمان اور عیسائیوں کی تفہیم کے ایک ادارے کو پیسہ فراہم کرتے ہیں؟ کسے اِس 'تفہیم' کی ضرورت ہے؟ اس ادارے سے سعودیوں نے اپنے گھر کیلئے کیا سبق حاصل کیا؟

میں یہ نہیں کہہ رہی کہ ایسے سوالات آمریت کو ایک ہی ہلے میں گرا دیں گے۔ میں جو بونا چاہتی ہوں اُس کا ثمر ایک لمبے عرصہ کیلئے بتدریج آنے والا ہے۔ جب حکومت کی نا اہلیت اور عوامی سہولتوں کیلئے درکار رقوم مہیا نہ ہوں گی تو ٹیکس گزار خواتین اپنے پیسے کا حساب چاہتے ہوئے تنقید کریں گی، اور جب خواتین اور مذہبی اقلیتوں کے خلاف بین الاقوامی نسلی منافرت اور 'دوسروں' کے ساتھ زیادتیوں کو ہمت کر کے باآواز بلند سوال اٹھا کر دن کی روشنی میں لایا گیا تو پھر مسلمان بہتر طور سے جمہوریت کی منتقلی کیلئے تیار ہو جائیں

گئے۔

میں اِس آخری نتیجہ کیلئے دعا گو ہوں: کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپریشن اجتہاد بین الاقوامی برادری کو قتل عام کی وجوہات پر انگلی اٹھانے اور روکنے کیلئے بڑھاوا دے (۳۸)۔ جب تک ہم مکمل طور پر تفتیش نہ کر لیں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس حد تک وہابی کٹر پن نے عربوں کے قبضے میں سوڈان کی نسلی اور فرقہ واریت تشدد کی کھیتی تیار کی ۔ اسامہ بن لادن افغانستان جانے سے پہلے سوڈان میں تھا۔ البتہ ہمارے پاس اِس بات کی تفتیش کرنے کیلئے کافی معلومات ہیں امریکن اینٹی سلیوری گروپ کے چارلس جیکبس کی رپورٹ کے مطابق سوڈان میں بیس لاکھ لوگوں کا قتل عام ہوا تھا۔ 'ہزاروں لوگ لاپتہ ہو چکے ہیں اور ایک لاکھ۔۔۔جبری بھوک میں رکھے گئے (۳۹)'۔ یہ ظلم و ستم کیوں جاری و ساری ہے؟

آج تک کسی بین الاقوامی ادارے نے اس بداعمالی سے پردہ نہیں اٹھایا اور واضح انصاف کو بروئے کار نہیں لایا گیا تاکہ اتنے وسیع پیمانے پر نفرت انگیز جرائم کو روکا جائے۔ اقوام متحدہ روانڈا میں قتل عام کو پہلے سے

روکنے کا خواہشمند نہ تھا۔ دیکھا جائے تو یو این او اصولوں سے زیادہ پروٹوکول کے ساتھ کام کرتی ہے ، فاشسٹ حکومتوں کے ساتھ ویسا ہی اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے جیسا جمہوری حکومتوں کے ساتھ، کیا یو این او سعودی عرب کی وہابی ازم پر انکوائری کرے گی؟
بمشکل۔ جیسا کہ انٹرنیشنل کریمنل کورٹ نئی نئی معرضِ وجود میں آئی ہے ، اس کا کردار دفاعی کی بجائے سخت فعال ہونا چاہئے۔ بہرکیف، بہار ۲۰۰۳ تک ، کورٹ نے انسانیت کے خلاف جرائم کی مد میں دوسو کے قریب شکایات نوٹ کی ہیں۔ کیوں عدالت نے وہابی ازم کی تفتیش کیلئے وکیل استغثناء مقرر نہیں کیا جبکہ نہ امریکہ اور نہ سعودی عرب نے اس عدالت کو قبول کیا ہے ؟
ابھی تک مذہبی بنیادوں پر ہونے والے قتل عام کو بیچ میں روکنے کیلئے ہمیں اپنے ملکوں کے عدالتی نظام سے کام لینا ہو گا۔ جن دنوں میں یہ لکھ رہی ہوں، برطانیہ کی کریمنل کورٹس نے سعودیہ کے تربیت یافتہ اور لندن میں مقیم عالم کی سزا سنانے میں کامیابی حاصل کی ہے جو یہودیوں، ہندوؤں اور امریکیوں کو قتل کرنے کی وکالت کر

رہا تھا(۴۰)۔ اس طرح کی انگلینڈ میں یہ پہلی سزائے جرم ہے۔ اسے آخری نہیں ہونا چاہئے۔
میں مانتی ہوں کہ بعض اوقات عدالتوں سے رجوع کرنا اسلحے کے برابر چوٹ جیسا محسوس ہونا ہوتا ہے۔
فرانس میں، جیسا کہ میں نے اِس خط کے شروع میں لکھا تھا، چار مسلمان گروہوں نے ایک مصنف مائیکل ہولیبیک پر توہین کا مقدمہ کھڑا کرنے کی کوشش کی کیونکہ اُس نے ایک ادبی مجلہ کو کہا تھا کہ 'اسلام سب سے زیادہ احمقانہ دین ہے'۔ 'جب آپ قرآن پڑھتے ہیں، آپ اسے پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ بائیبل کم از کم خوبصورت ہے کیونکہ یہودیوں کا ادبی معیار اچھا ہے(۴۱)'۔ کسی چیز کے بارے کسی شخص کی رائے جو اُس کو اطمینان بخشے، کو بنیاد بنا کر جج نے اِس مقدمے کو خارج کر دیا تھا۔ اٹلی کی صحافی اوریانہ فلاچی اپنے تیکھے مضمون 'غیظ و غضب اور فخر' میں اظہار رائے کی آزادی کا استعمال کرتے ہوئے اسی قسم کی لڑائی سے گزریں۔ اِس مضمون میں، وہ مسلمان تارکینِ وطن کے منہ پر ریت پھینکتی ہیں('یہ بہت زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں') اور اُن کے یورپی میزبان ('اطالوی

اب بچے پیدا نہیں کرتے (۴۲)، وہ گاؤدی ہیں‘) ۔ یہ عدالتی مقدمہ بھی برخاست ہو گیا۔
سعودیوں کے خلاف جنگی جرائم تجویز کرتے ہوئے کیا میں اُن کا تمسخر تو نہیں اُڑا رہی جو ہولیبیک، فلاچی، نسرین اور رشدی کا منہ بند کرنا چاہتے ہیں؟ خدارا ، ایسا نہ سمجھئے۔ سعودیوں کو چیلنج کرنا اسلام کو نیچا دکھانا نہیں ہے بلکہ ایک بوجھ کو صحرا میں اتارنا مقصود ہے۔ اور اُن کو چیلنچ کرنے سے عوام الناس کی تباہی کے دوسرے راؤنڈ سے بچنے میں مدد مل سکتی ہے جبکہ بہت سوں کو بچانے سے قومی سلامتی قائم رہ سکتی ہے۔ قرآن کی کس نوعیت کی تفہیم کی اجازت ہے اور کس نوعیت کی نہیں، اَب ہر ایک کو اِس بات سے سروکار ہے۔
آپریشن اجتہاد کا ایک منصوبہ جاتی زور امریکہ اور یورپی اقوام کیلئے ہو گا۔ اِس کو ایک ساتھ آگے بڑھانے کیلئے ، اُن کو اپنے مابین خلیج پاٹنے کیلئے دور تک جانا ہو گا۔ ’ جی ہاں، مارکیٹ کی معاشیات تک، مارکیٹ کے سماج تک نہیں(۴۳)‘، فرانس کے سابق وزیر اعظم لیونل جوسپین گرجے۔ آپریشن اجتہاد بذاتِ خود مارکیٹ اور

سماج میں توازن قائم کر دے گا۔ مسلمان خواتین کو چھوٹی سطح کے کاروبار نواز نے سے اُن کی جمالیات پر ’چھوٹا خوبصورت ہے‘ کا اثر پڑے گا جو بڑے کاروباروں کے کلچر کو پسند نہیں کرتے۔ آپریشن اجتہاد مقامی لوگوں پر توجہ دے گا، بڑے صنعتکاروں پر نہیں، تاکہ ضرورت اور لالچ میں امتیاز وضع کرے۔ اور یہ مسلمانوں کو زندہ رہنے کیلئے مستقبل فراہم کرے گا نہ کہ مرنے کیلئے ماضی۔ کیا یہ مقاصد یورپی یونین کے سر گرم بائیں بازو والوں کی تشفی نہیں کرتے ؟ حقیقت یہ ہے کہ اِن میں اکثر سرمایہ داری سے نفرت کرتے ہیں جسے وہ مادہ پرستی کہتے ہیں۔ کیوں یہ نظریاتی اشرافیہ مسلمانوں کے موقع کو گنوانا چاہتی ہے؟ کیا اس طرح کی خود غرضی نئی نوآبادیت کے مترادف نہیں ہے، ایک خاص طبقے کو خوش کرنے کیلئے کروڑوں انسانوں کے بہبود کو قربان کر دیا جائے؟ کم از کم بڑی شہرت والا ورلڈ بینک آپریشن اجتہاد کے کچھ اغراض و مقاصد خریدنے کیلئے ظاہر ہوا ہے۔ نکولس سٹرن جب اِ س کے چیف ماہر معاشیات تھے ، نے کہا تھا،’مرد اور عورت میں برابری آزادی کی نشوونما کیلئے کلیدی نقطہ ہے‘۔

جب عورتیں متحرک ہو جاتی ہیں، 'تو شواہد بتاتے ہیں کہ تعلیم، صحت، پیداوار، قرضے اور حکومت بہتر طور پر کام کرتے ہیں(۴۴)'۔ قصہ مختصر، بدعنوانی کم ہو جاتی ہے۔
اسلامی دنیا کی عورتیں، مغربی حکومتیں، آزاد خیال مسلمان، اچھائی کے خواشمندیہودی اور عیسائی ، طالبعلم، سماجی کارکن، ورلڈ بینک، اوپر۔۔ آپریشن اجتہاد کا کوئی بھی رنگ ہو سکتا ہے۔اگرچہ اس کو متواتر امریکی وسائل کی ضرورت رہے گی۔ آئیے تیل کی سیاست میں گھستے ہیں۔
ہم میں سے اکثر اٹھتے بیٹھتے ، آتے جاتے گالیاں دیتے ہیں کہ واشنگٹن کی عرب مسلمان دنیا کیلئے نرم رو جمہوریت فقط امریکہ کی تیل کی سپلائی کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ سچ بھی ہے تو بھی تیل امریکہ کو آپریشن اجتہاد کی حمایت میں مشکل میں نہیں ڈالے گا۔ خاص طور پر امریکہ تب تک یہ اچھا سودا قائم رکھے گا جب تک وہ توانائی مشرق وسطیٰ کے اندر کی بجائے باہر سے لے رہا ہے اور تب تک بھی جب تک اُس کے پاس توانائی کے بے شمار متبادل ذرائع نہیں ہیں۔ بلاشبہ تیل کی اِس

حقیقی سیاست کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ یہاں پر ریاض کی سیاست کا المیہ بھی تو ہے۔
میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ واشنگٹن دو طرح سے بندھا ہوا ہے۔ ایک طرف تو ڈرامائی طور پر سعودی تیل کی کم ہوتی آمدن بادشاہ کی حیثیت، بطور وظیفے دینے والے اور علماء کا حوصلہ بندھانے والے ، کو بھک سے اُڑا کر رکھ دے گی۔ اگر ایسا راتوں رات ہوتا ہے تو انتہا پسند ملا ،جو پہلے ہی مغرب کے خلاف کف اڑاتے رہتے ہیں ، خطرناک رخ اختیار کر جائیں گے اور اُن کو مزید انتہا پسند بننے کا بہانہ مل جائے گا۔ دوسری طرف واشنگٹن صحرا کو معاشی پلاننگ کاپانی دینے پر مجبور ہے ، چاہے یہ سست روی سے ہی ہو۔ ایسا نہ کرنے سے امریکیوں کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کچھ دیگر خاموش اقوام کو بھی، اگر سعودی تیل خشک ہو جاتا ہے۔ اور تیل خشک ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے مملکت کی فی کس آمدن تئیس ہزار ڈالر سے کم ہو کر سات ہزار ڈالر آ گئی ہے۔ سعودی عرب میں برتن مانجھنے کا اعزاز پانے کیلئے بنگلہ دیشی مسلمان(۴۵) دو ہزار ڈالر ریاض کو ادا کرتے ہیں (جو

اُن کی آمدن کے پہلے سال کا چار بٹا پانچ حصہ ہے) اور اُس کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کی تجوریاں بھرتے ہیں۔ اکثر سعودی نوجوان ہاتھ کے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے ، ابھی اِن کی دانشورانہ صلاحیتیں نکھری نہیں کیونکہ اُن کے اسکول مذہبی تعلیمات سے بھرے ہوئے ہیں،ایندھن کے ڈھانچے پر مصنوعی طور پر قائم سعودی معاشرہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا ، امریکہ بھی ساتھ دینے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب آپریشن اجتہاد کا آغاز ہو جائیگا تب آپریشن اجتہاد سعودی معیشت کو متنوع کر دے گا تاکہ ہر کوئی وقار، تحفظ اور آزادی کے ساتھ فوائد حاصل کر سکے۔ جن میں خواتین بھی شامل ہیں جن کے متوقع کاروبار صحرائی اسلام کو اُس کی جڑوں تک ہلا کر رکھ دیں گے۔

ضروری نہیں کہ سعودی عرب ہی آپریشن اجتہاد کا نقطہ آغاز ہو۔ بتدریج رواں دواں اس کا نقطہ آغاز جنگ کے بعد والا عراق ہو سکتا ہے۔ عراقی مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ شرح خواندگی پانے والے لوگ ہیں۔

تاریخی طور پر بھی اس معاشرے نے عورتوں کے کردار کو قبول کیا ہے۔ مگر آئین تیار کرلینے اور انتخابات کروا

لینے کا مطلب یہ نہیں کہ تہذیب کے پُرامن احیاء اور معاشی رشک کو جنم دیا ہے۔ دولت کی پیداوار کسی نئی جمہوریت کیلئے خطرے کا نشان بن جاتی ہے کیونکہ کاروباری طبقہ ہی جو سرکار کو ٹیکس دیتا ہو، بدلے میں مجبور کرتا ہے کہ لوگوں کے مسائل حل کرنے کیلئے ادارے بنائے (۴۶)۔

ذہن میں ایک اور بات رکھئے: نازیوں کی وبا پہلے آزادانہ انتخابات کے ذریعے ہی پھیلی تھی۔ ایڈولف ہٹلر نے جرمنی میں انسانی تذلیل کے احساسات کو ہی ہدف بنایا تھا اور اُن کو بعد از جنگ کی معاشی ابتری کی صورتحال کے ساتھ لاگو کر دیا تھا۔ ہمیں عراق کو اِس نقطہ پر نہیں لے جانا چاہئے۔ اور یہ باآسانی ممکن ہے۔ یہ فکر نہ کیجئے کہ باتھ پارٹی نے نازی پارٹی کا کردار ادا کیا؛ میں پاکستان کے اخبار ڈان کے صفحہ اول پر چھپنے والی ایک تصویر سے بہت ڈر گئی ہوں، جب عراقی آزادی کا آپریشن شروع ہوا تھا۔یہ تصویر دانت نکالتی فلسطینی عورتوں کی ہے جنہوں نے سفید خرگوش کے ٹکڑے کئے ہوئے ہیں جو عراق اور اسلام کے دفاع کیلئے اُن کی ٹریننگ کا حصہ ہے، خون واقعی ہی اُن کے

ہاتھوں پر تھا (۴۷)۔ یہ عورتیں کیا حاصل کر پائیں گی اس سے کہیں زیادہ تعمیری اگر آپریشن اجتہاد دن کی روشنی میں دکھائی دیتا ہے۔

اس اثناء میں، ایک اور گروہ اسلام میں اصلاحات کے امکانات کا اظہار کرنے کیلئے تیار بیٹھا ہوا ہے: مغرب کے مسلمان۔ ہمیں شہری آزادیوں پر عمل کرنے کی آسائش حاصل ہے، خاص طور پر اظہار رائے کی آزادی جو قبائلی رجحانات کو بدل سکتی ہے۔ کیا ہم اُس آزادی سے کام لے رہے ہیں؟ کیا غیر مسلمانوں کی اکثریت ہمیں ایسا کرنے کیلئے چیلنج دے رہی ہے؟

حوالہ جات:

۱۔ Zainab Salbi, "Oprah," October 7, 2002.
Salbi's organization, Women for Women International, can be found at www.womenforwomen.org

۲۔ Eric Boehlert, "The Arab baby boom," www.salon.com, October 18, 2001

۳۔ United Nations Arab Human Development

Report 2002 (New York: UNDP/RBAS, 2002), p. 37

۴۔Ibid., "The Arab World: Let the Numbers Speak!" p. 3

۵ ۔ Peter Stalker, The No-Nonsense Guide to International Migration (Toronto: Between the Lines, 2001), p. 38

۶ ۔Maggie Black, The No-Nonsense Guide to International Development (Toronto: Between the Lines, 2002), p. 66

۷ ۔ Maggie Black, Ibid., p. 65

۸ ۔مارکسسٹ ہونے کے باوجود طارق علی اپنی کتاب The Clash of Fundamentalisms میں تسلیم کرتے ہیں ، ''شروعات سے ہی اسلام نے تجارت کو واحد اچھے پیشے کے طور پرلیا'' (صفحہ ۲۹)۔ بلاشبہ قرآن عملی طور ۴:۲۸ میں تجارت کو مقدس بناتا ہے ، ''ایمان والو، اپنی دولت کو اپنے اوپرخودنمائی کی غرض سے ضائع نہ کر دو بلکہ اِس کو باہم رضامندی کے ساتھ آپس میں تجارت کیلئے برتو''۔

۹ ۔ Bill Clinton, "The Struggle for the Soul of

the 21st Century," New Perspectives Quarterly, Spring 2002. Download at www.digitalnpq.org

For more information, read Hernan de Soto's- ١٠ The Mystery of Capital: Why Capitalism Triumphs in the West and Fails Everywhere .(Else (New York: Basic Books, 2000

Conversation with Peter Schaefer, Executive- ١١ Director of the Institute for Liberty and Democracy (Washington office), February 12, 2003

Elaine Kamarck, "Freedom through Islam,"- ١٢ Toronto Star, February 15, 2002

١٣-قرآن، ۴:١٢٨

Richard Haass, "Towards Greater -١۴ Democracy in the Muslim World" (speech to the Council on Foreign Relations, Washington, D.C.), December 4, 2002, p. 6 of notes

www.wluml.org, found under "Part One:- ١۵ ".The Context of our Struggle

www.manartv.com. Click on "Programs," -١۶ ".then on "Perspective

۱۷ - David Hoffman, "Beyond Public Diplomacy," Foreign Affairs, March-April 2002, Volume 81, Issue 2, p. 5 of online version

۱۸ - Dr. Ayesha Imam on "Metro Morning," CBC Radio (Toronto), December 3, 2002

۱۹ - Riffat Hassan as quoted by Elaine Kamarck, "Freedom through Islam," Toronto Star, February 15, 2002

۲۰ نے حجاب اوڑھا ہوا ہو۔ مزید تفصیلات کیلئے پڑھئیے۔ Julie Salamon, "Seeking a Global Faith in the Details," New York Times, May 9, 2002

۲۱ ۔میں نے یہ ترجمہ اِس حوالہ سے لیا ہے۔ Albert Hourani, A History of the Arab Peoples (New York: Warner Books, 1991), p. 17

۲۲ - Mohamed Elmasry (President of the Canadian Islamic Congress), "Another leaf," Globe and Mail letters, February 6, 2002

۲۳ - Sheila Dropkin, "Wake Up Arafat," Globe and Mail letters, February 7, 2002

۲۴ - Interview with Rabbi David Hartman,

Jerusalem, July 9, 2002

Edgar M. Bronfman, "The Boos: A Mideast ـ ۲۵
Moment," New York Times letters, May 14, 2002

meet God.'" Source and note: Rabbi ـ ۲۶
Jonathan Sacks, The Dignity of Difference: How to Avoid the Clash of Civilizations (London, New York: Continuum, 2002), p. 59
ممکن ہے تھیلے آرتھوڈوکس یہودیوں سے زیادہ فرق ظاہر کرتے ہوں، مگر وہ اُن سب سے زیادہ اختلاف کو برداشت کرتے ہیں۔ یروشلم کے مئیر یوری لوپولیانسکی ایک الٹرا آرتھوڈوکس یہودی ہیں، جنھوں نے انتخاب اِس نعرہ کے ساتھ لڑا، ”جیو اور جینے دو“۔ وہ جیت گئے۔ اپنے لفظوں کے ساتھ سچائی کا ثبوت دیتے ہوئے مئیر لوپولیانسکی نے ۲۰۰۳ء یروشلم کے اندر ہم جنس پرستوں کی پریڈ کی حمایت کرتے ہوئے کہا، ”ہر کسی کی پریڈ ہوتی ہے“۔ اُس نے قدامت پسند احتجاجیوں کو یاد دلایا کہ اُسے بھی کسی پریڈ میں جانا ہے۔ جو اُس کا حق ہے۔ مزید حوالہ دیکھئے۔ Mitch Potter, "Cavalcade of rainbow flags raises tension in Jerusalem,"

Toronto Star, June 21, 2003
Rabbi Jonathan Sacks, Ibid., p. 60۔ ۲۷
۲۸ ۔ کوالالمپور کانفرنس میں شرکت کرنے والے وفد میں شریک میرے دوست طارق فتح نے مجھے بتایا۔
Lily Galili, "Liberal Islam in Asiatic dress,"۔ ۲۹
Ha'artezdaily.com, February 23, 2003
Fareed Zakaria, The Future of Freedom:۔ ۳۰
Illiberal Democracy at Home and Abroad (New
(York: W.W. Norton, 2003
MEMRI Special Report 150 Arab" ۔ ۳۱
Antisemitism," No. 9, November 1, 2002میرا ایک دوست عربی زبان کی باریکیوں کا ماہر ہے جس نے دوبار MEMRI کے ترجمے کو چیک کیا۔
MEMRI نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ''مارچ ۲۰۰۳ء میں الاظہر یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ فار اسلامک ریسرچ نے عہدِ حاضر کے یہودیوں کو 'سور اور بندر' نہ کہنے کیلئے سفارشات مرتب کیں۔ جس میٹنگ میں اِن سفارشات کو پیش کیا گیا، اُس اجلاس کی صدارت سنی اسلام کے اعلیٰ مرتبت عالم ، الاظہر کے شیخ،محمد سید

تانتوی نے کی۔ غور فرمائیے کہ مذمت کے استعمال کے خلاف یہ فقط سفارشات تھیں، فرمان جاری نہ ہوا۔ اس طرح کے موقع پر اگر فتویٰ کی ضرورت ہو تو وہ فتویٰ کہاں ہے؟ مزید تفصیلات کیلئے دیکھئے۔ Yigal Carmon, "Harbingers of Change in the Antisemitic Discourse in the Arab World," MEMRI Inquiry and Analysis Series 150 No. 135. Download at www.memri.org

۳۲۔ MEMRI Special Dispatch Series 150 No. 59, November 19, 1999

۳۳۔ MEMRI Special Report 150 No. 2, February 8, 1998

۳۴۔ میں نے پہلی ای میل ۲۲فروری ۲۰۰۳ء کو بھیجی۔ دوسری اور ہنوز جواب طلب ای میل ۲۴فروری ۲۰۰۳ء کو روانہ کی۔ اُس ای میل میں میں نے سڈنی شپٹن ، تین مذاہب کے فورم کے کوآرڈینیٹر، کو لکھا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ میں اس ادارے کے سربراہ کیلئے شیخ تانتوی کے نام پر اُلجھن کا شکار ہوں۔ مڈل ایسٹ میڈیا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق، شیخ نے یہودیوں کے خلاف

(اسرائیل کی بات نہیں) خاصے بھڑکا دینے والے کلمات
کئی سالوں سے آج تک، اوسلو کے امن منصوبے اور اُس
کے بعد، کہے ہیں۔ حال ہی میں گزشتہ اپریل (۲۰۰۲ء)
میں اُس نے یہودیوں کو ’اللہ کے دشمن ، سوروں اور
بندروں کی اولاد‘ کہا ہے۔ تین مذاہب کے فورم کی نوعیت
کی بناء پرادارہ کیوں ایک ایسے شخص کو سرپرست
رکھے ہوئے ہے جس کے خیالات اس طرح کے ہوں؟ میں
کشادگی کے جذبے کے تحت یہ پوچھ رہی ہوں اور آپ کے
جواب کی منتظر ہوں۔“ مجھے ابھی تک اِس کا جواب
نہیں ملا۔

۳۵ ۔ Posting on the Middle East Abrahamic Forum, September 11, 2002. [Visit the forum.]انگریزی کے حصہ میں اِس حوالہ کو کلک کر کے فورم کی ویب سائٹ کا جائزہ لیجئے۔

۳۶ ۔بلاشبہ انٹرنیٹ پر ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے ’بلاگز‘نے جمہوریت نواز احتجاج پر خاطر خواہ اثر چھوڑا ہے۔

۳۷ ۔ Martin Luther King Jr. "Letter from Birmingham Jail," April 16, 1963. Download at www.nobelprizes.com

۳۸ ۔ اس ضمن میں مزید پڑھنے کیلئے دیکھئے۔
Anthony W. Marx, Faith in Nation: Exclusionary Origins of Nationalism (London and New York: Oxford University Press, 2003). A good primer is provided by Alexander Stille, "Historians Trace an Unholy Alliance: Religion and Nationalism," New York Times, May 31, 2003

۳۹ ۔Charles Jacobs, "Why Israel and not Sudan is singled out," Boston Globe, October 5, 2002

۴۰ ۔یہاں جس عالم کا تذکرہ ہے اُس کا نام عبداللہ الفیصل ہے۔

۴۱ ۔ Michel Houellebecq, Lire, September 2001, p. 4 of online transcript. Download at www.lire.fr

۴۲ ۔ Oriana Fallaci, The Rage and the Pride (New York: Rizzoli, 2001), p. 137

۴۳ ۔Lionel Jospin (speech to Foreign Policy Centre), London, July 23, 1998

۴۴ ۔Women Key to Effective Development,"

World Bank issues press backgrounder, December 6, 2001. See also Engendering Development 2001, World Bank Research Report

۴۵۔ Peter Stalker, The No-Nonsense Guide to International Migration, p. 50

۴۶۔ UN Arab Human Development Report 2002کے مصنفین اِس بات سے متفق ہیں۔ "Arab Governance: Citizens Getting Organized to Bargainکے عنوان والے باب میں مصنفین لکھتے ہیں، ”پہلے بہت ساری حکومتیں روزگار، مراعات اور راغیب کی ضمانت دیتی تھیں۔ آج مالی دباؤ نے اِن حکومتوں کو ایسی مراعات پیش کرنے سے روک دیا ہے۔ حکومتوں کو اپنا کاروبار چلانے کیلئے ٹیکس کے پیسہ پر دارومدار کرنا ہوتا ہے اور یہ فعل شہریوں کو حکومت میں اپنی آواز بلند کرنے کا مزید اختیار ودیعت کرتا ہے۔ “

۴۷۔ DAWN, December 21, 2002. [View the photo.] ۔ترکی میں مسلمان عورتوں نے شکایت کی ہے کہ وہ یونیورسٹی کی کلاسوں اور حتکہ پارلیمنٹ میں

جانے سے روک دی جاتی ہیں اگر انہوں

دیانتداری کی ستائش کے ساتھ

’مجھے ’’شیطانی آیات‘‘ پڑھنے والے مسلمانوں کے بے تحاشہ تعریفی خطوط یاد ہیں‘ ، سلمان رشدی نے مجھے ۲۰۰۲ء میں ایک انٹرویو کے دوران کہا۔ ’خاص طور پر مسلمان عورتوں نے رستہ کھولنے پر میرا شکریہ ادا کیا، تمہیں اِس بات کا اندازہ ہے (۱)‘۔ او بوائے ، کیا میں نہیں جانتی۔ ایک ہفتہ پہلے ٹورونٹو ایریا کے اصلاحات کے حامیوں نے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ اکثر شرکاء خواتین حجاب پہنے ہوئے نہیں تھیں، حتکہ اس کاچھوٹا موٹاانداز بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اسلام کے بارے سوچ رہی تھیں، ہفتہ کی ایک خوبصورت صبح وہ اِس بات پر بحث کر رہی تھیں کہ دین کیلئے اگلا قدم کیا ہو گا اور اُس کا مقام کیا ہو گا۔

ایک باغیانہ ہستی منبر پر کھڑی ہو گئی۔ ’کیوں مجھے میری لائبریری میں تیس ہزار کتابیں چاہئیں؟‘ اس لئے کہ اِن میں سے ہر کتاب ایک ہی بات کئے جارہی ہے؟ یو سی ایل اے کے پروفیسر خالد ابو ایل فدل کمینہ خصلت ملاؤں

کی حکم عدولی کی غرض سے آوارہ کتوں کو گھر لے آئے تھے۔ ’ہم مسلمان اپنی تہذیبی میراث کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جس طرح ہماری ہر ایک کتاب ایک ہی ’’سادہ سچ‘ ‘ جو اسلام ہے ، کی اثبات کرتی چلی جاتی ہے اور ہمیں اِس سے آگے جانے کی ضرورت نہیں‘۔ آج کے مسلمان دانشور ’جیسی زیادہ گاؤدی اور بے تحاشہ بور شے انسانیت نے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہوگی‘۔ کیونکہ اِن میں سے ہر کوئی کہہ سکتا ہے ، ’’میں اپنی زندگی میں کیا کر رہا ہوں، کیا میں بالکل وہی کچھ لکھنے جا رہا ہوں جو آج سے چھ سو برس قبل کہہ دی گئی تھی(۲)‘‘۔

ہجوم زیرِ لب مسکرایا۔ راستے میں ایک خالی کرسی تھی، میں نے ایک ہم جنس مسلمان دوست کی طرف اشارہ کیا جو ایک کپا پہنے یہودی لڑکے سے عاشقی معشوقی کر رہا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے میں ایک بوسنین ترک کے گلے ملی جسے میں نے تب سے نہیں دیکھا تھا جب سے اُس نے ایک میکسیکن ، جس کی بطور کیتھولک پرورش ہوئی تھی، سے شادی کی تھی۔ اُس نے محبت کا پودا لگایا اور پھل توڑ نے چل دیا۔ ’کیا

آپ کو کسی ایسی تہذیب کا علم ہے جو کمتر مشترک خصوصیات کی بناء پر پروان چڑھی ہو؟ ایسی تہذیب جو اہل لوگوں کی بجائے نادانوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہو؟ تہذیب کو بنانے والے فنکار ہوتے ہیں، ادیب ہوتے ہیں، وہ صلاحیت ہوتی ہے جس سے موسیقی اور جمالیات جنم لیں اور اظہار کے نئے طریقے معرض وجود میں آئیں۔
تہذیب تب آگے بڑھتی ہے جب کسی سوچ کی بنیاد پر کوئی لگن ہو، فتویٰ نہیں'۔ میں ایک تحریک شروع کرنا چاہتی ہوں لیکن سب کو متوجہ کر کے، میں نے 'اندرونی جہاد' کی طرز پرتحریک کی راہ ہموار کر دی ہے۔
فقط ایک شے مجھے محسوس ہوئی۔ اگر ایل فدل کے بھڑ جانے والے الفاظ کسی غیر مسلمان نے کہے ہوتے تو بولنے والے کی استعاراتی گردن دبا دی گئی ہوتی۔۔ جہادیوں سے نہیں (جو استعارے کی پرواہ نہیں کرتے) بلکہ کمرے میں بیٹھے ہوئے بہت سارے دانشوروں نے۔ اَب خاص مسلمانوں کے حوالے سے بات نہیں ہے۔ جب امریکی افریقیوں کے مزاح نگار کرس روک اپنے کردار کو 'نیگرو' کے لفظ کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں جبکہ لاطینا جینیفر لوپاز پھبتی کسنے کی نیت کے بغیر لاطینا کا لفظ زور

سے بول سکتی ہے تو صرف مسلمان ہی نہیں ہیں جو 'ترجمانی' کی سیاست کا پہلے سے شکار ہیں۔ مگر کیوں صحیح ترجمانی کا دارومدار سطحی مشترکہ خصوصیات کی بجائے اصل مشترکہ اقدار کی بناء پر نہیں، سطحی مشترکہ خصوصیات میں کیوں کالوں کیلئے جلد کا رنگ، ہم جنسوں کا جنسی رجحان، مسلمانوں کامذہب کیلئے استعمال ہوتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اُس روز ایل فدل کو سننے والی خواتین کی اکثریت ہر اُس شخص کے پرخچے اُڑا سکتی تھیں جو انہیں اپنے لباس کے گرد کمر پیٹی پہننے کا حکم دیتا۔ پھر کیوں ہم میں سے کوئی غیر مسلموں پر درستگی کے زیر جامے مسلط کرنا چاہتا ہے؟

یا غیر مسلموں نے خود ہی اپنا محاسبہ کر رکھا ہے؟ الفدل کی آمد سے چند روز قبل اِس سوال پر غوروخوص کرنے کی میرے پاس وجہ تھی۔ ایک دوست (جسے ایلیکس کہہ لیتے ہیں) نئے آنے والے جنوبی ایشیائی طالبعلموں کیلئے یونیورسٹی ٹورونٹو کے اسٹوڈنٹس سنٹرکو اوپر اور نیچے کی طرف انگلیوں کے اشاروں والے سائن بورڈوں سے سجا رہا تھا ۔ اپنے کمپیوٹر پر' اِن'

کے ڈیزائن بناتے ہوئے وہ فخر سے دکھا رہا تھا کہ اُس نے انگلیوں کے نشان غیر سفید بنائے ہیں۔ ایک سائن میں انگلی کالی تھی، دوسرے سائن میں انگلی گرے رنگ کی تھی(ایسا گرے شیڈ جو اُس کے پرنٹر سے بھورے رنگ کے قریب نکل سکتا تھا)۔ جب ایلیکس نے مجھے یہ سائن کمپیوٹر پر دکھائے تو میں تائید کیلئے مسکرا دی۔ تب اُس نے اُس روز کے ایک اخباری مضمون کا ذکر کیا جو ڈنمارک میں اسلامی انتہا پسندی سے متعلق تھا(۳)۔ ''تمام مسلمانوں کو روایتی بنانا''، اُس نے اخبار کی مذمت کی۔

مضمون کو پڑھنے کے بعد میں ایلیکس سے متفق نہ ہوئی۔ 'میرا خیال ہے کہ وہ (اخبار والے) اصل پریشان کُن مسئلے پر روشنی ڈال رہے ہیں'، میں نے اپنی رائے دی۔ فوراً ہی اُس نے میری تشویش کی تائید کر دی کہ کچھ مسلمان ڈنمارک کی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مرکزی دھارے کی خاموشی اُن کے رویے کو درگزر کر رہی ہے۔ اُس نے مضمون کے اعدادوشمار کو دہرایا، اگرچہ مسلمان ڈنمارک کی آبادی کا پانچ فیصد ہیں لیکن وہ ویلفئیر کا چالیس فیصد حصہ کھا رہے ہیں۔

فکر والی بات یہ تھی کہ چونکہ جب مملکت گڑبڑ پیدا کرنے والوں کی زندگی گزارنے کے وسائل مہیا کرتی ہے تو اُن کے پاس اپنے منصوبے بنانے اور اُن پر عمل درآمد کرنے کیلئے وقت ہی وقت ہوتا ہے۔ میں آپ کو یہ تو بتا نہیں سکتی کہ اعدادوشمار کتنے درست تھے لیکن ایلیکس اِن سے پریشان ہو گیا۔ پہلے اُس نے کوشش کی کہ میرے اندر کے مسلمان کو مجروح نہ کرے، اِس لئے اُس نے پہلے اخبار کی صحافیانہ بدکرداری کو رگیدا۔ ایلیکس کی ''بے ضرر'' بددیانتی بے شمار مسلمانوں کے رویوں جیسی ہے۔ ایلیکس کی ''بے ضرر'' بددیانتی بے شمار مسلمانوں کے رویوں جیسی ہے۔

اگر آپ ایلیکس ہیں تو برائے مہربانی سنئے۔ اسلام کو استعمال کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ کچھ مسلمان اِس کو بطور تلوار استعمال کرتے ہیں اور وہ ایسا کرتے ہوئے غنڈے بن جاتے ہیں۔ مگر بہت سارے اور اُن سے بھی زیادہ اسلام کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی غیر تعمیری فعل ہے۔ یہ فعل مسلمانوں کو خود احتسابی اور غیر مسلمانوں کو شرمندگی سے دور رکھتا ہے۔ 'تمہارے پاس میرے مذہب کے بارے سوال کرنے

کا کوئی حق نہیں ہے‘‘، ڈھالیں لہرانے والے مسلمان اکثر غیر مسلموں کو یہ خطبہ دے رہے ہوتے ہیں۔ ’تم کبھی بھی اسلام کو سمجھ نہیں سکتے‘۔ (اِس بیان میں کئی معنی پنہاں ہوتے ہیں: میں تحفظ سے خالی مسلمان بالکل جاننا نہیں چاہتا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔) ’تم نے میرے لوگوں کو ماضی میں ’’نسل پرستی‘‘ کا نشانہ بنایا اور تم ہمیں پھر ’’مسائل میں مبتلا‘‘ کرو گے۔ (بین السطور: ہم مسلمانوں کے پاس اپنی طاقت کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ وہ بات ہے جو کلچرکے پروفیسر نے مجھے پڑھائی تھی۔)

میں نے اِس مسئلے کے بیان میں اِس حربے کے استعمال کو بے شمار دفعہ دیکھا ہے۔ لہذاٰ میں اس کا صرف اس طرح اظہار کروں گی: میں نے اپنے لڑکپن سے مغرب کے مسلمانوں کو اسلام کے بارے لوگوں کی لاعلمی کی چھاتیوں کو چوستے اور ہر قیمت پر جوازدہی کا ماتم کرتے دیکھا ہے۔ دیگر مبصرین نے اِس پر غور بھی کیا ہے۔ حتکہ گیارہ ستمبر سے پہلے، برطانوی صحافی یاسمین علی بھائی براؤن نے لکھا کہ ’یہ خیال کہ ہم اپنے معاشرہ میں مختلف گروہوں کے غیر مداخلتی

معاہدہ پر سادگی کے ساتھ عمل کر سکیں، نہ صرف غلط ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اَب ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہر صورت بندھے ہوئے ہیں(۴)‘۔ ہمیں اَب اپنی ڈھال کو نیچے رکھنا ہو گا اور کسی کھلے معاشرہ کے جنم کے حق کو قبول کرنا ہوگا: جہاں ہم ایک دوسرے سے سوالات پوچھ سکیں۔ بعض اوقات چبھتے ہوئے سوالات۔ بعض اوقات سرعام۔

اِن حالات میں ہمیں کثیر الثقافتی کے بارے گھسے پٹے جملوں سے اپنے ذہنوں کو مزید ماؤف نہیں کرنا چاہئے ۔ مگر ہم یہی کچھ کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ’مسلمز اِن امریکن پبلک سکوائر‘ نامی پروجیکٹ، جوزف کوٹ سے جو امریکی مسلمانوں کا انتخابی حلقہ ہے، چیختا ہے۔ ’حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہماری ممبرشپ البانوی، افغانی اور الجزائری سے ایک طرف شروع ہو کردوسری طرف یمنی اور زانزیبار تک جاتی ہے‘، اس پروگرام کی ویب سائٹ شہنائی بجاتی ہے۔ ’ہم میں سے اکثر مسلمانوں کیلئے یہ حقیقت تسلی بخش ہے کہ یہاں امریکہ میں۔۔۔مسلمانوں کے اتحاد کے نئے معنی بن رہے ہیں(۵)‘۔ پرانی تقسیم کاریاں ختم ہو رہی ہیں اور ہمہ

جہتی سے اتحاد جنم لے رہا ہے۔ ’امریکن پبلک سکوائر‘ کے مسلمان آنے والے عہد کی کہانی پیش کرتے ہیں۔ ایک نقص کے سوا: جس کو بالآخر دیکھتی ہوں: ’امریکن پبلک سکوائر‘کے مشاورتی بورڈ میں کوئی عورت شامل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، اِس پروجیکٹ نے اپنی ویب سائٹ پر پچیس ’’نیشنل مسلم لیڈروں‘‘ کی تصاویر لگائی ہوئی ہیں جو ایک ’’فوکس گروپ‘‘ کو تشکیل دینے کیلئے اکٹھے ہوئے ہیں اور اُن میں کوئی ایک عورت بھی شامل نہیں ہے۔ میں صرف نمبروں کی برابری کے چکر میں برابر نمبروں کی پرواہ نہیں کرتی ۔ میری شکایت تو قبائلی اسلام کو درست کرنے کیلئے ضروری اقدامات نہ کرنے سے متعلق ہے۔ عصری مسلمان دنیا کے انسانی حقوق بشمول عورتوں کے حقوق کا نہائت بُرا ریکارڈ سامنے رکھتے ہوئے میرا سوال یہ ہے: اگر عورتیں برابر نہ ہوں تو ہمہ جہتی ناکافی ہوتی ہے، کیا کسی نے ’امریکن پبلک سکوائر‘ کے مسلمانوں کو’’متنوعیت‘‘ کی اندھیری غار میں سوراخ کرنے کیلئے متنبہ کیا ہے اور ایسا کرنے سے اُن کے میلوں ٹھیلوں کی رونق و شادمانی تو برباد نہیں ہو جائے گی؟

میں ایک دوسری پائیدار مثال پیش کرناچاہتی ہوں کہ کیسے مغرب میں ہم کثیر الثقافتی کی لہر سے مدہوش ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں ، ملائشیا کے نائب وزیر اعظم انور ابراہیم نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں ''تہذیبوں میں مکالمے کی ضرورت'' پر گفتگو کی۔ اس وقت جیل میں بند انور ابراہیم نے اعتراف کیا کہ 'لاعلمی، ناانصافی، بدعنوانی، منافقت اور اخلاقی قدروں کا فرسودہ پن عصری مسلمان معاشروں میں عام پایا جاتا ہے (۶)۔'تاہم اُس نے خبردار کیا ، 'آج آسانی سے ذرائع ابلاغ کے بہکاوے میں آجانے والایہ تاثر بنا لے گا کہ مسلمان دنیا میں صرف سخت گیر اور ہراساں کرنے والے انتہا پسند رہتے ہیں'۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان تہذیب نے 'پیار محبت کی کئی کہانیوں کو جنم دیا ہے '۔ انور نے لیلا مجنوں کی'' دل موہ لینے والی کہانی'' کو بطور مثال پیش کیا ، 'جیسے جیسے کہانی آگے جاتی ہے ، جوان آدمی کو دوشیزہ کے ساتھ اپنے جنون کی وجہ سے ہتک و رسوائی کا سامنا کرنا پرتا ہے کیونکہ دنیا کی نگاہوں میں لیلا کا حسن گھناؤنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اِس کے جواب میں نوجوان نسل ہمیشہ یہ کہتی ہے : ''لیلا کا حسن

دیکھنے کیلئے مجنوں کی آنکھ ہونی چاہئیے ‘‘۔ آہ،
ٹھکرائی ہوئی لیلا پیار کو پا لیتی ہے۔۔روحانی بالیدگی
پانے والی کیسی بات ہے۔
اس گھڑی رومانس کو پیش کرنے کے خطرے میں میں یہ
پوچھتی ہوں: کیا لیلا کے پاس مجنوں سے شادی کی
بجائے اکیلے زندہ رہنے کا انتخاب تھا؟ کیا وہ اُس کی
مرضی کے بغیر وطن چھوڑ سکتی تھی؟ کیا وہ اپنے
’’کیرئیر‘‘ کا انتخاب کر سکتی تھی؟ کیا اِن میں سے
کوئی سوال غیر مسلمانوں کی طرف سے کیا گیا جو اُس
محفل میں موجود تھے؟ انور ابراہیم اِس طرح کے سوال و
جواب سے پریشان نہ ہو سکے۔ وہ انسانی حقوق کے
خواہاں تھے اور اِسی بات نے اُن کے باس کو خبردار کر
دیا، مہاتیر محمد جو ملائشیا کے وزیر اعظم تھے، جنہوں
نے اپنے نائب کو منہ بند کرنے کی غرض سے جیل بند کر
دیا۔ ہم کیوں ایسی خوش کن کہانیوں کیلئے نرم خو ہیں
جن کے حقائق گھناؤنے باور کئے جا سکتے ہوں؟
غیر مسلمانوں کیلئے ایک نوٹ: پل بھر کے رومانس کو
تباہ کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ آزاد معاشرے آزاد ہی
رہتے ہیں کیونکہ لوگ سوالات باآواز بلند پوچھنے کا

خدشہ مول لیتے ہیں۔ سوالات بھی اِس طرح کیے ، ’’کہ کیوں ہزاروں مسلمانوں کو فرانس میں حجاب پر پابندی کے خلاف احتجاج کرنے کو سڑکوں پر لے آنا آسان ہے مگر کیوں سعودی عرب کے مسلط کردہ اِس حجاب پر کسی بڑی احتجاجی ریلی کا عشر عشیرناممکن ہے؟ اور جب مسلمان اصرار کرتے ہیں، ’ہمارے ہاں اپنے طریقے کی جمہوریتیں ہیں‘ ، آپ کو صرف ایک ہی سوال پوچھنا ہے: وہ کونسے حقوق ہیں جوعورتوں اور مذہبی اقلیتوں کو اِن جمہوریتوں میں دستیاب ہیں، تھیوری کی حد تک نہیں عملی لحاظ سے؟ جواب میں آپ کو بلاشبہ یہ سننا پڑے گا کہ مغرب کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے کہ کس طرح اُن کی عورتیں سماج میں قبولیت پانے کی خاطر چھاتیوں کو بڑھاتی ہیں اور پیٹوں کو گھٹاتی ہیں۔ مان لیا ، مغرب کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے۔ پھر بھی، مغرب میں بطور خواتین کے حقوق میں سرگرداں ساری زندگی گزارنے کے باوجود میں کسی ایسی ایک لڑکی سے نہیں ملی جس کے والدین نے اُسے چھاتیوں میں سلیکون نہ بھرنے پر خاندان سے نکال باہر کیا ہو اور البتہ ایک سے زائد مسلمان والدین نے اپنی بیٹیوں کے ختنے کرانے

کے انکار کو مسترد کر دیا ہے۔ غیر مسلم دنیا پر یہ احسان کریں کہ جب مسلمان بولنا شروع کریں تو اخلاقی قدروں کی تبدیلی کا بٹن دبا دیں۔ اُس گھڑی کو تباہ کرنے کی ہمت کریں۔

اپنے وقتوں کے خودساختہ دانشوروں سے پوچھئے، مثال کے طور پر امن کے سرگرم کارکنوں سے پوچھئے، کیوں یہ مخصوص کرداروں کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑ لیتے ہیں اور ہم سب سے تالیاں بجانے کی توقع کرتے ہیں۔ جنوری ۲۰۰۳ء میں جب یو این اسکیورٹی کونسل نے یہ بحث شروع کی کہ صدام حسین کو کیسے غیر مسلح کیا جائے تو میں نے ٹورنٹو کا جنگ مخالف اجتماع ملاحظہ کیا۔ اُس روز کے آخری مقرر -- جنگ مخالف ٹیم کے خوابوں کی ڈھارس نے کہا۔۔ اگر تم اخبار شائع کرو تو ایرانی طرز کی مذہبیت کو بڑھاوا دو(۷)۔ میں یہ سوچتی رہی کہ ہوٹنگ کرتا، سیٹیاں بجاتا اور شادمانی کا اظہار کرتا مجمع کے پاس یوں اکٹھے ہونے کا قانونی حق ہے اگر اُس شخص جیسے لوگ یونہی اکٹھے ہوتے رہیں؟۔ واشنگٹن ڈی سی میں اُسی دوپہر کو جنگ مخالفین منتظمین نے اسٹیج اُس مسلمان عالم کے حوالے کر دیا

جس نے اکتوبر ۲۰۰۱ء میں کہا تھا، 'ہالی وُڈ کے صیہونی، نیو یارک کے صیہونی اور ڈی سی کے صیہونی(۸) مسلمانوں کے خلاف سازش کر رہے ہیں'۔

اگر امریکہ کو اپنے اتحادوں پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہو اور روشن خیال مغربی بھی ایسا محسوس کریں۔ لیکن آپ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح کے بھونڈے اتحاد بن جائیں جب تک آپ اُس مخصوص گھڑی کو تباہ نہ کریں اور پوچھنے کی ہمت نہ کریں۔

اُس پیسے کے بارے پوچھئے جو آپ نے خیرات میں دیا تھا۔ ''ومین لوننگ انڈر مسلم لاء ز'' کے مطابق 'عطیات دینے والے اداروں' کی اچھی خاصی تعداد کا پیسہ نادانستہ طور پر مدرسوں اور فاؤنڈامینٹلسٹ کے ہاتھوں ہونے والے سماجی کام کی نذر ہو گیا ہے۔ اور فاؤنڈا مینٹلسٹ جواب میں لاگو کرتے ہیں 'مردوں پر یہ دباؤ کہ وہ مسجد جائیں اور عورتوں پر یہ دباؤ کہ وہ اپنے آپ کو ڈھانپیں'۔ وہ 'مخلوط تعلیم کے اسکولوں کو ختم کرنے (۹)، لڑکیوں کے سائنس، آرٹس اور اسپورٹس پڑھنے پر پابندی لگانے ، اور ایسے تعلیمی پروگرام کے احیاء پر

زور دیتے ہیں جو دوسروں کیلئے نفرت پیدا کریں‘۔ بظاہر غیر جانبدار ٹائیٹل نظر آنے پر بالکل دھوکہ نہ کھائیے (۱۰) ۔ دی بینی وولینس انٹرنیشنل فاؤنڈیشن، دی مرسی انٹرنیشنل ریلیف آرگنائزیشن، دی گلوبل ریلیف فاؤنڈیشن۔۔یہ سارے دل لبھانے والے نام ہیں اور سبھی اسلامی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ پھر آٹوا میں مسلمانوں کا خیراتی ادارہ ہیومن کنسرن انٹرنیشنل ہے۔ کچھ وقت تک اِس ادارہ کے پاکستان کیلئے ڈائریکٹر اور کینیڈا کے شہری عمر سعید خدر نے کینیڈا کے مسلمانوں سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اُن سے چیک اور جیولری ’انسانی ابتری کی بحالی‘کے نام پر حاصل کر لئے۔ بظاہر اِن لوگوں کو گمان تک نہیں تھاکہ یہ شخص القاعدہ کا رکن ہو سکتا ہے۔ بعد میں پاکستانی حکام نے خدر کو۱۹۹۵ء کے بم پلاٹ میں گرفتار کر لیا، ہیومن کنسرن نے اِس کو باہر نکال دیا۔جب خدر رہا ہوا تو اُس نے مقابلے میں ویسے ہی بھاری بھرکم نام، ہیلتھ اینڈ ایجوکیشن پروجیکٹس انٹرنیشنل ، کا خیراتی ادارہ بنا لیا۔ میںآپ سے یہ نہیں چاہتی کہ آپ امداد دینا بند کر دیں۔ میں آپ سے یہ چاہتی ہوں کہ آپ اِس بات پر

لاپرواہی برتنا بند کر دیں کہ آپ کی امداد کہا ں جاتی ہے۔ اُس گھڑی کو تباہ کرنے کی ہمت کریں۔
آپ آرام کے ساتھ سیاستدانوں کو مشکل سوالات کرسکتے ہیں، ایسا ہی ہے نا؟ انہیں کچھ کہتے ہوئے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا مسلمانوں کے احتساب کی بات کرتے ہوئے لگتا ہے ، ایسا ہی ہے نا؟ ٹھیک ہے۔ اگر آپ امریکی شہری ہیں تو آپ کو کیسے علم ہے کہ آپ کے پیسے افغانستان میں جہاد کی ترغیب دینے والی کتابوں کیلئے نہیں خرچ ہو رہے ، جیسا کہ ریگن دور میں یوایس ایجنسی برائے انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ نے کیا۔ کیا آپ نے اپنے کانگریس کے رکن کو یہ معلومات پہنچائی ہیں؟ اگر آپ ناروے میں رہتے ہیں تو کیا آپ آگاہ ہیں کہ آپ کے ملک کی امداد (آپ کے ادا کئے پیسوں کے ذریعے) سے انگریزی پڑھانے کے جو اسکول چل رہے ہیں ، اُن میں مسلمان عورتوں کو مسلمان مردوں سے الگ تو نہیں کر دیا گیا ، اس طرح اِن تارکین وطن کو ہمہ جہتی متعارف کرانے کے اصول کے رائیگاں ہونے کا اندیشہ تو نہیں؟ ہالینڈ کے رہائشیوں کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کہیں ڈچ مسلم براڈکاسٹنگ سسٹم اَب مزیدنفرت آمیز مواد

اپنے ٹی وی اسٹیشن نیدرلینڈوَن پر پیش نہیں کر رہا ، جیسا کہ اُس نے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو کیا تھا؟ کینیڈا کے لوگوں کو جاننا چاہیے کہ گیارہ ستمبر کی پہلی برسی کے موقع پر وفاقی سطح کے خیراتی ادارے ٹورونٹو ریسپونس فار یوتھ (ٹی آر وائے) نے رواداری کی ضرورت کے احساس کو پیدا کرنے کیلئے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ مگر ٹی آر وائے کا اپنا مواد مسلمانوں کے روایتی میڈیاکی غماضی کرتا تھا اور دوسروں کیلئے یہ درج تھا ، 'سفید فاموں اور یہودی مردوں کے تحت چلنے والی کارپوریشنیں'۔ کیا یہ نسل پرستی مخالف کام ہے؟ کس کیلئے؟ ونڈرلینڈ میں ایلس اور علی کیلئے؟ کیا ہم اپنا پیسہ کسی مخلصانہ کوشش کیلئے خرچ نہیں کر سکتے؟

آپ میں سے کچھ خود کو غصے کے ساتھ برا بھلا کہہ سکتے ہیں، 'مگر یہ سچ ہے کہ سفید فام اور یہودی میڈیا کی تمام ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالک ہیں'۔ کیا سچ بتانا ہمیں نسل پرست بنانے کے مترادف ہے (۱۲)؟ہم سیاہ فام رچرڈ پارسنز، جو ٹائم وارنر کے چیف ایگزیکٹو ہیں، اور اوپرہ ونفری، اور سونی مہتا اور کیونسی جونز کو

ایک طرف کرتے ہوئے طے کرتے ہیں کہ آپ درست ہیں کہ سفید فام اور یہودی ہی ثقافت کے مرکزی دھارے کو چلا رہے ہیں۔ جب تک ہم انہی بنیادوں پر کھیل رہے ہیں تو مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ میں ٹی آر وائے کا مزید بھانڈا پھوڑوں، جو خود کو 'نسل پرست مخالف پروجیکٹ' قرار دیتی ہے۔ اِس ورکشاپ کے اکثر لیڈروں کے نام مسلمانوں والے ہیں۔ شاید ہمیں حیران نہیں ہونا چاہئے کہ نسل پرست مخالف تنظیم یہودیت مخالف تنظیم بن جاتی ہے اگر اُسے مسلمان چلا رہے ہوں۔ یا کیا میرا اِن لوگوں کے بارے اِس طرح کا بیان مجھے نسل پرست ثابت کرتا ہے؟ کیا یہ 'نسل پرست مخالف' روایتی میڈیا کے پیچھے بیٹھے پیلی جلدوں اور چھوٹی یہودی ٹوپیوں کو تصور میں رکھ کر اپنا کام تو نہیں کر رہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ، کم یا میرے جتنے ہی نسل پرست ہیں؟ آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ اس طرح کا مقابلہ کس قدر مشکل ہے؟

اِس سے ہٹ کر کس کا پوچھنا درست ہے کہ کیوں کچھ لوگوں کا (مثال کے طور پر مسلمانوں کا) نسل پرستی کے بارے اعتراض کرنا جائز ہے جبکہ دوسرے لوگوں (کہ

لیجئے ، غیر مسلمانوں کا) کا یہ اعتراض اٹھانا درست نہیں۔ بالآخر نہ امریکہ اور نہ اسلام ایک ہی طرح کی شے ہیں۔ نہ احمقانہ جینیاتی سطح پر ’نسل‘۔ پھر کیا ہے؟ کم از کم تین چیزیں۔

پہلی، امریکی اپنے بارے میں سمجھتے ہیں کہ اُن کا اِس نظریہ ، آزادی کے حوالے سے احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اُن کا ملک رنگوں کے معاملہ میں اندھا نہیں ہے اور یہی نظریہ آزادی ہے۔ ایک لحاظ سے ، اسی لئے امریکہ کے تفتیش کاروں کو نسل پرست کہنے کا تُک نہیں بنتا۔کیونکہ نسل پرستی کا حوصلہ شکن الزام امریکہ کے ناقدین پر فقرے نہیں کستا بلکہ اُن کی تنقید ہمیں قابلِ قبول لگتی ہے۔ اور یہ تنقید بھی قابلِ قبول ہونی چاہئے جتنی معاشرتی طور پر منتشر ملت اسلامیہ پر ہونی چاہئے۔ مسلمان جو خود بخود خود کواسلام کے بارے پوچھنے والوں کی نسل کے خلاف ہو جاتے ہیں، خود سے یہ فکشن گھڑنا شروع ہو جاتے ہیں کہ وہ ہم سب ایک مقام سے آئے ہیں۔ آپ اس طرح کے فرسودہ پن کا الزام یہودیوں یا سفید فاموں کے سر نہیں جڑ سکتے۔

یہاں پر ایک دوسری وجہ بھی ہے جس کی بناء پر غیر

مسلمان امریکیوں سے پوچھنا مناسب لگتا ہے اور مغربیوں سے بھی عمومی طور پر۔۔ مگرمسلمانوں سے نہیں۔مغربیوں کو حکام کے ساتھ اختلافِ رائے کی بناء پرآپ مسلمانوں کو جسمانی طور پر آزار پہنچانے کی عادت نہیں ہے۔ ہر امریکی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ نیو یارک ٹائمز ایف بی آئی کے امریکہ میں القائدہ کے بھرتی شدہ تعداد کے بیان کو چبھتی تنقید کی سیخ میں پروئے ، اور اِسے ''کم و بیش وحشی اندازہ'' قرار دے مگر کوئی اخبار کے دفاتر کو آگ نہیں لگاتا جیسا کہ نائجیریا میں ہوا جب ایک کالم نگار نے بے خیالی سے اقتدار پر قابض مسلمانوں کے خلاف لکھ دیا ۔ امریکہ کے بہت سارے کیبل چینلز یہ اشتہار نشر کر چکے ہیں جو کہتا ہے ، ''اَب عیسیٰ نے اور کیا کچھ کرنا ہے؟''، اس طرح حاکموں کا تیل نکالا جاتاہے۔ اِن چینلز پر نیلسن منڈیلا کا جارج ڈبلیو بش کے بارے مواخذہ '' ایسا صدر جو ٹھیک سے سوچ نہیں سکتا(۱۳)'' نشر کیا گیا۔ لیکن کیا اِن چینلز کے لائسنس منسوخ کر دئیے گئے یا اُن کے صحافیوں کے ساتھ بُرا سلوک ہوا؟ اَب اِس بات کاموازنہ کیجئے۔۔ سعودی عرب، کویت اور اُردن نے الجزیرہ کے

رپورٹروں کو حکومتوں پر تنقید کرنے کی پاداش میں نکال باہر کیا۔
یہ اِس بات کا صداقت نامہ ہے کہ امریکہ اپنے بارے میں کس قدر تنقید برداشت کر لیتا ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد جیلو بیافرا، جو ۱۹۸۰ء کے دہائی کے پنک بینڈ ’’ڈیڈ کینیڈیز‘‘ کا سب سے اہم شخص ہے، نے بش کے خلاف تقریروں کے ساتھ پورے امریکہ کا دورہ کیا۔ بیافرانے بش کی گا کر تضحیک کی اور اپنے حاضرین کی منہ پھاڑ خوشی کی غرض سے صدر کے منہ سے مسخ شدہ گرائمر کے جملے نکلوائے۔
’’خدا ‘‘خود امریکہ کے کچھ حصوں میں مذاق اُڑانے کیلئے کھڑا ہے۔ میں نے ایک دفعہ اِس شخص کو کیلیفورنیا کی پٹی، وینس بیچ میں اُس کے سوانگ ’’گوڈ بلیس امریکہ‘‘ میں دیکھا۔ آپ بھی لطف اٹھائیے۔
خدا میری پتلون کے اندر اپنی رحمت کرے
وہ شے جو مجھے پسند ہے
جنکے اندر کھڑی ہو جاتی ہے
اور اُس پر سواری کرتے ہیں
اپنے چوتڑوں کے درمیان جب میں سواری کرتا ہوں یا پیڈل

چلاتا ہوں(۱۴)وہ شخص احمق ترین ہو سکتا ہے مگر اُس کے بیانات کا خفا ایف بی آئی نے معائنہ نہیں کیا اور نہ ایونجلسٹ عیسائیوں نے اُس کے چوتڑوں پر لات ماری۔
خدا کے بارے میں کسی مسلمان ملک میں چھکار کر دیکھئے۔ ہمیں اُس پاگل پن کا پہلے ہی علم ہے جو پیغمبر محمد پر فقرہ طرازی کی صورت میں سامنے آتا ہے اور حالانکہ وہ خدا نہیں ہیں۔
امریکہ کی طرف واپس آتے ہیں، مجھے کہنے دیجئے کہ صدر کے آدمی جہاں ہلہ بول سکتے ہیں بولتے ہیں۔ اندھا دھند گرفتاریاں، ایک دم تلاشیاں، بلاضمانت نظر بندیاں، ٹیپ شدہ فون، کھلی ڈاک، مخصوص حکومتی دستاویزات: امریکہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے ،
کیلیفورنیا کی ملٹری بیس میں سپاہی جنگ مخالف سرگرم رکن کو گھس آنے پر گولی مار کر ہلاک بھی کر سکتا ہے۔ پینٹاگون کا تفریح کے حوالے سے ایک دفتر ہے جو تاریخی درستگی کے نام پر امریکی فوج کی عکاسی کو ہالی وڈ میں چھانٹتا ہے۔ جارج ڈبلیو بش کے چھوٹے بھائی جیب کی گورنری میں چلنے والی ریاست فلوریڈا نے حال ہی میں ایک ڈرائیور کو اپنی لائسنس پلیٹ اِس

لئے واپس کرنے کا کہا کہ اُس پر لفظ ''اتھیسٹ'' لکھا ہوا تھا۔ اور ٹیکساس کے ایک چینل ، جو امریکہ کا سب سے بڑا ریڈیو نیٹ ورک ہے اور صدر کا بڑا حامی ہے ، نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنی امداد کو پیش کرتے ہوئے ایک سو ساٹھ دھنیں ترتیب دی ہیں جو بعد از گیارہ ستمبر کے احساسات سے دوچار کرسکیں۔ اوہو، آزاد سرزمین پر پابندیوں کی بہتات ہو گئی۔

مگر کیا روز ایسا ہو رہا ہے۔ آپ اور میں امریکہ کی حماقتوں کے بارے اس لئے جانتے ہیں کہ ہم روز اَن کے بارے تواتر کے ساتھ سنتے ہیں(۱۵)۔ کسی ایسے ملک پر اعتراض کرنا فطری امر ہے جب ہم اُس ملک کے نقائص سے آگاہ ہوں اور اُن نقائص کو تنقید کا نشانہ بنانا قدرتی ہے جب ہمیں معلوم ہو کہ ہماری زبانیں نکال نہیں دی جائیں گی یا ایسا کرنے پر ہماری ٹانگیں یا سر الگ نہیں کر دئیے جائیں گے۔ مسلمانوں کو دیکھنا چاہئے کہ اگر وہ یہ عیاشیاں (جنھیں مغرب میں 'حقوق' کہتے ہیں) ہمیں سجھا سکیں کہ کیوں ہم مسلمان ممالک کو اِن باتوں سے مستشیٰ قرار دینے کیلئے امریکہ اور اسرائیل میں مین میخ نکالتے ہیں۔ غیر مسلمانوں کو دیکھنا چاہئے

کہ کیوں وہ ہم سے یہ سوال اکثر نہیں پوچھتے۔
اَب اس آخری وجہ کی طرف آتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی بجائے امریکہ پر تنقید کرنا شائستہ سمجھتے ہیں۔ نہ صرف امریکہ اپنی خرابیوں کو ترتیب وار سنے گا بلکہ امریکہ اِن میں کچھ ایک کی ذمہ داری بھی قبول کرے گا۔ یہاں تک کہ حرف مذہب ، پیسہ کے مقدس پن پر آ جائے ، امریکی معاملات درست کرنے کیلئے بعض اوقات شفاف دروں نیبی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء کے پورے موسم گرما کے دوران، سی این بی سی ، امریکہ میں منتخب مالیات کا چینل، نے توانائی کی گراں ڈیل کمپنی اینرون کے مالیاتی فراڈ ، کو عیاں کیا۔ ’کیا غلط ہوا؟‘سی این بی سی کے ایک حسا ب دان نے روشنی ڈالی۔ چھ ماہ بعد بعد ٹائم میگزین نے اِنہیں سال کی ہستیوں کا نام دیا: کارپوریٹ امریکہ کی مخبری کرنے والوں کو۔ وہ سب خواتین تھیں۔ سب نے جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھیں، کہنے کیلئے قانونی، عدالتی اور سیاسی نظام کا سہارا لیا۔ مسلمان دنیا میں آپ کہاں یہ دیکھیں گے کہ عورتوں کی بدعنوانی کو فاش کرنے پر پذیرائی ہوئی ہو؟ کہیں نہیں، ابھی کہیں نہیں۔

مغرب میں ہم مسلمانوں پر منحصرہے کہ ہم اسلام کے مخبروں کے خلاف نسل پرستی پر مبنی منفی تعامل الزامات کو رد کر دیں اور اِس الزام کو تبدیلی کا شاخسانہ بنائیں۔

تبدیلی کی ترغیب کا مطلب قرآن کو لفظی طور پر لینا نہیں اور نہ کثیر الثقافتی کو لفظی طور پر لینا ہے۔ کیوں عورتوں کے جبری ختنے کو کرنے کیلئے تل جایا جائے؟ کیوں پولیس واپس پلٹ جائے جب ماں یا باپ لڑکی کو مذہب سے باہر شادی کرنے کے فیصلہ کی بنیاد پر مارنے کی دھمکی دیں؟ کیوں مسلمان ٹیکسی ڈرائیور جس نے ایک اپاہج عورت کے ساتھ جبری زنا کیا، کو اپنے رسم ورواج کے ثقافتی حساسیات کی بناء پر رہا کر دیا جائے؟ ایک جرمن پروفیسر اور عامل مسلمان باسام تبی کی بات کو دہراتے ہوئے کہ کیوں انسانی حقوق غیر مسلمانوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں؟

جیسا کہ مغربی لوگ کثیر الثقافتی کے آگے ماتھا ٹیک دیتے ہیں، ہم اکثر وہی کچھ کرتے ہیں جو ہو رہا ہوتا ہے۔ ہم سمو لینے کی آمادگی کو ایک طاقت کے طور پر دیکھتے ہیں۔۔حتکہ ثقافتی برتری کی قسم کو (اگرچہ ہم

میں چند ہی اِس بات کو مانیں گے)۔ مگر فاؤنڈامینٹلسٹ ہماری بشمول جبلتوں کو ہمارے کمزوری کے طور پر لیتے ہیں اور یہ کمزوری ہمیں نرم، ملاوٹی اور لچک دار بناتی ہے۔ فاؤنڈامینٹلسٹ کمزوری کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کا ایمان ہے کہ کمزور کو ختم ہو جانا چاہئے۔ اِس کے برعکس جب ہم کسی کو زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کریں تو اُس کی ہماری 'کمزوری' کے حوالے سے توہین اور بڑھ جاتی ہے۔ سب سے بڑا تضاد یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے تنوع پن کا دفاع کرتے ہوئے ہمیں کم ر وادار ہونا ہو گا۔ اور سب سے اہم ترین بات یہ ہے کہ ہمیں مزید محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

یہ احتیاط ایک روحانی سوال (ضروری نہیں کہ مذہبی) پوچھنا چاہتی ہے: کونسا رہنما اصول سب سے زیادہ ہمارے ساتھ رہتاہے؟ نظریات اور عقائد کی شاندار صف آرائی سے نکال کر وہ کونسی چھاننی ہے جو ہر شخص کی آزاد رائے کو نتھارتی ہے؟ پانی کی طرح بہنے والا لفظ 'برداشت' یاپھسل جانے والا محاورا ''باہم عزت''کو الگ کر کے رہنما اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں تشدد مائل کٹرپن کو برادشت کیا جائے؟'باہم عزت' میں کونسی

شے باہم ہے؟فرانس کے ناول نگار امین معلوف پول کھولتے ہیں، ’’روایات تب تک ہی عزت کی مستحق ہوتی ہیں جب تک وہ باعزت رہیں۔۔ اور وہ بعنیہ تب تک عورتوں اور مردوں کے بنیادی حقوق کا احترام کرتی ہیں(۱۷)‘‘۔ ہم، مسلمانوں اور غیر مسلمان مغربیوں کو اس اصول پر اتباع کرنا ہو گا جو اِس احساس اور اِس احساس کے پیچھے کام کی عکاسی کرے۔ اورجو بھی معاملہ ہو جو معاشرے کو اِس اصول کی طرف نہ لے کر جائے وہ قابلِ برداشت نہیں ہونا چاہئے۔ یہاں پر بات ختم ہے۔

اس نوعیت کی کھینچا تانی اسلام کی مخصوص تشریحوں تک لے جاتی ہے اور بس یہاں تک ہی ہے۔ میں ایک سنسنی خیز مگر سچی مثال دینا چاہوں گی کہ کیا کچھ برداشت کیا جا سکتا ہے اگر ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کیلئے اظہار رائے کی آزادی کو قائم کرنا چاہیں۔ ۱۹۹۹ء میں خود ساختہ ’’ انگلینڈ کی شرعی عدالت‘‘ نے ڈرامہ نگار ٹیرینس مکنالے کیلئے موت کا وارنٹ جاری کیا۔ اُس شو، کورپس کرسٹی، میں حضرت عیسیٰ کو ہم جنس پرست شخص کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اپنی آزادی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بہت سارے عیسائیوں نے

کورپس کرسٹی کے تماشا گر کو ایڈن برگ آنے سے روک دیا۔ شرعی کورٹ کے جج شیخ عمر بن بکری محمد اس مسئلے کو عزت کا معاملہ بناتے ہوئے ایک ہاتھ آگے نکل گئے۔ چرچ آف انگلینڈ کو ' باکرہ مریم اور عیسیٰ کی عزت کو خراب' کرنے پر سخت سست قرار دیتے ہوئے شیخ عمر نے مکنالے کے خلاف فتویٰ جاری کیا(۱۸) اور بعد میں اِس کو لندن میں تقسیم کیا گیا۔ آزادی اظہار رائے؟ کو اس طرح بھی پیش کیا گیا۔ اگر اِس آزادی اظہار رائے پر عمل کیا جائے تو فتویٰ مکنالے کی زندگی کو ختم کردے اور مکنالے کی آزادی اظہار کو صرف کم ہی نہ کرے بلکہ ویسے ہی مٹا ڈالے۔

اگر اِس فتویٰ کواصل متن کے ساتھ بیان کیا جائے تو اِس میں زور دیا گیا تھا کہ مکنالے کی سزا کا تعین صرف اسلامی ملک میں ہی ممکن ہے۔ اور اِس فتویٰ میں مکنالے کو ایک موقع بھی فراہم کیا گیا کہ اسلام اختیار کر لینے سے ڈرامہ نگار سرقلم ہونے سے بچ سکتا ہے۔ آدھا امکان یہ تھا کہ بطور حجالت اُس کی سزائے موت کا پھر بھی مطالبہ ہو سکتا ہے' مگر سزائے موت پر عملدرآمد ہونے کی صورت میں اُس کے خاندان کا خیال رکھا جائیگا اور

اُس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائیگا(۱۹)'۔
ہا ، کیا عالم سرمستی ہے۔
مجھے اِس بات کی ایک معقول وجہ بتائیے کہ کیوں شیخ عمر کو ایک شخص کا مشورہ دینے پر برطانیہ میں رہنے دیا جائیے۔ برطانیہ کی مسلم کونسل کا کہنا ہے کہ شیخ عمر ملک میں رہنے والے دو ملین مسلمانوں کے اَب نمائندہ نہیں رہے۔ اگر یہ سچ ہے ، تب برطانیہ کے مسلمانوں کو خاس طور پر اور مغربی دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں کوشیخ عمر کی سزا یا ملک بدری پر پریشان نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اسلام کی وہ تمام قسمیں جو آزادی پر ایمان نہیں رکھتیں، ایک شخص کے اپنے رستے پر چلے جانے سے ختم ہو جائیں گی۔ صرف صحرائی اسلام نہیں جائیگا اور کیا ہم سب کو اِس امکان پر سُکھ کا سانس نہیں لینا چاہئے؟
میں رہنما اصول کے بارے تجویز دیتی ہوں، ہمیں مغرب میں انفرادیت پسندی کو مان لینا چاہئے۔ جب ہم انفرادیت کو تسلیم کرتے ہیں ، ہمیں اکثر لوگوں کو کو اس بات کا حق دینا ہو گا کہ وہ اپنے بارے جان سکیں، وہ کس مذہب سے تعلق رکھنے والے ہیں، یا آزاد روح ہیں یا پھر دونوں

ہیں۔ اکثر یورپیوں کیلئے ، ’انفرادیت‘امریکی انفرادیت پسندی ہے ، ایسا ضروری نہیں ہے ۔ ”انفرادیت پسندی۔۔ میرے لئے اِس کے معنی ہیں۔۔انفرادیت پن سے اختلاف کرنا۔۔ میں میں ہوں اور میرا معاشرہ میرے انفرادی پن سے فائدہ حاصل کرتا ہے “۔میرا غیرمسلمان یورپ سے سوال یہ ہے : آپ مانتے ہیں کہ آپ کے سولہ ملین مسلمان بطور افراد اپنا کردار ادا کرنے کے اہل ہیں؟ سوال یہ نہیں کہ وہ آیا اس کے اہل بھی ہیں مگر یہ کہ آپ مانتے ہیں کہ وہ اہل ہیں۔

یورپ، کیوں تک مسلمانوں کو پورا شہری ماننے پر ہچکچاتے ہو؟ جرمنی میں بہت سارے مسلمان خاندان دوسری جنگ عظیم سے رہ رہے ہیں۔ کیوں وہ ابھی بھی جرمن کی بجائے دوسری یا تیسری نسل کے تارکین وطن سمجھے جاتے ہیں ؟ خالص ملاپ میں کیا اَمر مانع ہے۔۔ کیا کوئی ایسی بات کہ آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اسرائیل سے متنفر ہیں، اِس کے باوجود اسرائیل غیرملکیوں کو شہریت کب کا عطا کر چکا ہے ؟ یورپ! میں تم سے ملتمس ہوتی ہوں کہ صحرائی قبائلیت اور تمہاری اپنی قبائلیت کے درمیان نامتبرک اتحاد کی شعبدہ بازی

نہ دکھاؤ۔ اپنے تحفظات کو تھوڑا کم کرو اور شمالی امریکہ کے کثیرالثقافتی ماڈل سے کچھ سیکھو، جہاں مسلمان پکے شہری بن سکتے ہیں۔ کیا تم ہمہ جہتی کیلئے اخراجات میں کمی دیکھنا چاہتے ہو کیونکہ اس طرح امریکہ بھی اخراجات میں کمی کر لے گا؟ تم یقینی طور پر امریکیوں کو ناراض کرو گے مگر تم اپنے روشن خیال آباؤ اجداد، ارسطو سے ایراسمس اور کانٹ سے والٹئیرتک کی بھی تکذیب کے مرتکب ہو گے۔ (اور والٹئیر، آئیے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں، امریکی گالیوں کا جام اٹھا کر گا سکتے ہیں'خدا میری پتلون کے اندر شے پر مہربانی فرمائیے'۔)

یورپ! کیا تم اِس افواہ سے عہدہ براَ ہو چکے ہو کہ تمہارا عہد گزر چکا اور لہذاٰ تمہیں مستقبل میں کوئی خطرہ نہیں؟ تم عراق میں امریکہ کی حالیہ جنگ پر بہت آگ بگولہ ہوئے لیکن مسلمان دھرتیوں سے سے ہجرت بھی تمہارے ہاں برانگیختہ مسئلہ ہونا چاہئیے۔تمہارے ایک اقتصادی بلاک کے طور پر قائم دائم رہنے کیلئے تمہارا انحصار تارکین وطن پر اُتنا ہی ہے جتنا امریکہ کے مستقبل کا ہے۔ تمہارے پاس ایک نمایاں ذاتی مفاد ہے کہ

تم عرب مسلمانوں کی جمہوریت قائم کرنے کیلئے مدد کرو اس سے پہلے کہ وہ بڑی تعداد میں تمہارے شہروں تک پہنچیں۔ لہذاٰ کیوں تم اُن عرب حکومتوں کو ہلاتے نہیں جن میں اقلیتی سنی حکومت شیعہ اکثریت پر حاوی ہے؟ آپ میں اکثر کی طرح مجھے بھی مذہبی فرقہ واریت سے چڑ ہے۔ کم و بیش، اِن معاملات میں نسلی عصبیت کے خلاف تمہاری شدید حقارت کہاں ہے؟
تم فلسطینی صحافی رامی خوری کو کیا کہو گے جس نے لکھا ہے کہ 'آزاد، بااعتبار اور مہذب ادارے بحیرہ فارس کے اکثر ممالک، شام، عراق اور لیبیا میں وجود نہیں رکھتے اور سوڈان ، الجزائر، تیونس اور لیبیا میں سرکار کے مکمل کنٹرول میں کام کرتے ہیں؟' یورپ! تم اقتصادی طور پر محنت سے کام کر رہے ہو۔ ہاں،تم اقتصادی طور پر محنت سے کام کر رہے ہواور بلاشبہ تمہیں عرب مخالف نسلی منافرت سے محفوظ رہنا ہے تاکہ اقتصادی بے کلی ختم ہو سکے۔ مگر اُس نسلی منافرت سے بھی احتیاط برتنا ہے جو ضرورت سے زیادہ تلافی کرنے کی صورت میں ساتھ آتی ہے۔ صیہونیوں کو یورپی استحصالی یا نازیوں کے طور پر پیش کرنا

تمہارے ضرررساں ضمیر کے بوجھ کی تلافی کا طریقہ نہیں ہے۔ سب کیلئے انسانی حقوق کی حمایت ہونی چاہئے۔ تمہیں کون آفاقی انسانی آزادیوں کی پامالی کے خلاف مجمعوں کی ریلیاں منعقد کرنے سے روک رہا ہے؟ ممکن ہے کہ تم مجھے یہ بتاناچاہتے ہو کہ وہ حقوق آفاقی نہیں ہیں۔ شاید تمہاری گلوبالائزیشن کے خلاف بے مروت نگاہیں مڑ چکی ہیں ۔۔گلوبالائزیشن ایک ایسا عمل ہے جو طرزِ زندگیوں کا احاطہ کرنے کے بارے متصور کیا جاتا ہے ۔۔ شاید تم نے یہ اخذ کیا ہے کہ 'آزادیوں کی آفاقیت' ایک چرب زبان مٹھاس ہے جو تہذیب کی اکائی کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ اصل بات کی طرف آؤ۔ گلوبالائزیشن کی'' اکائی'' کے تحت، کوئی شخص مجھے سنہری آرکوں کی حمایت کرنے پر درد کی سزا دینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میرے پاس مکڈونلڈ کے مینیو کے نہ پڑھنے کا اختیار ہے۔ میرے پاس نصرت فتح علی خان کی دھنوں پر سر دھنسنے کا اختیار ہے، میرے پاس بیگار کے کام کے خلاف نعرہ لگاتی ٹی شرٹ پہننے کا اختیار ہے اور اُس ٹرین پر سوار ہونے کا اختیار ہے، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ احتجاج کرنے کیلئے

لے جائے اور جس پر سفر کرنے کیلئے باپ کی اجازت ضروری نہ ہو۔اسلامی فاؤنڈامینٹلزم کی اکائی کے تحت ، میں اِن چیزوں کا انتخاب نہیں کر سکتی۔ اور نہ آپ کر سکتے ہیں۔ صحرائی اسلام کی برائیوں کو گلوبالائزیشن کے گناہوں سے جوڑنا مراعات یافتہ طبقے کی غلطی ہو گی، جو مارکیٹ میں متعارف کئے جانے والی دہشت سے زیادہ کسی اور مہلک چیز کو جانتے نہیں ہوں گے ؟
یورپ ! کیا تم تمدن کی پچیدگیوں کے سامنے اتنے ہی متاثر ہو کہ تم تمدن کی یقینی باتوں کو نگاہ سے گم کر چکے ہو؟ یہاں پر ایک شقیل لفظ 'تمدن' ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے دکھایا کہ مسلمان مغربی ثقافتوں میں اپنا حصہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے یورپ کی نشاظ ثانیہ میں دائی گیری کا کردار ادا کیا ہے ، اس سارے عرصہ کے دوران جب انہوں نے یہودیوں ، عیسائیوں اور دوسروں کو ملازمتیں دیں، جنہوں نے یونان، بازنطین اور گرداگرد کی روایات کو اپنایا۔اَب ہماری بین الاقوامی ذمہ داری یہ تعین کرنانہیں کہ کون اس شناخت کا حامل ہے بلکہ آئندہ نسلوں کو یہ بتانا ہے کہ ہم سب پر ایک دوسرے کا کیا کیا حق ہے۔

اس نیت کے ساتھ میں وہاں پر بات ختم کرتی ہوں جہاں سے میں نے شروع کی تھی: اُس اظہارِ تشکر کیلئے جو کچھ مغرب نے میرے لئے کیا اور بالعموم بہت سارے مسلمانوں کیلئے بھی۔ میں اسلام کی اصلاح میں مددگار کی خواہشمند کی حیثیت سے مغرب کی قرضدار ہوں۔ اپنی تمام تر دیانتداری کے ساتھ میرے ساتھی مسلمانو! آپ بھی ایسا کریں۔

حوالہ جات:

۱۔ سلمان رشدی کا ٹورونٹو میں ۲۰ستمبر ۲۰۰۲ء کو ایک انٹرویو۔ مکمل سکرپٹ کو پڑھنے کیلئے ویب سائٹ کے انگریزی حصہ کے اِس حوالہ کو کلک کریں۔

۲ ۔ Khaled Abou El Fadl (speech to the Canadian Council of Muslim Women), Toronto, September 14, 2002

۳۔ The article in question is by Daniel Pipes and Lars Hedegaard, "Muslim extremism: Denmark's had enough," National Post, August 27, 2002

۴ ۔ Yasmin Alibhai-Brown, After Multiculturalism (London: Foreign Policy Centre, 2000), p. 7

۵ ۔ Sulayman S. Nyang, "Why the Public Square?" www.projectmaps.com

۶ ۔ Anwar Ibrahim, "The Need for Civilizational Dialogue" (speech to Georgetown University, Washington, DC), October 6, 1994

۷ ۔ میں اِس اخبار کا نام سرعام بتا نہیں سکتی مگر میں اُس انتہا کا ذکر کرونگی جس کا اظہار اِس کے ناشر ظفر بنگش اسلام کے بحران کے ضمن میں مسلمانوں کے علاوہ ہر کسی کے بارے کرتے ہیں۔ ۱۵نومبر ۲۰۰۲ء کو ٹی وی اونٹاریو کے پروگرامDiplomatic Immunity میں ظفر بنگش نے کہا، ’’"The Muslims have been denied their destiny by colonialists, and they are struggling against that."۔ انٹرویو کرنے والے Steve Paikin نے پوچھا، ’’اگر اسرائیل کا وجود نہ ہوتا، اگر چیچنیا آزاد ہوتا، اگر کشمیر ایک الگ ملک ہوتا، اگر امریکہ سعودی عرب کی بجائے سارا تیل البرٹا سے لے

رہا ہوتا اور اپنی تمام افواج واپس بلا چکا ہوتا، کیا آپ کہہ رہے ہوتے کہ اَب اسلامی دنیا میں ہر چیز درست ہو چکی ہے؟ اِس کے جواب میں ظفر بنگش نے کہا۔

Absolutely; they'd have no problem. They still"
".have no problem

۸۔ Abdul Malim Musa quoted by David Corn,
"Capital Games," The Nation, February 10,
2002, p. 2 of online version

۹۔ ''www.wluml.org, found under "Part One:
The Context of our Struggle

۱۰۔ Matthew A. Levitt, Testimony to U.S.
Senate Committee on Banking, Housing, and Urban Affairs (Subcommittee on International Trade and Finance), The Role of Charities and NGOs in the Financing of Terrorist Activities,"
August 1, 2002

۱۱۔ In World on Fire (New York: Doubleday,
2003), Yale academic میں Amy Chua لکھتی ہیں
''اگر امریکی یہودیوں کو امریکہ میں نسلی اقلیت کے طور پر دیکھا جائے تو وہ امریکہ کی اقتصادیات پر

چھائے ہوئے نہیں۔۔۔دس امیر ترین امریکیوں میں سے ایک بھی یہودی نہیں ہے۔‘‘ (صفحہ ۱۸۹)

۱۲۔Noam Scheiber, "Numbers in the News: Is there really an army of terrorists in our midst?" New York Times Magazine, February 16, 2002, p. 12

۱۳ ۔ Mandela condemns US stance on Iraq,"" www.bbc.co.uk, January 30, 2003

۱۴ ۔ انگریزی کے حصہ میں اِس حوالہ میں کلک کر کے وڈیو کلپ کو دیکھیں۔

۱۵ ۔ اِس حوالے سے ایک اور مثال Rogue Nation: The America the Rest of the World Knows (Toronto: McClelland & Stewart, 2003). The author, Toronto Star journalist Peter Scowenسامنے آتی ہے۔ مصنف امریکہ کو دہرے معیار، خود ہی اپنے مسائل گھڑنے کا ذمہ دار اور اپنے آزاد رو خیالات کی دھجیاں بکھیرنے والا قرار دیتے ہوئے سخت تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ اِس کے باوجود ایک بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے ’’میں National Security Archivesکا احسانمند

ہوں کہ اُس کی اَن تھک کاوشوں سے امریکہ کے تمام ڈیپارٹمنٹوں اور ایجنسیوں کی اہم دستاویزات کو انٹرنیٹ پر مہیا کر دیا ہے۔ (p. vi) ۔ مصنف اُس شخص کی عمدہ مثال ہے جو بآسانی امریکہ پر تنقید کر سکتا ہے کیونکہ وہ ایسا ملک ہے جو مخالفین کو بھی برداشت کرتا ہے ، فقط مداحین کو ہی نہیں۔

۱۶ ۔ Bassam Tibi, The Challenge of Fundamentalism: Political Islam and the New World Disorder (Berkeley: University of California Press, 1998), p. 205

۱۷ ۔ Amin Maalouf, In the Name of Identity: Violence and the Need to Belong (New York: Arcade Publishing, 2001), p. 106

۱۸۔ James Lyons, "Islamic court condemns author who depicts Jesus as homosexual," The Independent, October 30, 1999, p. 1 of online version

۱۹ ۔ James Lyons, Ibid ۔ شیخ عمر کے جواب میں دو ہم جنس پرست گروہوں ، the Lesbian Avengers and Outrage، نے اُس کے خلاف "Queer Fatwa" دیا ہے۔

فتویٰ میں کہا گیا ہے۔ ’’عمر بخاری محمد کو ایک ہزار سال کی بامشقت اغلام بازی کی سزا دی جاتی ہے‘‘۔
اِس سزا پر ترس کھائیے۔

مغرب کیلئے خدا تیرا شکر

یونیورسٹی آف ٹورونٹو میں جمعہ کی ایک دوپہر ہے۔ نوجوان مسلمان ہارٹ ہاؤس کے مباحث ہال سے گروہ بندی کی شکل میں باہر نکل رہے ہیں، ہارٹ ہاؤس یونیورسٹی کا جرمن طرز تعمیر والا اسٹوڈنٹ سنٹر ہے۔ وہ ٹھیک اُس مقام پر نماز ادا کر رہے ہیں جہاں وزراء اعظم اور صدور نے ارفعٰ دلائل اور ظرافت کا تبادلہ خیال کیا ہوا ہے۔ یونیورسٹی کا دورہ کرنے والے دنیا کے مشہور لوگوں کی فریم شدہ تصویریں دیواروں کو عزت بخش رہی ہیں۔ آپ وہ تصویریں اکثر جمعہ کی دوپہروں کو نہیں دیکھ پاتے کیونکہ اُن کو عمدہ طریقہ سے سلائی کئے ہوئے پارچوں کے چوکٹوں سے چھپا دیا جاتا ہے۔ ہارٹ ہاؤس نے ہر پورٹریٹ کے دونوں اطراف دیوار میں مضبوط کیلیں ٹھونک دی ہیں تاکہ چہروں پر کینوس لٹک سکے، اُن کو احترام کا پیغام دیتے ہوئے جو خدا کے حضور نماز پڑھنا چاہتے ہیں، خدا کی مخلوقات کے حضور نہیں۔ ہر کوئی سوچتا ہے کہ کیا طالبان نے کسی

بھی حالات میں تاریخی بدھا کے مجسموں کو بم سے اُڑانے کی بجائے غلاف چڑھانے کا نہ سوچا تھا۔ کوئی یہ بھی سوچتا ہے کہ کیا مسلمان طلباء کو اندازہ ہے کہ یہاں پر اُن کے ساتھ کیسا اچھا سلوک ہوتا ہے۔
'یہاں' سے میری مراد صرف رنگ برنگا شہر ٹورونٹو نہیں ہے۔ ہالیفیکس کو لے لیجئے۔ میں وہاں دو ہی طرح کے حلیے دیکھنے کی توقع کر سکتی تھی: سیاحوں کے ہوٹلوں میں مرد عملے کو ٹارٹن ڈیزائن کے کپڑے پہنے اور قریب کے فوجی کیمپ کے سپاہیوں کو مشقوں کی تھکاوٹ کے حلیے میں۔ ہالیفیکس میں بارش سے بھیگے جمعہ کے روز میں نے ایک شخص کو صحرائی عرب کے مکمل جبے میں ملبوس باہر نکلتے دیکھا، جبے کی سفید رسی لہرا رہی تھی، ماتھے کے اوپر کپڑا گر رہا تھا، سینڈل یہاں تک کہ پتلی چھڑی ، سب کچھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ جمعہ کی نماز سے لیٹ ہونے کی وجہ سے وہ شخص ٹیکسی کو اشارے کر رہا تھا جبکہ موبائل فون پر گفتگو بھی کئے جا رہا تھا۔ میں نے اُس سے کچھ پوچھنے کیلئے مداخلت کی۔ ابراہیم (ایک دوسرے شخص) نے مجھے بتایا کہ وہ اپنا اسلامی اعزازی لباس

ہر جمعہ کو پہنتا ہے۔ اور وہ یہ کام دس برسوں سے کر رہا ہے۔ کوئی ہراسمنٹ، میں نے پوچھا۔ ایک بار بھی نہیں۔ اِس کے بالکل برعکس، ابراہیم ڈلہوزی یونیورسٹی میں ہاٹ ڈوگ بیچتا ہے، وہ سب اُسے پیار سے ڈوگ فادر کہتے ہیں(۱)۔

بعد میں ہالیفیکس ائیرپورٹ پر ایک مسلمان عورت میرے سامنے لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سیاہ لباس میں ڈھکی ہوئی تھی، سر سے پاؤں تلک اور ہاتھوں پر کالے دستانے تھے۔ مصروف ہونے کی وجہ سے لاؤنج میں اِس عورت کے بارے کوئی ہلچل نہ تھی۔ لوگ کافی حلق سے اتارنے سے پہلے اُس کا ذائقہ لے رہے تھے۔ اور ہنوز صرف میں اُس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگ جارحانہ ہونے کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ ایسا تھا کہ کوئی اُس کے حصار میں نہیں آ پایا تھا۔ گیٹ کی جانب بڑھنے سے پہلے وہ اٹھی اور اُس نے اپنی چادر کو درست کیا۔ کسی نے گھور کر نہیں دیکھا۔ جب وہ لاؤنج سے باہر نکلی تو میں نے ایک جوڑا دیکھا جس نے اپنے سروں کو تھوڑا اٹھایا اور پھر وہ اِس معمے کو سمجھنے کی کوشش میں لگ گیا۔

مسلمانوں کے خلاف مبالغہ آمیز ردعمل کی تشہیر کے مقابلے میں ایسے واقعات بہت کم ہیں ۔ میں انکار نہیں کرتی کہ گیارہ ستمبر سے ، بلا اشتعال غصہ چند ’عرب دکھائی دینے والے‘ لوگوں (جن میں اسرائیلی یہودی بھی شامل ہیں) پر پھوٹا ہے (۲)۔ اور وہ جنہیں اِس غصے کا سامنا کرنا پڑا اُسے چاہئے کہ اِس بارے بولے۔ میں نے ۱۹۹۱ء کی گلف وار کے دوران میڈیا سے تب فوری رابطہ کیا تھا جب ایک اسکیورٹی گارڈ بغیر کسی وجہ کے مجھے ایک سرکاری عمارت سے باہر لے آیا تھا۔ مگر جو بہت کم سنا جاتا ہے ، جس کو کم اہمیت دی جاتی ہے اور جس کی تشہیر بھی کم ہوتی ہے ، وہ اِس ساری صورتحال کے برعکس’ اسلام فوبیا‘ ہے۔ ۔ مسلمانوں کیلئے شائستگی بن مانگے ہی پھوٹ پڑتی ہے۔

شمالی امریکہ میں شائستگی کا بھرپور طور سے اظہار ہوا ہے۔ گیارہ ستمبر کے فوراًبعد یہودی اور عیسائی پادریوں نے مسلمان رہنماؤں کے ساتھ رابطہ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے عقائد کے اکٹھ کی غرض سے اجتماعات کئے ، پریس کانفرنسیں بلائیں اور چندہ جمع کیا تاکہ مسلمان کسی بھی آئینی تبدیلی کا دفاع کر

سکیں جو پابند سلاسل کرنے کے شوقین حکام کے راستے مسدود کرنے کے مترادف تھا۔ دہشت گردی کے حملے کی رات جب صدمے نے ہم سب کو سُن کر دیا تھا، مجھے ٹورونٹو کے ایک معروف پادری نے فون کیا۔ اُس نے جاننا چاہا کہ کیا میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور وہ میری اِس ضمن میں کس نوعیت کی مدد کر سکتا ہے اگر مجھے کسی نفرت آمیز حرکت کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ اگلے تین دنوں کے دوران میرے یہودی دوستوں نے ہر کسی سے زیادہ میری حفاظت کا خیال رکھا۔ نوجوان مسلمانوں کے ساتھ میری نجی گفتگو نے مجھے ویسا ہی تاثر دیا: اساتذہ، ہمسایوں، ساتھی کارکنوں اور انٹر نیٹ کے 'چیٹ رومزمیں آنے والوں' نے تنگ نظری کو ختم کرنے کیلئے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا۔

میں نے اِس شائستگی کے بارے پولیس، ایک نسلی منافرت کے خلاف تنظیم، اعدادوشمار چبانے والوں اور ایک قومی براڈ کاسٹر کو اطلاع دی۔ پہلے تین اداروں کو یہ سمجھ نہ آئی کہ وہ میری اِس اچھی خبر کا کیا کریں۔ یہ اچھی خبر اُن کی اکٹھی کرنے والی اشیاء کے معیار کے مطابق نہ تھی۔ جہاں تک براڈکاسٹر کا تعلق

ہے؟ میرا رابطہ ایک سفید فام آدمی سے ہوا ، اگر یہ اہمیت رکھتا ہے تو۔۔اُس نے کہا کہ شائستگی کے ذکر سے یہ تاثر ملے گا کہ جیسے نسلی منافرت کے آزار سے انکار کیا جا رہا ہو جس کا سامنا بہت سارے مسلمانوں کو کرنا پڑا ہے۔ اُس نے پوچھا ، 'ہم اِس کے جواب میں کیا کہیں گے'؟ یہ کہہ لینا: اگر اسلام کا نیک جذبہ جاننے کی ضرورت ہے تو مغرب کا ویسا ہی جذبہ جاننے کی ضرورت ہے۔

ہم، مسلمان اور مغرب، ایک جیسے خاص نہیں ہیں اور یہاں تک کہ امریکہ بھی ہمیں اِس بات کا احساس دلاتا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی کی ایک نامور یونیورسٹی جارج ٹاؤن میں ایک امام کی تقرری ہوئی ہے۔ امریکی افواج میں تو کئی امام ہیں۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء میں، امریکی محکمہ ڈاک نے عید مبارک کہنے کیلئے اعلیٰ درجے کی ٹکٹ جاری کی، عید جو مسلمانوں کے کیلنڈر کا سب سے بڑا ''پارٹی ڈے'' ہے۔ 'یہ محکمہ ڈاک، مسلمان کمیونٹی اور امریکیوں کیلئے بالعموم فخریہ گھڑی ہے(۳)'، اخبار عرب نیوز نے عزیزالی جعفر کی اِس بات کو نمایاں کیا۔ جعفر امریکی محکمہ ڈاک کے ذرائع ابلاغ اور تعلقاتِ عامہ کے

نائب صدر ہیں۔ ممکن ہے عید کی ٹکٹ ایک بوگس علامت ہو مگر ایک قابلِ احترام امریکی ادارے کا مسلمان اعلیٰ عہدے دار ہونا چھوٹی بات نہیں۔

’دی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امیرکا‘ (اِسنا) دنیا کے اِس حصے میں مسلمانوں کی آزادانہ سرگرمیوں کی تصدیق کرتی ہے۔ ’ امریکی مسلمان بطور شہری بے شمار تعلیمی اداروں اور کام کاج کے مواقع تک رسائی رکھتے ہیں‘، اِسنا نے اِس بات کا اعلان کیا۔ ’ اِن مواقع کا دائرہ کار وائٹ ہاؤس اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں پبلک سروس جابس، انٹرنشپس اور فیلوشپس کے عہدوں کیلئے امریکی صدر کی سیاسی تقرریوں تک ہے(۴)‘۔ اُردن کی ملکہ نور کے والد نجیب ہلابی نے صدر کینیڈی کے دور میں فیڈرل ایوی ایشن ایڈمنسٹریشن کی سربراہی کے فرائض سرانجام دئیے۔ ملکہ نور نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ صدر کینیڈی کو ذاتی طور پر اُن کے والد اِس عہدے کیلئے دل کو بھائے تھے(۵)۔ اِس کے برعکس سعودی عرب جس طرح ’’بیرونی‘‘ اقلیتوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے، کیا تضاد ہے۔

صحرائی اسلام کے منحرفین یہاں پر کیا کرتے ہیں، جب

وہ اپنے ملکوں سے جلاوطن ہوتے ہیں تو یہاں پر زندگی کیسے گزارتے ہیں؟ بہت سارے جلاوطن امریکی کالجوں میں لکھنے پڑھانے کاکام آزادی کے ساتھ کرتے ہیں۔ 'کیا آج کل امریکی مسلمان بن کر رہنا مشکل ہے؟' میں نے اپنی آنٹی سے جو جارج ڈبلیو بش کی ریاست ٹیکساس میں رہتی ہے۔

''نہیں''، انہوں نے اِس بات کو غیر حقیقی قرار دیا۔ 'نہیں، اگر تم پُراعتماد ہو تو تمہیں چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں'۔ گیارہ ستمبر کے روز وہ ہوسٹن میں ایک اسلامی اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ میں نے اُس کمیونٹی ردعمل کے بارے پوچھا جس کا سامنا اسکول کو کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے مجھے ہمدردانہ خطوط، کارڈز، فون کالوں اور پھولوں کے بارے بتایا جو ٹیکساس کے عام شہریوں نے بھیجے تھے۔ اُن کی یادداشتوں میں یہ بات آڑے آ گئی کہ کیلیفورنیا کے جنوبی حصے کے اسلامی سنٹر کی بات لاس اینجلس ٹائمز نے کس طرح سنی۔ 'ہم تو مغلوب الجذبات ہو گئے (۶)'، اسلامی سنٹر کے مذہبی ڈائریکٹر نے کہا تھا اور اُس نے مغلوب الجذبات بہت گرمجوشی کے ساتھ کہا تھا۔ گیارہ ستمبر کے سانحے

کے بعدایک صحافی دوست امریکی جھنڈا لہراتے فارم ہاؤسوں میں گئے اور مسلمانوں کیلئے ویسے ہی اچھے جذبات دیکھے۔ 'ایک دن'، اُس نے مجھے بعد میں لکھا، 'مجھے امید ہے کہ کوئی کشادگی، محبت اور ذہانت کی اِس لہر کو ترتیب وار لکھے گا جو دہشت گردی کے حملے کے دوماہ بعد تک امریکہ میں نمودار ہوتی رہی(۷)'۔ میرا یہ دوست بائیں بازو کی ہمدردی رکھنے والا ہے اور آج تک وہ میری طرح یہ نہیں سمجھ پاتا کہ کس طرح خدا کی اِس سرسبز دھرتی پر مہذب پن کو تسلیم کرنانسل پرستی ہے۔

شکریے کے جس اعتراف سے میں بہت زیادہ محظوظ ہوتی ہوں وہ یہ ہے، ' میں شکی القلب انسان ہوں'، مسلمان دھڑے بند سارہ ایلتانتوی نے لاس اینجلس ٹائمز کو بتایا۔ ''مگر میرا دل اُس گرمجوشی اور خلوص سے بھر آیا ہے جو لوگوں کا اسلام کے بارے جاننے سے متعلق ہے(۸)'۔ گیارہ ستمبر کے بعد قرآن کے تین ایڈیشن ایمازون ڈاٹ کام پر 'بیسٹ سیلرز' بن گئے۔یونیورسٹی آف نارتھ کیرولائنا نے نئے طالبعلموں کیلئے قرآن سے متعلق کتاب پڑھنا ضروری قرار دے دیا۔ اگرچہ اِس کے

نتیجہ میں ایک ’لاء سوٹ‘ کا مقدمہ سامنے آیا اور ساتھ ہی ٹھپ ہو گیا ، یہ مقدمہ یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ باڈی کے صدر اکیس سالہ طالبعلم سید جینیفر دوآم نے امریکی معاشرے پر جواباً تبصرہ کرتے ہوئے دائر کیا تھا۔ ’میر ا یہ احساس ہے کہ اگر آپ ایسے خیالات پڑھنے کیلئے ذہنی طور پر تیار نہ ہوں، جو آپ کے اپنے نہ ہوں اور جن سے آپ اختلاف کر سکتے ہوں تو آپ خودکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ادارے سے ناطہ نہیں جوڑ سکتے ‘۔

کھوج کا یہ جذبہ آکسیجن کی طرح ہے جس کی بناء پر میں شمالی امریکہ کی بہت شکرگزار ہوں۔ زیادہ تر مسلمان دنیا میں، اگر آپ اُس سے زیادہ ہیں جو آپ کو سمجھا جاتا ہے تو آپ کمتر تصور کئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر شمالی امریکہ میں مسلمانوں کے پاس ہمہ جہت ہونے کی آزادی ہے۔ یہ آزادی تمام قسموں کے لوگوں کیلئے ہے۔ گیارہ ستمبر کے سانحہ کا نیویارک میں ایک شکار فادر مائیکل جج تھے جو ہم جنس کیتھولک پادری تھے اور جن کا سوگ آگ بجھانے والوں نے منایاجن کے وہ سالہا سال سے روحانی پیشوا تھے۔ لوگوں کی رنگا رنگی اور خیالات

کے متنوع پن نے یہ ربط قائم کیا۔ میں نے یہ ربط استوار کیا اور اِس ربط نے ابھی تک میرے اسلامی عقیدے کو برقرار رکھا ہے۔

اگر میں مسلمان ملک میں پیدا ہوئی ہوتی توغالباً دل ہی دل میں میرا خدا سے ایمان اُٹھ چکا ہوتا۔ میں آج تک اِس لئے بچی ہوں کہ میں دنیا کی اِس نکر میں رہتی ہوں جہاں میں سوچ سکتی ہوں، اختلاف کر سکتی ہوں اورکسی بھی موضوع پر مزید جانچ پڑتال کر سکتی ہوں، اور میں یہ سمجھی ہوں کہ اِسی لئے میں نے ابھی تک اسلام کو نہیں چھوڑا۔

بہت تلاش و بسیار کے بعدقرآن کے بارے میری ذاتی تشریح مجھے بار بار عود کر آنے والی تین باتیں سجھاتی ہے۔ ایک، صرف خدا ہی ہر شے کے بارے پورا سچ جانتا ہے۔ دوسرا ، صرف خدا ہی نہ ماننے والوں کو سزا دے سکتا ہے ، صرف خدا ہی جانتا ہے کہ سچا عقیدہ کیا ہے۔ (اور قرآن کے پہاڑوں جیسے پھیلے طرز بیان میں یقیناً خدا ہی جانتا ہے کہ یہ ساری باتیں کس طرح ایک ساتھ بیان ہوتی ہیں۔)انسانوں کو تو بداعمالی سے خبردار کیا گیا ہے لیکن یہی کچھ ہے جو ہم راست

بازی کو بڑھانے کی خاطر کر سکتے ہیں۔ تیسرا ، نتیجتاً حاصل ہونے والی ہماری پستی ہمیں خدا کی مرضی کے بارے سوچ بچار کرنے کی آزادی مہیا کرتی ہے۔۔ بغیر کسی احسان کے طے شدہ اصولوں پرعمل کرنا۔ 'مذہب میں کوئی جبر نہیں ہو گا(۹) '،دوسری سورہ سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔ 'تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین(۱۰)'، سورہ ۱۰۹ سے یہ آوازآتی ہے۔ اِس سب کے درمیان، یہ ہے: 'اگر خدا چاہتا تو وہ تمہیں ایک نسل میں پیدا کر سکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہ کیا۔۔۔(۱۱)' اور یہ سچ ہے۔

میری تشریح مجھ پر روشنی ڈالتی ہے کہ کیوں میں ایک مسلمان کی حیثیت سے اسلام کے اعلیٰ دماغوں کے بارے خاموش نہیں رہ سکتی، چاہے وہ اسامہ بن لادن کی شکل میں انتہا پسند ہوں یا میرے مدرسہ کے استاد مسٹر خاکی کی طرح مرکزی دھارے کے ہوں۔ 'جبر کے بغیر' اپنے نتائج اخذ کر لینے کے بعد یہ لوگ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور دوسروں کو ویسا کرنے سے روکتے ہیں جو وہ خود کرتے ہیں۔ اُس موڑ پر، قرآن سے جاری فرمان کے مطابق 'متنبہ' کیا گیا ہے اُن اعمال سے جن پرقرآن

کے مطابق دوسروں کے اعمال کے امتحان کی اجازت نہیں ہے۔ میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ہمیں تلاش وبسیار کی آزادی سے صرف خوش نہیں ہونا چاہئیے بلکہ اِس بات کو بھی یقینی بنانا چاہئیے کہ یہ آزادی ہر کسی کو میسر ہو۔ اِس سے کم خدا کی خدائی کو اعلیٰ وارفع اور عادلِ کامل سے نیچے گرانے کے مترادف ہے۔ ایسا شخص، آزاد فکری کی منطق کے ساتھ، ہر لحاظ سے درست ہے اور مکمل طور پر اُن خیالات کا ہم آہنگ ہے جو میں بطور مغربی شخص کے رکھتی ہوں۔

میں ہمہ جہتی کی بات کر رہی ہوں، کھپت بازاری کی بات نہیں کر رہی۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ مغربی خیالات ہمیں صرف شیطانی شرانگیزیوں کے جدید خبط میں مبتلا کر سکتے ہیں، تو مجھے بتائیے کہ کیوں میں نے اپنے روحانی کرب کے دوران بھی کچھ خریدا نہیں (صرف ایک چیز کے جو انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ ہے)۔ فوری تسکین مجھے اہم معاملات میں موڑ کی گھڑی تسکین نہ پہنچا سکی جب میرے باس نے مجھ سے پوچھا کہ کہ کیسے میں اپنے اسلامی عقیدے میں زنا بالجبر کی شکار نوجوان نائیجیرین خاتون کو کوڑوں کی

سزا کاحقدارقرار دیتی ہوں۔ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو آزادی فکر پر مسرور ہوتا ہو، میں اُس کا سوال کرنے کا حق تسلیم کرتی ہوں، کیا آپ نہیں کرتے؟یا کیا آپ اُس کے خلاف ہراساں کرنے کا مقدمہ دائر کر دیں گے؟ کیا وہ مجھے خاموش کرا رہا تھایا اپنے مذہب کو الگ کر کے پیش کر رہا تھا کہ میں اس طرح اُس کے مذہب کے بارے سوچوں؟ اُس کا چیلنج کو قبول کرتے ہوئے کیا میں اشتراکی نما استعماریت کی خود تنفری کی حالت میں چلی گئی تھی یا باقی ماندہ زندگی کیلئے عصبیت زدہ بن گئی تھی؟ بطور مسلمان، میں کس طرح کی تربیت لیتی اگر میں عکاسی سے مبرا ہونے کا 'حق' لینے پر زور دینا چاہتی؟

آپ میں سے سیکولر اذہان کیلئے یہ سوالات ہیں ۔ میں آپ کے اپنے مذہب سے اوپر چلے جانے پر آپ کے انتخاب کا احترام کرتی ہوں۔۔لادینیت۔۔ مگر میں نے اپنی نابلوغیت کا کاڑ کباڑ اکٹھا کر کے کیا حاصل کیا؟ مذہب نے مجھے اقدار مہیا کی ہیں (جس طرح نظم و ضبط) جو شمالی امریکہ کی مادہ پرست زندگی کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اِسی مقابلے کا نتیجہ ہے کہ مجھے غوروفکر کی ترغیب ملتی

رہتی ہے۔ مذہب اور سیکولرزم کے مابین تناؤ مجھے متبادل سچائیوں کا کھوج لگانے کی رہنمائی کرتا ہے اور مجھے اپنی ہی انتہا پسندی میں تباہ ہونے سے بچاتا ہے، چاہے یہ انتہا پسندی حقوق نسواں کی ہو، قومیت پرستی کی ہو یا پھر کثیرالثقافتی مظہر کی۔ مذہب نے مجھے کسی ایک کے آگے جھکنے پر مجبور کیامگر خدا مسلسل میرے شعور میں ٹھکانہ کئے ہوئے ہے، ایک قیمتی مہارت جو بے سمت گھمن گھیری کے عہد میں میرے اندر پیدا ہوئی۔ اچھا ہوتا اگر مذہب مجھے یہ سکھاتاکہ مجاز کے ساتھ حاکمیت کو کنفیوژ نہ کرو۔ آپ شاید مزید اس طرح کی باتیں سننا چاہیں خاص طور پر وہ، جو آہستہ آہستہ تمام مذاہب کو ’غیرعقلی‘ قرار دے چکے ہیں،بعض اوقات یہ بھول جاتے ہیں کہ عقلیت اپنے آپ کا ہی تضاد بن جاتی ہے۔

تسلیمہ نسرین، جو ماہر حقوقِ نسواں کے ساتھ ساتھ طبیب بھی ہیں، نے مجھے کہا کہ ’زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، جب تم مر گئے تو مر گئے، خاتمہ، ختم شد(۱۲)‘۔

’خالص سائنسی نقطہ نظر سے ، یقیناً‘، میں نے جواب

دیا۔ ’مگر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ سائنسی نقطہ نظر کسی دوسرے نقطہ نظر سے زیادہ برتر ہے؟

’کیونکہ یہ سچ ہے‘۔

’کیا تم فرسودیت کے خلاف لڑ نہیں رہی؟‘

’میں سچ کیلئے لڑ رہی ہوں۔ پریشان حال عورتیں مذہب میں پناہ ڈھونڈتی ہیں اور مذہب اِس کام کیلئے ہے۔ مذہب کمزور لوگوں کیلئے ہے، جلد متاثر ہو جانے والے لوگوں کیلئے، لاعلم لوگوں کیلئے، بیوقوف لوگوں کیلئے۔ مگر کیوں ہم پہلے مقام پر ہی کمزور اور متاثر شدہ ہو جائیں؟‘‘

’’تسلیمہ، تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے ناقدین کہہ سکتے ہیں کہ تم ایک بہت بڑے گڑھے میں گر رہی ہوجس کے بارے تمہارا دعویٰ ہے کہ لوگ اِس میں گرتے ہیں۔ تم سائنسی طور پر مافوق الفطرت ہو۔‘

وہ ہنس پڑی۔ ’ میں سائنسی طور پر مافوق الفطرت نہیں ہوں، میں سچ کیلئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ بڑے سچ کیلئے نہیں، جو خدا کے بارے سچ ہے بلکہ چھوٹے سچ کیلئے کوشاں ہوں۔‘

’مگر تم خدا پر یقین نہیں رکھتی‘۔

مزید تکرار کے بعد اُس کا بڑا سچ باہر آ گیا۔ ’ میں مذہب

کوصرف اس لئے ختم کرنا چاہتی ہوں کیونکہ مذہب انسانیت کا دشمن ہے۔ اگر مذہب انسانیت کا دشمن نہ ہوتا، میرا اِس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ ہوتا‘۔ خیر یہ مناسب بات تھی۔

کم مناسب بات تو یہ فرض کر لینا ہے کہ مذہب جابرانہ طور پر ’انسانیت کا دشمن‘ ہے۔ مائیکل مور امریکہ کی ایک زہرخند اور شورانگیز شخصیت ہے جو عوام کے پاس اقتدار کی حامی ہے، کا اپنے قریبی دوست جیف گبس سے کہنا ہے کہ اُس نے انصاف کو کیتھولزم کی جڑوں سے سیکھا۔ جمی کارٹر کے بقول اسرائیل کی منارکیت کا آغاز ہوتا ہے اور مصر کے انور سادات اظہار نشکر کے طور پر اِس منارکیت کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہیں، یہ یہودی اور مسلمان اقدار کیلئے کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ ایک ہندو جہادیے نے مہاتما گاندھی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا، ابھی مہاتما گاندھی نے دنیا کو ہلا دینے والے غیرمتشدد نظریہ مزاحمت کو متعارف ہی کرایا تھا جسے ستیاگراہا کے نام سے جانا جاتا ہے جس کا جنم ہندوازم اور جین ازم سے ہوا۔آئیے اس کے بارے سوچئے، میں نے کبھی کسی فنا فی الانسانیت شخص کو دلائی

لامہ کی مذہب قبولیت کو رد کرتے نہیں سنا مگر ایک شخص ہے جس نے یہ کیا وہ دلائی لامہ کا جانشین ہے۔ دلائی لامہ، مارٹن لوتھرکنگ جونئیر، ڈیسمنڈ ٹوٹو، مالکن مارشل۔ کو 'اہلِ مذاہب' ہونے کی وجہ سے بھولا جا سکتا ہے اور اس بناء پر جو کچھ انہوں نے مذہب کے حوالے سے کیا۔ اِن سب نے اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کوقربان گاہ کے کمزور ہوتے ڈھانچے سے باہر نکالا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے، ہم مغرب میں بسنے والے اس کایا کلپ کے نقیب ہو سکتے ہیں۔ ہم ایسا صرف اسلامی فاشسٹوں کی مذمت کرکے ہی نہیں کر سکتے بلکہ اسلام کا جوش ابھارنے والے بننے سے انکار کی صورت میں بھی کر سکتے ہیں اور اُن کی نفی کر کے جو مسلمانوں کے احساسِ کمتری کی آگ کو بھاری بھر کم تبدیلی دوسرے کے سر تھوپ کر سلگاتے ہیں۔ ہمیں اپنی شکار شدہ ذہنیت کو اُتار پھینکنے کی ضرورت ہے۔

یہ آسان نہیں ہو گا۔ میں اِس کی وضاحت ایک دوسرے نمایاں 'شکار کنندہ' متوسط طبقے افریقی امریکیوں کی صورت کروں گی۔ ۲۰۰۱ء کے موسمِ گرما کے دوران میں اور مشعل جارجیا کے شہر اٹلانٹا گئے ۔ ہفتہ کے روز ہم

نے جمی کارٹر صدارتی مرکز کا دورہ کیا، اس ادارے کا نام ایک ایسے رہنما کے نام پر رکھا گیا ہے جس نے ملکی ایجنڈا میں شخصی آزادیوں کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مجھے اور چند کام کرنے والوں کو چھوڑ دیجئے، ہمارے علاوہ کارٹر سنٹر پر ہر کوئی گورا تھا۔ ہمارے اس تین گھنٹہ کے دورہ کے دوران کوئی کالا دیکھنے کو نہ ملا۔ بعد میں ہم مارٹن لوتھر کنگ جونئیر کے مقبرہ پر گئے، ایک سنگِ میل جو افریقی امریکیوں اور چند گوروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے جاننا چاہا کہ کتنے لوگ کارٹر سنٹر بھی جاتے ہیں۔ میں نے پوچھنا شروع کیا۔

کوئی شخص بھی کارٹر سنٹر کے بارے جاننے کی دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ ایک جوڑے نے فقرہ کسا۔ 'کیوں ہم اپنا وقت ایک سفید آدمی کے مقبرے پر ضائع کریں؟' اُم، کیونکہ پادری کنگ کو خراجِ تحسین پیش کرنے سے تم اصل میں نسلی تفریق کے ازالے کو ایک طرح سے سلیوٹ کر رہے ہو۔ اور چونکہ یہ صرف آدمی کی جلد کا رنگ ہی نہیں ہے اور اُس کے کردار کا وزن بھی ہے جس کو اہلِ بصیرت سراہتے ہیں اور وہ اُس کی قبر پر اپنی تصویر بھی کھچواتے ہیں اور اِس کو ناز

کے ساتھ خمیدہ صورت لٹکاتے ہیں۔
میں آزادی کے کے جائز نقطہ پر افریقی امریکیوں کی بے کلی کو سمجھتی ہوں۔ اِس کی بنیادیں گہری ہیں۔میرے اٹلانٹا کے دورہ کے دوران شہر کے اخبار نے لکھا کہ جارجیا کی متعدد کاؤنٹیاں ’وکلاء کے ساتھ معاہدہ کیلئے‘ طے شدہ فیس ادا کر رہی ہیں۔ یہ وکلاء اِن کے غریب اور سیاہ فام لوگوں کے دفاع کیلئے نہیں بلکہ اِن کے فردِ جرم کی تیز رفتار سماعت کیلئے ہے تاکہ مجرموں کی اگلی کھیپ بھی اُسی طرح پیچھے رہ جانے والے الزامات سے بری ہو سکے۔ مگر اُس روز کنگ کی یادگار پر آئے ہوؤں کی اکثریت مالی طور پر بدحال نہ لگتی تھی۔ وہ اپنے ’نائیک ائیر ہائپر فلائٹس‘ پر اِترا رہے تھے جو اُن کی جدید ٹیکنالوجی کے شاہکار ہیں، اُن کی کھیلوں میں استعمال ہونے والے حربے ہیں۔ جن لوگوں سے میری بات چیت ہوئی وہ اپنے متوسط طبقے کی درجہ بندی کی کامیابی سے بے خبر نظر آ رہے تھے۔ اور اُس صدر سے بھی جس نے اُنہیں اِس مقام تک پہنچایا۔ مزید بات چیت نے آشکار کیا کہ وہ خودترحمانہ حالت میں رہنا پسند کرتے ہیں جس طرح مغرب میں بسنے والے

مسلمان ۔

مسلمانوں کو مفعولی حالت کے بارے زیادہ محتاط ہونا ہو گا۔ ہم خدا پر بیرونی طور سے انحصار کرنے کی وجہ سے بھی اپنے ذاتی توسط کو اکثر کم کر دیتے ہیں۔ ’انشاء اللہ‘، ہماری جبلت میں شامل ہو چکا ہے۔ ’اگر خدا نے چاہا!‘ بالکل نہیں، ہمیں ہر صورت چاہنا ہو گا۔ ہمیں انصاف کے راستے میں خدا کا مددگار بننا ہو گا۔’مگر ہم کون ہوتے ہیں؟‘ آپ میں سے کچھ پوچھ سکتے ہیں۔ آخرِ کار ہمارے اندر یہ بھرا ہوا ہے کہ اللہ عظیم ہے۔ ’ اللہ اکبر!‘جب میں نے خود پڑھاتو مجھے اِس کے اصل معنی معلوم ہوئے۔ خدا سب سے بڑا ہے۔ اپنی مخلوقات سے بڑا ، جی ہاں، مگر یہ ہماری بے ربطی کا اظہار نہیں ہے۔ قصہ مختصر، اللہ اکبر کی پکار ہماری ذات کی پستی کے ساتھ توازن قائم کرنے کی یاد ہے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں مذہبی طور پر نرگسیت پسند نہیں ہو سکتی۔ کیا یہی بات اُن لوگوں کیلئے کہی جا سکتی ہے جو منطق کے خلاف فتوے پھینکتے ہیں؟ اور یا پھر ہم میں سے وہ جوفتویٰ دینے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں؟

میری زندگی میں ہی دہشت گردوں نے مرنے والوں کی تعداد کو چند ایک سے بڑھا کر سینکڑوں ہزاروں تک پہنچا دیا ہے اور لاکھوں کے امکان تک لے آئے ہیں۔ تقریباً اسی دوران ویٹیکن نے باضابطہ طور پر صیہونیت مخالفت اور ایذا رسانی کو سرعام رد کیاہے ۔ منحرف کیتھولک کی شکر گزار ہوں جنھوں نے بچوں اور عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتیوں کو بھی تسلیم کیا۔ میں نے اِس کھلے خط کو دو حقائق جانتے ہوئے تیار کیا ہے۔ ایک روشن خیال اسلامی انقلاب آ سکتا ہے۔۔ مسلمانوں کے پاس ایسا کرنے کیلئے کوئی پوپ نہیں ہے مگر یہ کرنے یا مرنے کا مقام ہے۔ خاموشی سے کچھ جنم نہیں لے گا۔ یوسی کلین ہالیوی، ایک اسرائیلی صحافی، پکے یہودی اور اچھے دوست ہیں، اُن کا خیال ہے کہ میں آپ مسلمانوں سے غیر ضروری طور پر ناراض ہوں۔ ' اسلام دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ہے۔۔ (۱۳)یہ فقط جملہ نہیں ہے '، وہ مجھے یاد دلاتے ہیں۔ یوسی نے ایک کتاب ''ایڈن کے باغ کے دروازے پر'' لکھی ہے جس میں وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ مقدس سرزمین پر عبادت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جتنے مسلمانوں سے انہوں نے

رابطہ کیا، صرف صوفیوں نے اُسے اپنے پیچھے جھکنے کو خوش آمدید کہا(۱۴)۔ یہ ہر شخص کا نقصان ہے کہ صرف صوفی، یوسی کی وضاحت کے مطابق اسلام کے اندر ’غیر مبہم طور پربیرونی مدار‘ میں ہیں۔

پھر بھی وہ مجھ سے پس منظر تلاش کرنے کی استدعا کرتا ہے۔ ’مذاہب مشکل ادوار سے گزرتے ہیں۔ دوسرے دو وحدانیت کے مذاہب کے بارے سوچو، اپنی بنیاد کے چودہ سو سال بعد عیسائیت پوچھ گوچھ اور قتلِ عام کے عہد میں تھی، یہودیت اپنے ججوں کے پرانے دور میں کیا تھی‘۔ مگر بطور مذہب اسلام، سب سے کم عمر، بمشکل آج کے بالغ مسلمانوں کو اُن کے برے کاموں سے معافی دیتا ہے۔۔ خاص طور پر ہماری قرونِ اولیٰ کے زمانے کے بُرے کاموں کی تقلید کے ضمن میں۔ یوسی خود ایک فلسطینی سے ملاقات کا واقعہ سناتے ہیں جو یہودیوں کے ساتھ بخوشی رہنے کو تیار تھا جب تک وہ اسلام کی حاکمیت میں رہیں ۔ یہ حاکمیت فطری بات ہو سکتی ہے ، بوسٹن کے پڑھے اُس عرب کا خیال تھا۔ یہ تعصب ہے ، میرا ایمان ہے جو مرکزی دھارے کی مسلم نفسیات کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔

یوسی ایک بڑے اور پختہ کار بھائی کی حیثیت سے یہ نصیحت دیتے ہوئے بات ختم کرتے ہیں : ’تمہارے اظہار بیان میں مزید پیار کی زبان کی ضرورت ہے۔ ملا کے لئے نہیں مگر صدیوں پر محیط اربوں ارواح کیلئے جنہوں نے چھوٹی چھوٹی کشیدہ کاری کی ہوئی جائے نمازوں پر ماتھے رگڑے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ناخوش زندگیاں خدا کی خوشنودی کیلئے قربان کیں‘۔ اِس گھڑی کو برباد کرنے کیلئے مجھے معاف کیجئے، مگر کیوں اتنی ساری زندگیاں ’چھوٹی‘ اور ’ناخوش‘ رہیں، خاص طور پر نہائت مہربان خدا کے سامنے؟ اور براہِ مہربانی مجھے یہ نہ بتائیے کہ ایسی باتیں ظہور پذیرہوتی ہیں اگر مذاہب دفاع کے عمل میں چلے جائیں، کیونکہ یہاں تک کہ جب اسلام اپنے سنہری دور میں تھا، زندگیاں چھوٹی تھیں اور جھوٹ بڑے تھے۔ یاد کیجئے جب خلیفہ المامون نے آزاد خیالی کی منادی کرائی، تب بھی تازیانے مارنے والے لوگ خلیفہ کی اسلام کی تشریح سے اختلاف کر رہے تھے۔ اِس ضمن میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی، کیا آئی ہے؟

لہٰذا میں اسلام کو ہلانے کے آخری ہلے میں دکھی ہوں۔

کیا میں اسے پیچھے چھوڑ دوں تو کیا یہ خود ہی مجھے آ لے گا۔ دوسرے معنوں میں اگرچہ یہ ہم سب تک پہنچا ہوا ہے۔ میں جو دیکھنا چاہتی ہوں وہ اصلاح کی بھوک ہے، ایسی بھوک جو کچھ کرنے کیلئے بڑھاوا دیتی ہے۔

* کیا ہم اپنی رسومات کو تصویر سے باہر لے جائیں گے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو خوف، بھوک اور جہالت سے آزاد کرانے کیلئے اپنے تصورات کو جگائیں گے؟

* کیا ہم اپنے توہمات کو پیچھے چھوڑ دیں گے کہ ہم قرآن کے بارے سوال نہیں کر سکتے؟ سرعام پوچھئے کہ یہ آیات کہاں سے آئی تھیں، کیسے اِن کی مختلف طور پر تشریح ہو سکتی ہے اور یہ کیوں متضاد ہیں (ہر مذہبی متن میں ایسی آیات موجود ہیں)۔ ہم قبائلی حتمیت کے علاوہ کسی شے کی روگردانی نہیں کر رہے۔

* اگر میرا تجزیہ غلط ہے تو کیا آپ وضاحت کر سکتے ہیں کہ کیوں کوئی دوسرا مذہب اتنی زیادہ مختلف النوع دہشت گردیوں کو جنم نہیں دے رہا اور اللہ کے نام پر انسانی حقوق کی اتنی خلاف ورزیاں نہیں کر رہا؟ اور کیا آ پ اِس بات کی وضاحت مسلمانوں کے سوا کسی پر انگلی اٹھائے بغیر کر سکتے ہیں ؟

مجھے www.irshadmanji.com پر اپنی رائے لکھ کر بھیجئے۔ میں ایک ایماندارانہ بحث کیلئے آپ کی منتظرر ہوں گی۔

ایمان پر قائم (ہنوز)

ارشاد

حوالہ جات:

۱۔ Ibrahim, conversation in Halifax, September 27, 2002

۲۔ Josh Tyrangiel, "Israeli Jews in the Dragnet," Time Canada, December 10, 2001, p. 41

۳۔ Javid Hassan, "US to reissue Eid Stamp on Oct. 10," Arab News, September 17, 2002, p. 1 of online version

۴۔ www.isna.net.

۵۔ Queen Noor, Leap of Faith: Memoirs of an Unexpected Life (New York: Miramax Books, 2003), p. 18

۶۔ Mahmoud Abdel-Baset as quoted by Solomon Moore, "After the Attack: Expressions

of Support Surprising to Muslims," Los Angeles Times, September 26, 2001

۷ ۔ Doug Saunders in email, February 25, 2003۔

صحافی دوست ڈاگ نے لکھا، ''ہوم لینڈ اسکیورٹی کے اختیارات اور بڑے پیمانے پر گرفتاریوں اور امریکہ بدری نے امریکی معاشرے میں پوری مسلمان کمیونٹی کو الگ تھلگ تو کر دیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ میرا نہیں خیال کہ اِن اقدامات نے مسلمان امریکیوں کو عام لوگوں کے سامنے قابلِ نفرت بنایا ہو جیسا کہ جاپانیوں کے ساتھ ہوا تھا، وہ عام لوگوں کے سامنے حقیقی نفرت کا شکار ہوئے تھے۔ میرا یہ گمان ہے کہ امریکی بہت زیادہ مذہبی لوگ ہیں اور اُن کے گہرے مسیحی اعتقادات اسلام کے اعتقادات اور عبادات کو قابلِ قبول بناتے ہیں، یورپ سے کہیں زیادہ۔''

۸ ۔ Sarah Eltantawi as quoted by Solomon Moore, "After the Attack: Expressions of Support Surprising to Muslims," Los Angeles Times, September 26, 2001

۹ ۔ قرآن، ۲:۲۵۶

۱۰: قرآن، ۱۰۹:۶

۱۱۔ قرآن، ۵:۴۹۔ ایک ایسی ہی آیت ۱۶:۳۹ ہے۔

۱۲۔ تسلیمہ نسرین کا انٹرویو، ٹورونٹو ، ۲۸ اکتوبر ۲۰۰۲ء ۔ (ویب سائٹ کے انگریزی حصہ میں اسی حوالہ کو کلک کر کے پڑھ سکتے ہیں)

۱۳۔ Klein Halevi in email, February 26, 2003

۱۴۔ Yossi Klein Halevi, At the Entrance to the Garden of Eden: A Jew's Search for God with Christians and Jews in the Holy Land (New York: William Morrow, 2001), p. 105

مطالعہ جات و حوالہ جات

میں چاہتی تھی کہ یہ کتاب ایک براہ راست بات چیت کی صورت میں رہے ، لہذاٰ میں نے اِس کھلے خط کی روانی کو متن میں حوالہ جات کو شامل کر کے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اِس کی بجائے آپ تمام حوالہ جات میری ویب سائٹ www.irshadmanji.com پر ڈھونڈ سکتے ہیں۔ تاہم میں اپنے مطالعہ کا ایک نمونہ فہرست پیش کر رہی ہوں جنہیں میں پڑھنے کا مشورہ دیتی ہوں، میں اِن میں سے کچھ مصنفین کیساتھ بالکل متفق نہیں ہوں مگر میں سمجھتی ہوں کہ مختلف آراء اپنی جگہ پر ایک نعمت ہیں۔ یہ فہرست میری تحقیق کے تمام منبعوں کا احاطہ نہیں کرتی۔ میری ویب سائٹ پر مزید حوالہ جات بھی ہیں، نیز کچھ انٹرویو، تقاریر اور وڈیو کے حصے بھی ہیں۔

حوالہ جات اہم کتب ومضامین:

The Koran, N.J. Dawood, trans. London: Penguin Classics, 1956 and updated 1999.

Ajami, Fouad. Dream Palace of the Arabs: A Generation146s Odyssey: New York: Pantheon Books, 1998.
Ali, Tariq. Shadows of the Pomegranate Tree. London: Chatto, 1992.
Ibid. The Clash of Fundamentalisms: Crusades, Jihads and Modernity. London: Verso, 1002.
Alibhai-Brown, Yasmin. After Multiculturalism. London: The Foreign Policy Centre, 2000.
Armstrong, Karen The Battle for God: A History of Fundamentalis. New York: Ballantine, 2000.
Ibid. Islam: A Short History. London: Wiedenfeld & Nicolson, 2000.
Ibid. 147Was it Inevitable?148 in James F. Hoge Jr. and Gideon Rose, eds. How Did This Happen? Terrorism and the New War. New York: Public Affairs/Council on Foreign Relations, 2001: pp. 53-70.
Armstrong, Sally. Veiled Threat: The Hidden Power of the Women of Afghanistan. Toronto: Penguin, 2002.
Asfour, Gaber. 147Osama Bin Laden: Financier

of Intolerant 145Desert146 Islam,148 New Perspectives Quarterly 18, no. 1 (Winter 2002): pp.41-43.

Barber, Benjamin R. Jihad vs McWorld: How the Planet is both Falling Apart and Coming Together and What this Means for Democracy. New York: Times Books, 1995.

Barlas, Asma. 147Believing Women148 in Islam: Unreading Patriarchal Interpretations of the Qu146ran. Austin: University of Texas Press, 2002.

Buckman, (Dr.) Robert. Can We Be Good Without God? Behaviour, Belonging and the Need to Believe. Toronto: Penguin, 2000.

Cohen, Mark. Under Crescent and Cross: The Jews in the Middle Ages. Princeton, N.J.: Princeton University Press, 1994.

Counts, Alex. Give Us Credit: How Muhammad Yunus146 Micro-Lending Revolution is Empowering Women from Bangladesh to Chicago. New York: Times Books, 1996.

Duran, Khalid. Children of Abraham: An

Introduction to Islam for Jews. Hoboken, N.J.: Ktav Publishing House/American Jewish Committee, 2001.

El-Fadl, Khaled Abou. Speaking in God146s Name: Islamic Law, Authority and Women. Oxford, UK: Oneworld Publications, 2001.

Ibid. With Tariq Ali, Milton Viorst, John Esposito, et al. The Place of Tolerance in Islam. Boston: Beacon Press, 2002. Edited by Joshua Cohen and Ian Lague for Boston Review.

Fakhry, Majid. Averroes (Ibn Rushd): His Life, Works and Influence. Oxford: Oneworld, 2001.

Feiler, Bruce. Abraham: A Journey to the Heart of Three Faiths. New York: William Morrow, 2002.

Firestone, Reuven Children of Abraham: An Introduction to Judaism for Muslims. Hoboken, N.J.: Ktav Publishing House/American Jewish Committee, 2001.

Friedman, Thomas L. The Lexus and the Olive Tree: Understanding Globalization. New York: Farrar, Straus Giroux, 1999.

Georgetown University Center for Muslim-Christian Understanding, papers (eg. 147The Need for Civilizational Dialogue148 and 147Islamists and the Challenge of Pluralism148).
Al-Ghazaly, (Sheikh) Muhammad. The Future of Islam Outside its Land (available at www.ghazaly.net).
Halevi, Yossi Klein. At the Entrance to the Garden of Eden: A Jew146s Search for God with Christians and Muslims in the Holy Land. New York: William Morrow, 2001.
Hartman, (Rabbi) David. A Heart of Many Rooms: Celebrating the Many Voices within Judaism. Woodstock, Vt: Jewish Lights Publishing, 1999.
Hofmann, Murad Wilfried. Islam: The Alternative. Reading, UK: Garnet, 1993.
Ibid. Islam 2000. Beltsville, Md.: Amana, 1997.
Ibid. Religion on the Rise: Islam in the Third Millennium. Beltsville, Md.: Amana, 2001.
Hourani, Albert A History of the Arab Peoples.

New York: Warner Books, 1991.
Huntington, Samuel. The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order. New York: Simon & Schuster, 1996.
Ibn Rushd. The Books of the Decisive Treatise Determining the Connection between the Law and Wisdom. Provo, Utah: Brigham Young University Press, 2001.
Ignatieff, Michael. Blood and Belonging: Journeys into the New Nationalism. Toronto: Penguin, 1994.
Kepel, Gilles. Jihad: The Trail of Political Islam. Cambridge: Harvard University Press, 2002.
Kuala Lumpur International Forum on Islam 2002, proceedings.
Lester, Toby. 147What is the Koran?148 The Atlantic Monthly (January 1999): pp. 43-56.
Lewis, Bernard. The Middle East: 2000 Years of History from the Rise of Christianity to the Present Day. London: Weidenfeld & Nicolson, 1995.
Ibid. Semites and Anti-Semites: An Inquiry into

Conflict and Prejudice. New York: Norton, 1986.
Ibid. What Went Wrong? Western Impact and Middle Eastern Response. Oxford, New York: Oxford University Press, 2002.
Maalouf, Amin. In the Name of Identity: Violence and the Need to Belong. New York: Arcade Publishing, 2001.
Mackey, Sandra Passion & Politics: The Turbulent World of the Arabs. New York: Plume, 1994.
Ibid. The Saudis: Inside the Desert Kingdom. New York: W.W. Norton, 2002.
Mahbubani, Kishore. Can Asians Think? Toronto: Key Porter, 2001.
Maimonides. The Guide for the Perplexed. Culver City, California: Labyrinthos, 1989.
Makiya, Kanan Cruelty and Silence: War, Tyranny, Uprising, and the Arab World. New York: W.W. Norton, 1993.
Menocal, Maria Rosa. The Ornament of the World: How Muslims, Jews and Muslims

Created a Culture of Tolerance in Medieval Spain. Boston: Little, Brown, 2002.
Morris, Benny. Righteous Victims: A History of the Zionist-Arab Conflict, 1881-1999. New York: Knopf, 1999.
Naipaul, V.S. Beyond Belief: Islamic Excursions Among the Converted Peoples. New York: Random House, 1998.
Ibid. 147Our Universal Civilization,148 The Writer and The World: Essays. New York: Knopf, 2002.
Nasrin, Taslima Meyebela: My Bengali Girlhood. South Royalton, Vt: Steerforth Press, 2002.
Ibid. Shame: A Novel. Amherst, New York: Prometheus, 1997.
Pipes, Daniel. The Hidden Hand: Middle East Fears of Conspiracy. New York: St. Martin146s Press, 1996.
Ramadan, Tariq. To be a European Muslim. Markfield, Leicester, UK: The Islamic Foundation, 1999.

Raphael, George. 147A is for Arabs,148
salon.com (January 8, 2002 150 archived).
Rubin, Barry and Judith Colp Rubin, eds. Anti-American Terrorism: A Documentary Reader. Oxford, New York: Oxford University Press, 2002.
Rushdie, Salman. Step Across This Line: Collected Nonfiction 1992-2002. New York: Random House, 2002.
Sachedina, Abdulaziz. The Islamic Roots of Democratic Pluralism. Oxford, New York: Oxford University Press, 2001.
Sacks, (Rabbi) Jonathan. The Dignity of Difference: How to Avoid the Clash of Civilizations. London, New York: Continuum, 2002.
Said, Edward. Covering Islam: How the Media and the Experts Determine How We See the Rest of the World. New York: Pantheon, 1981.
Ibid. Orientalism. New York: Vintage Books, 1979. A Drive to Israel: An Egyptian Meets his Neighbors. Tel Aviv: Moshe Dayan Center for

Middle Eastern and African Studies, 2001.
Sampson, Cynthia and Douglas Johnston, eds. Religion, The Missing Dimension of Statecraft. Oxford, New York: Oxford University Press/ Center for Strategic and International Studies, 1994.
Sardar, Ziauddin. 147Islam: Resistance and Reform,148 New Internationalist (May 2002): pp. 9-10.
Shehadeh, Raja. Strangers in the House: Coming of Age in Occupied Palestine. South Royalton, Vt: Steerforth Press, 2002.
Taha, Mahmoud Mohamed. The Second Message of Islam. Syracuse, New York: Syracuse University Press, 1987.
Tibi, Bassam. The Challenge of Fundamentalism: Political Islam and the New World Disorder. Berkeley: University of California Press, 1998.
United Nations Arab Human Development Report 2002
Wadud, Amina. Qur146an and Woman:

Rereading the Sacred Text from a Woman146s Perspective. Oxford, New York: Oxford University Press, 1999.

Warraq, Ibn. Why I am Not a Muslim. Amherst, New York: Prometheus Books, 1995.

Wolfe, Michael and producers of Beliefnet, eds. Taking Back Islam: American Muslims Reclaim Their Faith. Emmaus, Pa.: Rodale/Beliefnet, 2002.

World Bank Research Report: Engendering Development 2001.

Ye146or, Bat Islam and Dhimmitude: Where Civilizations Collide. Madison, N.J.: Farleigh Dickinson University Press, 2002.

Zachary, Pascal. The Global Me: New Cosmopolitans and the Competitive Edge 150 Picking Globalism146s Winners and Losers. New York: Public Affairs, 2000.

Zakaria, Fareed The Future of Freedom: Illiberal Democracy at Home and Abroad. New York: W.W. Norton, 200